اردو

غزل

اکٹر یوسف حسین خاں

دب ○ چوک مینارہ ○ انارکلی لاہور

اردو غزل

اچھی کتاب
کا
نکھار ہمیشہ
قائم
رہتا ہے۔

شاعری تنقید

اردو غزل

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

ناشران

آئینۂ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی لاہور

فون نمبر ـــــ ۶۷۵۰۴

پاکستان میں پہلی مرتبہ
۱۹۶۴ء
تعداد گیارہ سو
قیمت: سولہ روپے

اہتمام
م، ع، سلام۔ آئینہ ادب۔ چوک مینار
انارکلی —— لاہور

(اشرف پریس لاہور میں چھپی)

انتساب

امامِ غزل مولانا سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی مرحوم
آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن اُن کی یاد دلوں میں زندہ
و پائندہ ہے۔ میں ان اوراق کو اُن کی یاد میں بطور
عقیدت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔

یوسف حسین خاں

فہرست مضامین

اردو غزل

انتخاب غزلیات

دیباچہ

"اُردو غزل" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ تیسرا ایڈیشن انجمن ترقی اُردو ہند نے شائع کیا۔ اب یہ ایڈیشن پہلی دفعہ پاکستان میں شائع ہو رہا ہے۔ اس دفعہ پھر میں نے پوری کتاب پر ایک نظر ڈالی اور جہاں ضرورت سمجھی وہاں تبدیلی یا اضافے کئے گئے۔ انتخاب میں بھی اضافے کیے ہیں۔ موجودہ زمانے کے غزل گو شاعروں کا کلام خاص طور پر بڑھایا گیا ہے لیکن نمونے کے شعروں کی تعداد کم رکھی ہے تاکہ کتاب کی ضخامت بہت زیادہ نہ بڑھ جائے۔

اس کتاب کو شائع ہوئے اب چودہ سال ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں غزل کی مقبولیت کافی بڑھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے بعض نوجوان شاعر جو غزل کی صنف کو بیکار سمجھتے تھے، اب اس طرف راغب ہوئے ہیں اور اُن میں سے بعض کے کلام میں نیا انداز اور قوت محسوس کی جا رہی ہے۔ اُن سے مستقبل کی توقعات بجا طور پر وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں مجھے متعدد اہلِ ذوق حضرات کے خطوط ملے ہیں جن میں میری ہمت افزائی کی گئی ہے جس کے لئے میں تہ دل سے ممنون ہوں۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ پچھلے دنوں صنفِ غزل کو جو احیا نصیب ہوا ہے اس میں میری اس کتاب کی اشاعت کو بھی ایک خاص سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں اُن کی اس رائے کو حسنِ ظن پر محمول کرتا ہوں اور اُن کی اس عزت افزائی کو اپنے لئے باعثِ عزت تصور کرتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ چودہ پندرہ سال قبل میں نے صنفِ غزل کے ممکنات کی طرف جو اشارے کئے تھے اور اُس کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ پوری ہوتی نظر آ رہی ہیں اور مجھے اُس کا مستقبل اُس کے ماضی سے بھی زیادہ شاندار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری شاعری صرف غزل کی شاعری ہو گی۔ دوسرے اصنافِ سخن کی بھی پوری ترقی ہونی چاہئے تاکہ ہمارے ادب کی رنگارنگی باقی رہے اور ہر صنفِ سخن کو وہ مقام ملے جس کی وہ مستحق ہے۔

یوسف حسین خاں

اُردو غزل

غزل اور نظم

گزشتہ دو سو برس میں میرؔ صاحب کے زمانے سے لے کر حسرتؔ اور جگرؔ کے موجودہ دور تک اُردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنفِ سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے۔

ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اُس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اُس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرتؔ اور جگرؔ کے ہاں حسن و عشق کے معاملوں کا اظہار اس سے ایک حد تک مختلف ہے، جو ہمیں میرؔ اور غالبؔ اور مومنؔ کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو دنیا کی ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت اور طرزِ فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر جدید دنیا کے تقاضوں اور تجربوں کے مدِنظر حسن و عشق کو جس نقطۂ نظر سے

دیکھتا ہے اس کی مثال اردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساسِ جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لئے بطور قدر استعمال کرتا ہے، جس سے اس کے پیش رو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر۔

ہمارے عہد کے غزل گو شاعر کی نظر سے وہ تعلق کبھی اوجھل نہیں ہوتے جو حسن اور عشق کی دنیاؤں میں پائے جاتے ہیں اور جن کی تہ میں جذبے کی کارفرمائی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے۔ شاعر کے تجربے میں جذبہ اپنے آپ کو تخیل کے رنگ میں رنگ لیتا ہے تاکہ حُسن کا مکمل شعور ممکن ہو سکے۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو شاعر آج سے دو سو برس پہلے جس مغموم اور افسردہ آواز سے حسن و عشق کی داستان بیان کر رہے تھے، اسی کی تقلید اب بھی ہو رہی ہے۔ گویا آرٹ کی تخلیقی آزادی سلب ہو چکی ہے۔ وہی چبے چبائے نوالے ہیں جنہیں برابر چبایا جا رہا ہے چاہے ان میں کچھ مزا ملے یا نہ ملے۔ وہی شاہد و شراب، زلف و گیسو، مے و میخانہ اور شمع و پروانہ کی داستان ہے، جو ذرا سے لفظوں کی الٹ پھیر کے ساتھ صدیوں سے بیان ہوتی رہی ہے اور آج بھی بیان کی جا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ غزل کے رموز اور علامتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی توجیہہ بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان رموز اور علامتوں کی توجیہہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس عرصے میں بہت کچھ بدلتی رہی ہے۔

شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تاکہ وہ ذہنی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی سکونی آرٹ نہیں کہ جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں

رچا ہوا ہے، اسی واسطے اس کی معنی آفرینیوں کی کوئی حد نہیں۔ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی، اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے احساس و تخیل پر بھی پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے، تو غزل کے محرک بھی بدلیں گے اور اس کے رموز اور علامتوں کی توجیہ بھی بدلے گی اور اس طرح نئی نئی خیالی اور جذباتی حقیقتوں کی بازآفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ گذشتہ دو سو سال کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ غزل کے بظاہر بندھے ٹکے علامتی لفظوں اور اشاروں میں معانی کی کس قدر وسعتیں پنہاں ہیں۔ ان کی دائمی جذباتی صداقتیں ہر زمانے میں معنی اور لطف کے نئے نئے پہلو ہمارے سامنے پیش کرتی رہی ہیں۔ یقین ہے کہ غزل نگاروں کے پرانے تجربوں کی نئی آگاہیاں آئندہ بھی تخلیق ہوتی رہیں گی۔ اور اس طرح ہمارے ادبی شعور کی نشو و نما جاری رہے گی۔ جدید فلسفے اور سائنس نے ہمارے تصورات کی دنیا میں بڑی وسعتیں پیدا کر دی ہیں، جن سے پرانے غزل گو شاعر بے خبر تھے۔ آج ہمارے زندگی اور کائنات کے تصور زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں، اس لئے اس پر مطلق تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہمارے شاعروں کے تخیل پر اس پیچیدگی کا اثر پڑے۔ لیکن تصوروں کی دنیا میں چاہے کتنا بڑا انقلاب کیوں نہ ہو جائے، غزل لکھنے والوں کی چال نظم لکھنے والوں کی رفتار سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور رہے گی۔ نظم لکھنے والے کی رفتار اس کی باتوں کی طرح سیدھی سادی ہوگی۔ اور غزل لکھنے والا ہمیشہ ڈگمگاتا ہوا مستانہ وار لہریا چال چلے گا۔ اس لئے کہ اس کے قدم ٹھیک طور پر سیدھے اٹھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے قدم کی ہر لغزش اس کے دل کی دھڑکن کی آئینہ دار ہوگی اور چونکہ دل زندگی کا مرکزی نقطہ ہے اس لئے اس کی نغمہ سرائی چاہے بظاہر زندگی سے بے تعلق سی معلوم ہو لیکن حقیقت میں اصل حیات سے ہم آہنگ ہوگی۔ وہ جذبے کی طرح مبہم رہے گی

مگر اس کی تاثیر بے پناہ ہو گی۔

میں یہ مانتا ہوں کہ اس وقت ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے میں غزل کو وہ حُسنِ قبول حاصل نہیں رہا، جو نظم کو حاصل ہے۔ جدید مغربی تعلیم کے اثر سے ہمارے یہاں نظم نگاری کو رواج ہوا اور پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اس میں قابلِ قدر اضافے ہوتے رہے ہیں۔ حالیؔ اور اقبالؔ نے نظم کو اپنے اصلاحی خیالوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دونوں کو اپنی قوم کو پیغام دینا تھا، جس کے لئے یقیناً نظم کا وسیلہ زیادہ موثر اور مفید تھا۔ قوموں کو جو درسِ عمل دیا جاتا ہے وہ اشاروں کنایوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ وہ وضاحت اور تفصیل چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ کام غزل کے مقابلے میں نظم ہی کے ذریعے سے اچھی طرح انجام پا سکتا تھا۔ میں اس موقع پر دیدہ و دانستہ اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہمارے ادب میں غزل کو ترجیح دی جانی چاہیئے یا نظم کو۔ دراصل دونوں اپنا اپنا مقام اور اپنا اپنا حق رکھتی ہیں، جس سے انہیں محروم نہیں کرنا چاہیئے۔ جس وقت سے مولانا حالیؔ نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں غزل پر نکتہ چینی کی، اس وقت سے آج تک وہی پرانی اور فرسودہ دلیلیں غزل کے خلاف لائی جا رہی ہیں۔ ان سب دلیلوں کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ غزل زندگی کے نئے تقاضوں کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے کہ اس صنفِ سخن میں خیال کو اظہار کی پوری آزادی نہیں ملتی۔ اس کی ریزہ کاری کلام کے منطقی تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ جس کا نتیجہ خیالات کا انتشار ہے۔ غرض کہ غزل اب اعتبار اور قدر کی چیز نہیں رہی۔ لہٰذا اس کا ختم ہو جانا ہی اچھا ہے۔

مولانا حالیؔ نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی تحریک کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حُسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق، عقل اور اخلاق کو خراب کر دینے والی چیز ہے

اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے، اتنا ہی قومی مصالح کی ترقی کا موجب ہوگا۔ اُن کے نزدیک عشق بیکاری کا مشغلہ ہے، لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی تھا۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور اخلاص میں شبہ نہیں، لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابلِ قبول نہ تھا۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورے کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت، اصغر، جگر، فانی اور اصغر کی زمزمہ سنجیوں سے محروم رہتی جو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔

دراصل معاملہ اتنا آسان اور سادہ نہیں جتنا کہ غزل کے معترضین نے سمجھ رکھا ہے۔ غزل کی جڑیں ہماری تہذیب اور جذباتی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، انہیں اکھاڑ پھینکنا سہل نہیں۔ مولانا حالی اردو زبان و ادب کی اور عام طور پر مسلمانوں کی قومی زندگی کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصلاحی جوش میں انہوں نے غزل کے نقائص چن چن کر دکھائے اور قومی اخلاق کو سدھارنے کے لئے سادہ اور عام فہم نظمیں لکھیں اور دوسروں کو لکھنے کی دعوت دی۔ پھر اُن کے پیشِ نظر غزلوں میں بھی خاص طور پر وہ تھیں جن سے فحش اور رکاکت کی ترویج کا اندیشہ تھا، لیکن کیا سب غزلیں ایسی ہی ہوتی ہیں ——؟

عیبِ مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو　　نفیِ حکمت مکُن از بہرِ دلِ عامے چند

لہ مولانا حالی کی رباعی ملاحظہ ہو ؎

ہے عشق طبیبِ دل کے بیماروں کا　　یا خود ہے یہ گھر ہزار آزاروں کا

ہم کچھ نہیں جانتے پر اتنی ہے خبر　　اک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

اس رباعی میں مولانا رومؒ کے اس شعر کی تردید کی گئی ہے ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

اگر مولانا حالی آج زندہ ہوتے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ پچھلے چند سالوں میں فحش اور عریاں نگاری کی ترویج اور اس کی قدر افزائی افسانے اور نظم کے توسط سے زیادہ ہوئی یا غزل کے ذریعے؟ مولانا حالی کی رائے کو آج دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں، وہ محض عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھی انہوں نے غزل کے جو نقائص بتائے ہیں، ان میں سے بعض کو غزل کے حامی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ غزل جو محض قافیہ بندی کے لئے ہو موجب فخر نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ غزل صرف اعلیٰ درجہ ہی کی ہونی چاہئے۔ نظم اوسط درجہ کی گوارا کر لی جا سکتی ہے لیکن غزل نہیں کی جا سکتی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ

"بلندش بہ غایت بلند و پستش بہ غایت پست"

غزل پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ غزل ہمیشہ بلند ہی ہوگی، اگر واقعی وہ تغزل کے آداب کی حامل ہے۔ اوسط درجے یا ادنیٰ درجے کی غزل مکروہ چیز ہے جس سے گھن آتی ہے۔ ادبی لطف حاصل ہونا تو کجا، اس کی غلط تعبیر و توجیہ کا اندیشہ رہتا ہے جو ممکن ہے بعض طبائع پر بُرا اثر ڈالے۔

غزل کا معیار پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے پہلے پہل اسی کو اپنا تختۂ مشق بناتے ہیں۔ عروض کی چند کتابیں پڑھیں اور اپنے آپ کو غزل کہنے کا اہل سمجھنے لگے۔ کچھ عرصے قبل کی بات ہے کہ غزل گو ہونا علم مجلسی کا جز تصوّر کیا جاتا تھا۔ صنائع لفظی اور صنائع جگت ذہانت کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ امراء کے طبقے میں خاص طور پر اس کا رواج تھا۔ جس طرح گھر کے انتظام کے لئے ایک داروغہ رکھا جاتا تھا، اسی طرح غزل کی اصلاح کے لئے ایک استاد رہتے تھے جو اکثر کوئی پھٹے حالوں بزرگ ہوتے تھے جنہیں شعر کی اصلاح کے معاوضے میں کھانا اور کپڑا میسر آجاتا تھا۔ غدر سے

پہلے اور غدر کے کچھ عرصہ بعد تک غزل لکھنے والے امیرزادے اور ان کی غزلوں پر اصلاح دینے والے استاد شمالی ہند کے ہر شہر اور قصبہ میں موجود نظر آتے تھے ان سب بے فکروں کے لئے شعر و سخن بیکاری اور خوش وقتی سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ یہ زمانہ ہماری اجتماعی اور جذباتی زندگی کی انتہائی بے مقصدی اور انتشار کا زمانہ تھا جس سے سیاست و معیشت کی طرح ادب بھی متاثر ہوا۔ کسی کو بھی ہنوز نہیں معلوم تھا کہ اسے کدھر جانا ہے اور کس کے ساتھ جانا ہے؟ ہماری قوم کی حالت غالبؔ کے تھکے ہارے مسافر کی سی تھی جس کی زبانی انہوں نے یہ شعر کہلوایا ؂

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس آڑے وقت میں ہماری خوش قسمتی تھی کہ سرسید اور مولانا حالیؔ جیسے رہبر ملے۔ ان کے دلوں میں درد اور نیتوں میں خلوص تھا۔ مولانا حالیؔ نے ادبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ یہ ان کا انتہائی ایثار تھا کہ باوجود اعلیٰ درجے کی تغزل کی صلاحیت کے انہوں نے نظم کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان کے تغزل کا اندازہ چند شعروں سے ہو سکتا ہے۔ اس شعر میں حقیقت کو کس خوبی سے شوخی اور رنگینی میں سمو دیا ہے ؂

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

ان کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں ؂

کس طرح اس کی بناوٹ کو لگاوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ

اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ

ایسے اُلجھاو تری کاکلِ پیچاں میں نہیں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی

دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یہ آخری شعر مولانا حالی کے حقیقی اندرونی احساس کی غمازی کرتا ہے انہوں نے ترکِ عشق کی جو دُعا کی وہ اوپرے دل سے تھی اسی لئے بے اثر رہی۔ عشقیہ شاعری کی ترقی رکنے والی نہ تھی نہ رُکی۔ چنانچہ آج اس صنفِ سخن کا ایک نے بردست علم بردار آزادِ عقل اور ماورائے عشق کی طرف اشارہ کرنے میں مطلق پس و پیش نہیں کرتا ؎

اربابِ ہوش جتنے ہیں بیمارِ عقل ہیں

ان کے لئے ضرور ماورائے عشق ہے (حسرت)

مولانا حالی اور اُن کے بعد اقبال نے اردو نظم نگاری کو اس اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا جس پر ہم اب اس کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن غزل بھی اس عرصے میں ہٹی نہیں رہی۔ غالب کے بعد داغ، امیر، شاد، حسرت، فانی، اصغر اور جگر نے اپنے اپنے انداز میں اُسے سنوارا اور نکھارا اور اس کے مقام کو بلند کیا۔

ہمارے زمانے کے ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے بھی پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔ غزل جتنی ریاضت چاہتی ہے،

وہ اُن کے بس کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طبقے میں غزل کی پابندیاں اور آداب مقبول نہیں۔ اس لئے کہ انہیں برتنے کا ان لوگوں میں جیسا چاہیئے، ویسا سلیقہ اور ذوق نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے ادب اور اپنی ذہنی روایتوں سے ناواقف ہیں۔ وہ مغربی ادب کی ریس میں آزاد اور عاری نظم کو اردو میں بھی رواج دینا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہر زبان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہر صنفِ سخن کو ہر زبان میں نہیں برتا جا سکتا اور نہیں برتنا چاہیئے۔ تخلیقی ادب ذوقی چیز ہے۔ جہاں ذوق مجروح ہوگا، وہاں تخلیقی ادب تخلیقی نہیں رہے گا، بلکہ کسی دوسرے کی نقالی ہوگی، جس سے ادب کی سیرت مسخ ہو جائے گی۔ اندیشہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی یہ ناپختگی اور بے راہ روی اُن کی رفتار ترقی کے لئے زنجیر پا نہ بن جائے اور ان کی تخلیقی مساعی بے اثر ہو کر نہ رہ جائیں جو کسی تحریک کے لئے سب سے بڑی افتاد ہے۔

عاری نظم لکھنے والے وزن و قافیے کو اس لئے ترک کرتے ہیں کہ اس طرح اُن کے خیال کو پوری آزادی مل جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس طرح جتنا حاصل کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ کھو دیتے ہیں۔ وزن اور قافیہ ذہن اور حافظے کو ایک نقطے پر مرکوز کر دیتے ہیں تاکہ جذبہ اپنے آپ کو ضبط کے سانچے میں ڈھالے۔ اور شعر کی جو خارجی صورت ظہور میں آئے وہ اس کی فطرت ثانی معلوم ہو نہ کہ اس کے پاؤں کی زنجیر۔ شعر کی اس خارجی صورت میں ایسی قدریں مضمر ہوتی ہیں جو خود تخلیق کی محرک بن جاتی ہیں، اور جب وہ فن کار کی رُوح سے وابستہ ہو جاتی ہیں تو اظہار میں اُن سے مدد ملتی ہے۔ اس لئے یہ خیال درست نہیں کہ وزن وقافیہ جو غزل کی خارجی ٹیکنیک سے عبارت ہیں، اظہار میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب فن کار خارجی ٹیکنیک پر فاتحانہ انداز میں قدرت

پا لیتا ہے تو اُس کے وجدانی نقوش جمالیاتی امتزاج کی پوری قوت اور تازگی کے ساتھ ظہور میں آتے ہیں اور دلوں کو لبھاتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ادب کے اثر سے ہمارے یہاں جو نئے رجحان پیدا ہو رہے ہیں وہ غزل کے لئے ناموافق ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس صورتِ حال کے خلاف جلد ردِّ عمل رونما ہوگا اور ہمارا ادبی ذوق ہمیں بہت دنوں تک ادھر اُدھر بھٹکنے نہیں دے گا۔ جس طرح مغربی تعلیم کے اس ملک میں رائج ہونے پر مشرقی علوم و فنون ناقدری کے نذر ہو گئے تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد اُن کے صحیح مقام کو تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح مغربی ادب کے زیر اثر ممکن ہے غزل نگاری کو عارضی طور پر روز بد دیکھنا پڑے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غزل اس جوکھم کو جھیل جائے گی۔ اس میں اتنی قوتِ حیات موجود ہے کہ تھوڑا بہت ظاہری روپ بدل کر پھر اپنی گدّی پر براجمان ہو جائے۔ ناٹک اور ناول کی طرح نظم بھی ادبی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور اس طرح ہمارے ادب میں نظم اور غزل دونوں کو اپنا اپنا مقام مل جائے گا لیکن ادبی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نظم کو غزل سے موسیقیت کا رس مستعار لینا ہوگا ورنہ خود اس کی قبولیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہم زندگی کی بے آہنگیوں سے موسیقی کے ذریعے ہی نکل سکتے ہیں اور شعر تو بغیر موسیقی کے بقول غالب۔ ع

مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ غرضکہ مجھے غزل کا مستقبل اس کے امکانوں کی وجہ سے روشن نظر آتا ہے کہ اس صنفِ سخن سے ہمارے بعض اہم اور دُور رس ادبی اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ غزل ہمارے ادبی مزاج میں اتنی دخیل ہو چکی ہے کہ اس سے قطعی طور پر بے تعلق ہو جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا لیکن

یہ ضروری ہے کہ غزل زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دے۔ آج غزل گو شاعر کے احساس و تاثر کو جس دنیا سے واسطہ ہے وہ دو سو برس پہلے کی دنیا سے بالکل بدلی ہوئی ہے۔ علم و حکمت نے انسانی زندگی اور کائنات کی توجیہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے جس سے شاعر کی جذباتی زندگی اور اس کا تخیل متاثر ہوں گے اور ہونے چاہئیں۔ یہ شاعر کا منصب ہے کہ علم و حکمت کو اپنے جذبے اور تخیل سے وابستہ کر کے امتزاجی بصیرت عطا کرے جس سے وہ اب تک محروم ہیں۔ اس کام کو غزل گو شاعر اپنی ٹیکنیک میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے خوبی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ اگر وہ یہ کر لے تو ہمارے ادب کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس طرح مضمون اور خیال کے اعتبار سے بھی تنگ نائے غزل میں وسعت پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ تخیل اور جذبے کے نت نئے تجربوں کی حامل ہو سکے گی۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدید زمانے کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد شعروں کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعے تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گی۔ مثال کے طور پر اس زمانہ کے اردو کے دو سب سے بڑے شاعروں کے کلام کو دیکھئے جن میں سے ایک نظم کا اور دوسرا غزل کا بادشاہ ہے۔ ان سے میری مراد اقبال

اور حسرت ہیں۔ اقبال کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرت کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل صاف طور پر نظر آتا ہے۔ چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

اقبال کی ایک ابتدائی غزل نما نظم لیجئے۔ ہر لفظ تغزل میں رچا ہوا ہے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال کی آخری زمانے کی ایک دوسری غزل نما نظم بھی ملاحظہ ہو۔ رمز و ایما کی طلسمی کیفیات کا کمال دکھایا ہے ۔

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ وہ ادب گہِ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ
یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مے مغانہ
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

حسرت کی عاشقانہ اور شاعرانہ زندگی کی ابتدائی کوشش ملاحظہ طلب ہے

اس نظم نما غزل میں جرأت کے انداز کی تقلید کی گئی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو عشقیہ محاکات کہہ سکتے ہیں، جس میں عہد ہوس کے افسانے کو مومن ہمارے سامنے دہرا دیا ہے اور مزے لے لے کر دہرایا ہے[1] ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صدہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بارہا اٹھنا اسی جانب نگاہ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے میں ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

---

[1] مومن کے دیوان میں بھی اسی قسم کی ایک مسلسل غزل ملتی ہے جس کا مطلع ہے ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن نے بھی حسرت کی طرح کسی کے کوٹھے پر آنے کا ذکر اس طرح کیا ہے

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غزل کا مقطع ہے ؎

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکرِ دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

یہ غزل ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی۔

حسرت کی ایک بعد کی غزل ملاحظہ کیجیے جس میں اعلیٰ تغزل کے ساتھ نظم کے سارے انداز موجود ہیں۔ یہ غزل جزیرہ قبرص (سائپرس) کی ایک خاتون کو دیکھ کر جو جہاز پر حسرت کے ہم سفر تھیں لکھی گئی ہے۔

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا

رفتار قیامت یہی کیا کم تھی پھر اس پر
اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دلکش
باعث نہ یہی شوق کی ہوں جامہ دری کا

لاریب کہ اس حسنِ ستم گار کی شوخی
موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا

باوصف تلاش اُن کی خبر کچھ بھی نہ پا کر
کیا کہیے جو ہے حال مری بے خبری کا

جب سے یہ سنا ہے کہ وہ ساکن ہیں یہیں کے
عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا

ساتھ اُن کے جو ہم آئے تھے بیروت سے حسرت
یہ روگ نتیجہ ہے اسی ہم سفری کا

یہ غزل ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی۔ جب کہ حسرتؔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے ہوتے ہوئے پہلی مرتبہ یورپ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں بڑھاپے کے کلام میں شوخی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ تیس چالیس سال قبل عشق و محبّت کی جو چنگاری حسرتؔ کے دل میں روشن تھی آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ویسی کی ویسی دہک رہی ہے۔ رنگ اور نسل کے اعتبارات جو مثل خس و خاشاک ہیں اُس کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ فرق و امتیاز کرتی ہے لیکن اپنے بنائے ہوئے معیاروں سے۔ اس کی انسانی وسعتوں کی انتہا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے محبوب کی ذات میں عاشق ساری انسانیت سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت کا ایک لمحہ سارے زمانے پر بھاری ہوتا ہے۔ محبت چاہتی ہے کہ ہر وہ چیز فنا ہو جائے جو وہ خود نہیں ہے۔ اس کو کسی دوسرے جذبے یا محرک کی شرکت گوارا نہیں۔ یہی جذبۂ محبت موسیقی میں حل ہو کر حسن کی تخلیق کا موثر ذریعہ بن جاتا ہے اور یہی تغزل کی جان ہے۔

دروں بینی اور رمزیت

اگر آپ تغزل کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو بعض باتیں صاف طور پر نمایاں نظر آئیں گی، جن کی وجہ سے دوسرے اصناف شعر سے اُسے الگ کرنا ہو گا۔ غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجے کی دروں بینی پائی جاتی ہے غزل گو جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیاتؔ کائنات کا نقطہ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی ذات میں سب کچھ پا لیتا ہے۔ اس کا تخیل اپنی گلکاریوں سے اُس کے دل کو ایسے ایسے حسین پیکروں سے آباد کر دیتا ہے کہ پھر اس کو ادھر ادھر

جھانکنے تانکنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر کبھی وہ خارجی عالم کو دیکھتا ہے تو اس طرح نہیں دیکھتا جیسے دوسرے دیکھتے ہیں، بلکہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کے وجود کا ثبوت انسانی شعور و احساس میں تلاش کرتا ہے اور اپنی ذات کو اس کے علم کا ماخذ اور منتہا تصور کرتا ہے۔ غزل گو شاعر کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جس کی مدد سے اس کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رونق اور چہل پہل رہتی ہے اور اس کے اندرونی تجربوں میں بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی دروں بینی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل سے آپ گفتگو کرے اور جو تاثر مختلف وقتوں میں اس کے دل پر گزریں انہیں شعر و نغمہ کا رنگین لباس پہنا دے۔ تخیل اور جذبہ ایک دوسرے میں حل ہو کر جب موسیقی کی رنگین قبا زیب تن کر کے جلوہ گر ہوتے ہیں، تو شاعر کی روح اپنے تخیلی پیکروں سے ہم آغوش ہو کر رقص کرنے لگتی ہے۔ خیال موسیقی میں ایسا حل ہو جاتا ہے کہ اس کو اس سے جدا کرنا محال ہوتا ہے۔ شاعر اپنے اندرونی تجربے کو لفظوں کے ذریعے ظاہر کرتا ہے، جو بس ایک حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کی منطقی ترتیب جذبے کے اظہار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ہماری زبان چاہے وہ کتنی ہی منجھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس میں یہ صلاحیت کبھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرسکے جو دل کی وادیوں ہی میں گونجتے ہیں۔ غزل گو شاعر رمزی علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ میں ایسا ڈوبا رہتا ہے کہ اس کو یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ وہ جو کہتا ہے دوسروں کے لئے نہیں کہتا بلکہ اپنے من کی موج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ غالب کو اس کی مطلق پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے شعروں کو بے معنی کہتے تھے۔ خود اس کے دل میں ان کے معنی تھے

اور اس سے زیادہ اُسے کیا چاہیئے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دوسری جگہ کہتا ہے کہ دنیا والے بھلا میرے کلام کو کیا سمجھیں گے اور میرے دل کے جذباتی تجربوں میں کیسے شریک ہو سکیں گے۔ مجھے اگر اپنے کلام کی تھوڑی بہت داد مل سکتی ہے۔ تو وہ رُوح القدس (جبرئیل) سے مل سکتی ہے۔ وہ بھی اگرچہ میرے ہم زبان نہیں لیکن عالم اسرار کے راز داں کی حیثیت سے وہ تلامذۂ رحمٰن کی قدر افزائی کر سکتے ہیں ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

شعر اور خاص کر غزل کا شعر چونکہ اندرونی تجربے کا اظہار ہے اس لئے ضرور ہے کہ وہ فطرت میں کسی نہ کسی قسم کا اضافہ کرے۔ اور اگر وہ ایسا کرنے میں قاصر رہے تو تجربے کا اچھوتا پن مشتبہ رہے گا۔ تخلیقی تخیل کی بدولت غزل کے شعر میں زندگی کے تجربے کے کسی خاص لمحے کا اظہار ضروری ہے جو شعور اور تحت شعور کے تانے بانے کی ملاوٹ سے بنتا ہے۔ زندگی کے اندرونی تجربوں اور اُن کی متعلقہ کیفیتوں کو موسیقی میں سمو کر تاثر انگیز انداز میں بیان کرنا غزل کے شعر کا مقصد ہونا چاہیئے۔ دل کے اندرونی تجربوں میں تخیل اور جذبے کی ایسی آمیزش ہوتی ہے کہ وجدان ہی اس کیفیت سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور اسی کا اظہار غزل میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو دائمی طور پر زندگی کے طلسماتی عنصر کی تلاش رہتی ہے۔ فطرت کے طلسم دل کے طلسم کے آگے ہیچ ہیں۔ انسانی دل سب سے بڑا طلسمات کا مخزن ہے۔ اس کے اندر عجب عجب

عالم پنہاں میں۔ غزل گو شاعر اپنے نغمے کے میٹھے سُروں سے انسانی دل کے طلسماتی پیکروں کو اُن کی ابدی نیند سے بیدار کرتا ہے۔ جب ذہن نغمے کے طوفان کو قابو میں لاتا اور اس کو خاص اصول اور ضابطوں کا پابند کرتا ہے تو غزل کے شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی واسطے غزل گو شاعر کے تجربوں میں تخیل اور جذبہ آغوش در آغوش نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں سحر آگیں قوتیں ہیں۔ ایک دوسرے میں ضم ہو کر اُن کی قوت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اس طلسمی دنیا کا اظہار مبہم طور پر ہی ممکن ہے۔ معمولی قسم کا ذہن جب اعلیٰ تصوروں اور حقیقتوں کی تہ تک نہیں پہنچتا، تو ان کی نسبت قطعیت کے ساتھ حکم لگانا چاہتا ہے، جو اس کی بے بضاعتی اور کوتاہی کی دلیل ہے۔ خدا کی ذات کے متعلق عقیدہ، ثبوت کی قطعیت اور وضاحت سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس کے وجود کا مبہم سا احساس جو انسانی نفس میں ہوتا ہے عقیدت کی بنیاد بن جاتا ہے، جو بحث و فکر سے ہلائے نہیں ہلتی۔ اسی طرح جذباتی زندگی کے حقائق کو تخیل رمز و ابہام ہی کے ذریعے ظاہر کرتا ہے اور اسی واسطے وہ زیادہ موثر اور قابلِ اعتبار ہے

تخیل اور جذبے کا تعلق رمزیت سے

غزل گو شاعر کی درون بینی کے اصل عناصر تخیل اور جذبہ ہیں۔ تخیل ہی یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی یا غیر مرئی حقائق کو یا یوں کہئے کہ ان حقائق کو جو حواس کی کوتاہی اور نارسائی کی وجہ سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے، جیتی جاگتی شکل میں ہماری نظر کے سامنے لے آئے۔ تخیل ایک نہایت ہی لطیف، نازک اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکتے اور باریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے (غالب)

رمز و ابہام کے طلسم سے غزل کے شعر میں تھوڑی بہت پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو اس صنفِ سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ زندگی خود بڑی پیچیدہ حقیقت ہے۔ اس کے اندرونی تجربوں کے اظہار میں اگر پیچیدگی آجائے تو یہ بات خلافِ فطرت نہ ہوگی۔ اعلیٰ پائے کے غزل نگار کی حیثیت سے میر صاحب نے اس حقیقت کو محسوس کیا تھا۔ ان کے ہاں زبان کی سادگی کے باوجود رمز کا معنوی اشکال موجود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر — ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

اُن کے اسی مضمون کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں ؎

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز — بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا — سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

ایک آفت زمانہ ہے یہ میر عشق پیشہ!
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

میر صاحب اپنی کنایہ نگاری کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں ؎

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ — اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

ایک جگہ حالیؔ نے عاشق کی رمز آفرینی کو بڑے ہی اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون یہ باندھا ہے کہ عاشق اپنے رازداں سے بھی کھل کر بات نہیں کرتا بلکہ بتوں کی محبت کے عام ذکر پر اپنی گفتگو ختم کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا مقصود

تو اپنی سرگذشت سنانا ہوتا ہے۔ لیکن اس کو ایسے عام انداز میں بیان کرتا ہے گویا عشقِ بتاں کا قصہ سنانا مقصود ہے۔ عاشق کے اس طرز میں غزل گو شاعر کی رمز نگاری کے تمام انداز بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ شعر ہے ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا کھلے نہ مگر رازداں سے ہم

عشق و حسن کی داستان میں رمز و کنایہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ صرف عاشق کی گفتگو کی خصوصیت نہیں بلکہ معشوق کی باتوں کی بھی خصوصیت ہے محبوب کی جانب سے جو رمز و اشارہ ہوتا ہے اس کو ناسخ نے یوں بیان کیا ہے ؎

سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں
ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ

اسی مضمون کا ظفر کا شعر ہے ؎

بات کرتا نہیں کچھ اور کنائے کے سوا
چلی جاتی ہے سدا عاشقِ ہمراز سے رمز

امیر مینائی نے یہ مضمون اس طرح باندھا ہے ؎

صاف کہتے ہو مگر کچھ نہیں کھلتا کہنا بات کہنا بھی تمہارا ہے معما کہنا

نگی دہلوی نے محبوب سے اپنی کنائے کی گفتگو کا اس طرح ذکر کیا ہے ؎

کرتے ہیں دل کی تباہی کی ہم اُن سے تصریح
اس کنائے سے کہ برباد ہوا خانۂ شوق

تخیل اپنی توجیہ اور تعبیر خود اپنے انداز میں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے اور کوئی انداز پسند نہیں۔ وہ ان باتوں کو بھی جو عقلی طور پر پہلے سے ثابت ہیں اپنے

طور پر اور اپنے رنگ میں بالکل دوسری طرح سے ثابت کرتا ہے۔ اُس کا طرزِ استدلال منطقی استدلال سے جدا ہوتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر فکر کرتا ہے نہ کہ منطقی طور پر۔ آپ نے زمانہ کی فلسفیانہ اور سائنٹفک تعبیر و تعریف سنی ہوگی ایک غزل گو شاعر اس کی توجیہ یوں کرتا ہے ؎

اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے (جگرؔ)

زمانے کا تجربہ ہمیں اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے اور انسانی خودی یا دل حقیقت اشیاء کا پیمانہ اور معیار ٹھہرتا ہے۔ گویا زمانے کا تحقق دل کی کیفیت اور تخیل سے جدا نہیں۔ شاعر اپنے وجدانی ذوق کے ذریعے اس حقیقت کا راز ہم پر کس لطف کے ساتھ منکشف کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ اُس نے کیسے سیدھے سادے طریقے پر کر دیا۔ نہ کسی فلسفیانہ موشگافی کی حاجت ہوئی نہ وہ منطقی استدلال کی بھول بھلیوں میں خود پھنسا اور نہ دوسروں کو پھنسایا۔ شاعر نے جو ذہنی کیفیت پیدا کی وہ اس کے باطنی تخیل کا نتیجہ ہے نہ کہ حسی تجربے کا۔ حسی تجربہ اُس کے نزدیک محض چند علامتیں ہیں جنہیں وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربے میں تحلیل کر لیتا ہے۔ اس طرح منطقی استدلال سے تجربے کی دنیا میں جو سفر کی طوالت لاحق ہوتی ہے۔ اس سے بچ کر وہ تخیل کی ایک ہی زقند میں منزل پر پہنچ گیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ سارے سفر میں نزاکت اور لطافت اس کے دامن سے وابستہ رہی۔ اس طرح اپنے دل کو تخیلی پیکروں سے آباد کر کے غزل گو شاعر حسنِ ازل کا جلوہ خود ہی نہیں دیکھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتا ہے وہ اپنی تخیل نگاری کو حقیقت نگاری سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ تخیل ہی اس کے نزدیک اصل حقیقت ہے۔ خارجی فطرت کے حقائق سادہ

حقائق سے زیادہ وقیع نہیں۔ دیکھنے والے کی شوخیٔ نظر ان سادہ اور بے رنگ حقائق کو رنگین بنا دیتی ہے۔

ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے
رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی (جگر)

تاثر بھی علم کا ایک ماخذ ہے۔ ہم حقیقت کو پہلے محسوس کرتے ہیں، اگرچہ غیر واضح اور مبہم شکل میں اور اس کے بعد ہم اپنی رائے سے اسے بامعنی بناتے ہیں۔ روزمرہ کے معاملوں میں جن کا تعلق علم کی ادنیٰ صورتوں سے ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ذہن نے عملی اغراض کے تحت کائنات کے حقائق کو صاف اور واضح خطوط میں تقسیم کر لیا ہے۔ ان عملی ضرورتوں میں ذہن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ فرق و امتیاز کرے نہ کہ امتزاج۔ عملی اغراض کے لئے ہم لفظوں سے اپنے خیالات کو صاف صاف اور غیر مبہم طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ واضح قضایا کی شکل اختیار کر لیں جن پر منطق کے اصول کا پوری طرح سے اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن علم کے اعلیٰ تجربوں میں پیچیدگی اور ابہام لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں اور قضایا کی حیثیت ذہنی خطوط کی رہ جاتی ہے جن سے کل حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علم حاصل کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ہم کل حقیقت کا تخیلی تجربہ پہلے کریں اور اس کے بعد اس کی معنوی صفات کی نسبت اپنے قضایا قائم کریں۔ جب ہم حقیقت کے متعلق حکم لگاتے ہیں تو دراصل ہم اس سے ایک قسم کا ذہنی تعلق قائم کر لیتے ہیں جو تخیل کا کرشمہ ہے۔ جب ہم کسی تصویر کے رنگ اور اس کے خطوط کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہیں یا موسیقی میں لے اور آہنگ کی تحلیل کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا یہ عمل اس اندرونی تجربے کی جگہ نہیں لے سکتا جو تخیل کی بدولت ہماری روح میں پیدا ہوتا ہے۔ علم محض قضایا

کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ایک قسم کی روحانی جذب پذیری ہے جس میں اجزا کے بجائے کل حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے جس کا اظہار تخیل ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ نہر پر پن چکی چل رہی ہے تو یہ ایک ایسی حقیقت ہوگی جس کی تصدیق مطابقت کے قانون سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن علم کی گہری اور لطیف شکلوں میں اس قسم کی مطابقت ممکن نہیں۔ اندرونی اور جذباتی حقائق کی جانچ اس طور پر نہیں کی جا سکتی۔ ان حقائق کی جانچ میں ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ کس حد تک منطقی ضروریات کی تکمیل ہوئی۔ بلکہ ہماری فطرت کے ہر پہلو کا عکس اس میں موجود رہنا چاہئے۔ علم کی ان اعلیٰ منزلوں میں زندگی منطق سے بالاتر ہو جاتی ہے اگرچہ وہ حق اور حقیقت سے بالاتر نہیں ہوتی جو خود منطق کا منتہا ہے۔

وہ حقائق جن کا تعلق جذباتی یا روحانی لطائف سے ہے، انہیں منطقی قضایا کے ذریعے نہیں ظاہر کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ان کی نزاکت اور روح کو صدمہ پہنچے گا۔ ان حقائق کی روح کو صرف علامتوں سے ظاہر کرنا ممکن ہے۔ یہ علامتیں کبھی رنگ و خطوط کی شکل اختیار کرتی ہیں، کبھی لے اور آہنگ کی اور کبھی موزوں لفظوں کی۔ ان پر تخیل اپنی چھاپ لگا دیتا ہے۔ اس قسم کے تجربوں میں علم اور تاثر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ علم کے اعلیٰ مقاموں میں اندرونی تجربے کی شدت ایسی ہوتی ہے کہ تصور حقیقت کا جز بن جاتا ہے۔ جس کا اظہار صرف تخیل کی زبان میں ممکن ہے۔ تخیل اپنی علامتیں بناتا ہے جو رمز و ایما کا رنگ لئے ہوئے ہوتی ہیں جن سے ان لطیف حقائق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سمجھنے سے بھی زیادہ ان کا احساس ضروری ہے جو صرف انہی کے لئے ممکن ہے جن میں پہلے سے تاثر پذیری کا مادہ موجود ہے۔ اس قسم کے تجربوں میں تاثر اور تخیل ایک دوسرے سے ایسے وابستہ و پیوستہ ہو جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا

جا سکتا۔ اگرچہ معمولی زندگی میں اشیاء سے ہمارا تعلق خارجی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن اندرونی تجربوں میں ہم خود وہ بن جاتے ہیں جو ہم محسوس کرتے ہیں یا جو ہمارا علم ہوتا ہے۔ جذبات کی دنیا میں تصوّر اور حقیقت کا فرق و امتیاز فنا ہو جاتا ہے۔ معلوم اور عالم ایک ہو جاتے ہیں اور اُن کی ثنویت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح جذبہ تخیل کی مدد سے اپنی اندرونی شدّت کو خارجی عالم پر طاری کر دیتا ہے۔ شاعر دنیا کو جب اپنے جذبے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس میں گہرائی اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ حقیقت کی نئی جھلکیاں اُسے نظر آتی ہیں جن سے دوسروں کی نظریں محروم ہوتی ہیں۔ میر صاحب نے اسی جانب اشارہ کیا ہے ؎

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

تخیل کا حافظے سے بھی گہرا تعلق ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ حافظے میں تخیل مضمر رہتا ہے۔ ایک اندرونی قوت محرکہ ہماری یادوں کو ملا کر ایک کر دیتی ہے اور ان تمام تعلقوں سے انہیں علیحدہ کر لیتی ہے جو انہیں پہلے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اس طرح تخیل کی مدد سے حافظہ محفوظ کرنے کے ساتھ بھلانے کا فرض انجام دیتا ہے اور صرف وہی نقوش باقی رہتے ہیں، جنہیں تخیل باقی رکھنا چاہتا ہے۔ تخیل جب زندگی کے تجربوں کو حافظے کی مدد سے نقوش اور پیکروں کے سانچوں میں ڈھالتا ہے تو ان کے اظہار کے لئے لفظ تراشتا ہے اسی لئے ہر زبان کے لفظ علامتیں ہوتی ہیں اور اپنی اصلی حالت میں ہر زبان تشبیہ و استعارہ سے عبارت ہوتی ہے۔ اگرچہ معمولی حالات میں زبان کی یہ اصلیت ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ جب کوئی زبردست تخیلی قوت رکھنے والا شاعر لفظوں کو برتتا ہے۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زبان نے اس کے

سامنے اپنے سارے مخفی راز کھول دیئے۔ اس کے دل کی دنیا اور خارجی عالم میں جو تعلق ہے اسے ظاہر کرنے پر اس کو اپنے احساس کی شدت کی بدولت غیر معمولی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ لفظوں کی مدد سے وہ اپنے تاثرات اور تجربوں کے منتشر اجزاء میں امتزاج اور معنوی وحدت پیدا کرتا اور اُن کے دھندلے نقوش کو نغمے کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ اپنی ساخت اور اصلیت کے اعتبار سے خیال اور لفظ جو آواز کا طلسم ہے، ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں لیکن عجیب پراسرار طور پر وہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور شعر کی تاثیر اور جاذبیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اگر شاعر کے خیال کو موزوں لفظ نصیب نہ ہوا یا جو لفظ برتا گیا ہے خیال اس کے شایانِ شان نہ ہو تو آرٹ کی کوتاہی صاف ظاہر ہو جائے گی۔

جذبہ اور تخیل دونوں غنائی شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔ بعض نفسیات کے ماہروں کا تو خیال ہے کہ خود جذبے میں ایک حد تک تخیل کی کارفرمائی موجود رہتی ہے۔ تخیل انسان کے جذبات کا اندرونی ابھار ہے۔ شعر اور موسیقی میں تاثر خارجی اصوات کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ موسیقی کا توافق اور ہم آہنگی اُسے اکساتے اور بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ جن میں منطقی ترتیب کے بجائے ایک قسم کا طلسمی ربط ہوتا ہے۔ جس طرح موسیقی میں نہ تو جذبے کا سبب ظاہر کیا جاتا ہے اور نہ اس کے مقصود و منتہا کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ اسی طرح غزل میں بھی صرف جذبے کے وجود اور اصلیت کی طرف خفیف سا اشارہ کیا جاتا ہے جس طرح موسیقی میں جذبے کا کوئی پس منظر بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے مصوری و مجسمہ سازی میں ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح غزل میں بھی اس کی کوئی ضرورت نہیں موسیقی کی طرح غزل میں بھی اشیاء یا واقعات کی کوئی خارجی توجیہ نہیں ہوتی بلکہ ہم خود اپنے ذہنی تصورات سے اس خلا کو پُر کرتے ہیں جو یادوں کے برانگیختہ ہونے کے

سبب سے ہمارے حافظے میں پیدا ہو جاتا ہے۔ موسیقی ایسی زبان ہے جسے ہم سب سمجھتے ہیں۔ اس واسطے کہ اس کے ذریعے ہمارے جذبے کی بنیادی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اس زبان کو ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر الگ الگ طریقوں سے سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر ایک کے اندرونی تجربوں کی دنیا جدا ہے۔ موسیقی اور نغمہ صرف یہی نہیں کہ ہماری جذباتی زندگی کی بھولی بسری یادوں کو ابھارتے ہیں بلکہ اس کی تہذیب بھی کرتے ہیں جذبے کے آہنگ سے نغمے کے آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے اور نغمے کے آہنگ سے جذبے کی تہذیب ہوتی ہے۔ غنائی شاعری میں سننے والا اپنی ذات کو نغمے کی رُوح سے وابستہ کر لیتا ہے جو اور دوسرے فنون لطیفہ سے مقابلے میں خارجی اثر سے بے نیاز اور بے آمیزش ہوتی ہے۔ غزل میں جو غنائی شاعری سے عبارت ہے۔ لفظوں کا تزکیہ نغمے سے ہوتا ہے اور ان کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ بعض دفعہ خالص تجریدی نغمے کو متعین کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن شعر میں لفظوں کی مدد سے یہ دشواری باقی نہیں رہتی۔ نغمے کی روح اور لفظ کی رُوح جب ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے میں سمو جاتی ہیں تو شعر کی تاثیر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اگر لفظوں میں نثر کی طرح تعین یا تفصیل زیادہ ہے تو وہ نغمے سے کبھی بھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے جس کے باعث شعر بے اثر اور پھسپھسا رہے گا۔ بیانیہ قسم کی ذہنی شاعری جو ارادی قوت کے بل بوتے پر کی جائے اور جس میں تحت شعور کی یادوں اور ارتقائے کیف کی کمی ہو اپنی بے آہنگی کے سبب سے بے اثر رہے گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ غنائی شاعری میں خالص موسیقی کی بہ نسبت جس میں بول ہی بول ہوتے ہیں، زیادہ تعین پایا جاتا ہے۔ لفظوں کے معنے ہوتے ہیں، سُروں

کے معنے نہیں ہوتے۔ ان کا اثر بس اشارتی ہوتا ہے۔ جس طرح موسیقی میں سُروں اور راگوں کا اعادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح غزل میں ردیف اور قافیے کے اعادے اور ترتیب سے وہی کام لیا جاتا ہے۔ نثر میں متکلم مخاطب کو مطالب منتقل کرتا ہے تاکہ اطلاع ہو اور عمل کی کوئی صورت ظہور میں آئے۔ عمل کو اعادہ پسند نہیں ہوتا۔ وہ گزری ہوئی منزلوں سے پھر دوبارہ گزرنا نہیں چاہتا بلکہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لئے نثر میں اعادہ و تکرار عیب ہے لیکن غنائی شاعری میں یہ عیب نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے۔ جذبہ وزن اور سُروں کے ذریعے بار بار اپنا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس واسطے کہ اس تکرار سے تحت شعور کی بھولی بسری یادوں کو ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔ غزل میں ردیف اور قافیہ اور وزن و بحر موسیقی کی لے اور سُروں کی طرح بظاہر مبہم اور بے مقصد معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان کے توسط سے خیال نغمے میں ضم ہو جاتا ہے اور جذبے کی اندرونی حرکت اور شدت ظہور میں آتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ شاعر محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندرونی تجربوں کی ترجمانی لفظوں سے جیسی چاہئے ویسی ممکن نہیں تو وہ وزن اور آہنگ سے اُن کی بازگشت کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لفظوں کی کوتاہی کو اس طرح دُور کر سکے۔ جس طرح موسیقی میں جذبے کا اظہار بے لوث اور نکھری ہوئی شکل میں ہوتا ہے، ویسا شعر میں نہیں ہو سکتا جو لفظوں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی شاعر اپنے جذبے کو جو تحت الشعوری دنیا کا طلسمی عنصر ہے خیال کا رنگ دے کر اس کے کچھ نہ کچھ دھندلے نقوش ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ موسیقی بھی اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اظہار میں محدود نظر آتی ہے۔ تحت شعور کی جذباتی دنیا میں جو ہنگامے بپا ہیں اُن کی تھوڑی بہت کیفیت تو وہ ضرور پیش کرتی ہے۔ بعض دفعہ اس دنیا کا حال

لفظوں سے بہت کچھ کھلتا ہے جن کی آواز بازگشت تخیل کی وادیوں میں گونجتی ہے۔ لفظ میں جذبہ اور تخیل جب ملتے ہیں تو ذہن میں اسی طرح روشنی کی کرن پیدا ہوتی ہے جیسے دھات اور چقماق کے ملنے سے چنگاری نکلتی ہے۔ بعض لفظ ایسے ہوتے ہیں جن میں انتقال ذہنی اور تلازم خیالات کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان کی بدولت تاثرات کی دنیا اتنے حقائق تازہ بہ تازہ نو بہ نو پیش کرتی ہے۔ ان حقائق کے رُخ پر جذبے اور تخیل کا غازہ ملا ہوا ہوتا ہے۔ محفل خیال کے نقوش و تصورات خارجی حقیقت سے ہم کلام ہونے لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تحت شعور کی تاریکیاں ایک دم سے جلوؤں سے معمور ہو گئیں اور دل کی سونی بستی میں چہل پہل اور رونق پیدا ہو گئی۔

قادر الکلام شاعر کے یہاں جذبہ اور تخیل مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اُن کے الگ الگ وجود باقی نہیں رہتے۔ وہ اپنے طلسمی اعجاز سے تخیل کو جذبات زدہ ہونے سے بچا لیتا ہے اور اسی طرح جذبے کو تخیل زدہ نہیں ہونے دیتا۔ غنائی شاعری میں اگر اس قسم کا ضبط و اعتدال نہ ہو تو اس کی تخلیق حسن کی صلاحیت مجروح ہو جائے گی۔ کبھی ادراک کو وسعت دے کر اسے جذبے کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے تاکہ فکر کا سپاٹ پن دُور ہو۔ غنائی شاعری میں یہ سب صورتیں ممکن ہیں اور نغمہ و آہنگ کی ایمائی کیفیت میں حافظے اور تمنا کی نیرنگیاں لفظوں کا رُوپ بھر کر جاذب قلب و نظر بنتی ہیں۔ شاعر اگر اپنے اندرونی جذبے اور تجربے کو زندہ شکل میں ہم تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اُس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ دیکھے کہ ایسا کرنے میں منطق کا تسلسل برقرار رہا یا نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ شاعرانہ صداقت شاعر کے اندرونی جذبے اور تجربے کو زندہ شکل میں ہم تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اُس نے اپنا فرض ادا کر

دیا۔ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ دیکھے کہ ایسا کرنے میں منطق کا تسلسل برقرار رہا یا نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ شاعرانہ صداقت شاعر کے اندرونی اور تحت شعوری تجربے سے ہم آہنگ اور مربوط ہو کہ بغیر اس کے سامع کے شعور میں شدت اور اُبھار کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی اور وہ شاعر کے تخلیقی عمل میں شریک نہیں ہو سکتا۔

تغزّل میں جذبہ و تخیل کے علاوہ حسّی تجربے (سینسیشن) کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بعض شاعروں نے اس کو بطور قدر پیش کیا ہے۔ وہ اپنے حسّی تجربے میں کسی دوسرے عنصر کی آمیزش نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کے نزدیک جذبہ و تاثر کی تہ میں بھی حسّی تجربے کی کارفرمائی ہوتی ہے جو ہماری مادّی زندگی کا جوہر ہے۔ مثلاً ہمارے اُردو شاعروں میں جرأتؔ اور داغؔ میں یہ رجحان صاف نمایاں ہے۔ اُنھوں نے حسّی تجربے کو اجاگر کرنے میں تخیل سے ضرور مدد لی ہے کہ بغیر اس کے شاعر اپنا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن انھوں نے حسّ کو جذباتی حقیقت میں تحلیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اسی واسطے ان کی شاعری کی حدیں مجاز سے ذرا آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجے کے آرٹسٹ کے یہاں حسّوں کی انفرادی میں جذبہ ایک طرح کا معنوی توازن قائم رکھتا ہے جو تخلیق کا محرک ہوتا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور حسرتؔ کے یہاں حسّی تجربے جذبے میں تحلیل ہو گئے ہیں جو تحت شعور کا رازدان ہوتا ہے۔ غالبؔ کے یہاں "جنّتِ نگاہ" اور فردوسِ گوش کی ترکیبیں ان حسّی تجربوں کی طرف ہمارے ذہن کو لے جاتی ہیں جن کی تہذیب جذبے اور فکر کے آغوش میں ہوئی ہو۔ یہ سچ ہے کہ مادّی طبیعی عالم ہی ہماری حسّوں کا ماخذ ہے لیکن جذبے اور تخیل کی مشترکہ قوّت خارجی فطرت پر تصرف پاتی ہے اور ان تعلقات کا تعین کرتی ہے، جو دل کی دنیا کو اس کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ دل کی دنیا کے لئے خارجی عالم پس منظر کا کام دیتا ہے۔ اس خارجی عالم میں فطرت

بھی شامل ہے اور دوسرے انسان بھی جن کے تعلقات کی گرہوں سے خود آرٹسٹ بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ تعلقات جماعت کے ہر فرد کو گھیرے ہوئے ہیں اور آرٹسٹ چونکہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذی حس ہوتا ہے اس لئے وہ اُن سے اور زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ جس طرح ہر روشن سیارے کے گرد دھندلے سائے کی طرح ایک حلقہ رہتا ہے جس کے سروں پر روشنی بالکل دھیمی پڑ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل غائب ہو جاتی ہے اور فضا میں گم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زندگی میں تعلقات کا مبہم سا حلقہ ہوتا ہے جسے تاثر و جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی مکانی حقیقت کے واضح خدوخال تک اپنی نظر محدود رکھیں تو حقیقت کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔ واضح خدوخال کے گرد اس شے کا جو مبہم حلقہ اثر ہے جس میں اس کے ارتعاشات اپنا کام کرتے ہیں اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس میں سبب اور اثر ایک دوسرے میں گھتے ہوئے ہوتے ہیں۔ جذبہ و تاثر کی دنیا میں اُن کے گرد تعلقات کے جو مبہم اثر رہے ہوتے ہیں وہ تخلیق کے محرک ہوتے ہیں۔ جو جذبہ خود اپنے اوپر پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اس میں ایک طرح کی سختی، بنجرپن اور تجرید پیدا ہو جاتی ہے جو جمالیاتی تخلیق کے لئے ساز گار نہیں۔

ہمارے تجربے میں جو اشیا آتی ہیں ان کا صحیح ادراک ہم اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم ان تعلقات کا جائزہ نہ لیں جو انہیں دوسری اشیاء سے وابستہ کئے ہوئے ہیں اور جن کے سبب سے وہ بامعنی بنتی ہیں۔ جس طرح طبیعی عالم کے اجزا میں زمانی اور مکانی تعلق موجود رہتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی تعلقات کی گرہیں پڑی ہوتی ہیں جنہیں تاثر و جذبہ محسوس کرتے ہیں جو ان علامتوں کے معانی میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ علم جس میں تعلقات کے معانی علامتوں سے

ظاہر کئے جائیں وجدان پر مبنی ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ اس کا انحصار بلا واسطہ اندرونی تجربے پر ہوتا ہے۔ ان علامتوں کا معانی سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے شعور اور تحت شعور میں دھندلے دھندلے سائے کے حلقے پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی روشن تصور یا عین کے گرد موجود رہتے ہیں۔ ان میں جذبہ ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔ اس دھندلکے میں عقل ایک طرف کھڑی نظر آتی ہے اور جبلت دوسری طرف، جیسے دو مخالف ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ایک دوسرے کو چیلنج دے رہے ہوں۔ جذبہ یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور حیرانی کے عالم میں آنکھ بند کر کے پھر ٹامک ٹوئیاں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس امید میں کہ کہیں نہ کہیں تو ضرور پہنچے گا۔ چونکہ اس کی منزل دھندلکے کے اندر ہوتی ہے اس لئے وہ اس سے باہر اپنا قدم نہیں نکالتا۔ وہ پرچھائیوں کے حلقوں کی سیر میں مگن ہو جاتا ہے۔ جن میں اسے مبہم سا تعلق بھی نظر آتا ہے۔ یہ تعلق کہیں محبت کا تعلق تو نہیں جس سے فطرت نابلد ہے۔ یہ جنس صرف دل کی دنیا میں بستی ہے اور اس کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ محبت ہی میں انسان اپنے آپ کو سب سے زیادہ آزاد محسوس کرتا ہے۔ اس کی زنجیریں بھی اُسے پسند ہیں۔ اس واسطے کہ انہیں وہ خوشی خوشی اپنی مرضی سے اپنے پاؤں میں ڈالتا ہے۔ یہ زنجیریں تعلقات کی رمزی علامتیں بن جاتی ہیں جن کی مدد سے آرٹ کی تخلیق ہوتی ہے۔ جب ہمیں کوئی چیز حسین معلوم ہوتی ہے تو لازمی طور پر اُس کی تہ میں پیچیدہ حقیقت کے تعلقات ہوتے ہیں جن کا احساس بجائے خود قدر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

انسان فطرت کی قدر کر سکتا ہے لیکن اس سے دلی محبت نہیں کر سکتا فطرت کا جامد مغربی تصور ہمارے غزل گو شاعروں کے لئے ناقابل فہم ہے

فطرت کی توجیہ انسانی وجود سے علیحدہ ایک قسم کا رومانی خیال ہے، جو خارجی حقیقت میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ غزل گو شاعر فطرت کے احساس سے محروم نہیں بلکہ وہ اُس کو عادۃً دیکھنے اور برتنے کا خوگر ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کی اہمیت بس اتنی ہے کہ وہ انسانی عمل کا پس منظر مہیا کرتی ہے اس لئے وہ خود مرکز توجہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے فطرت کا ذکر اس کے ہاں ضمنی طور پر آجاتا ہے۔ غزل میں فطرت کبھی موضوع نہیں بن سکتی۔ موضوع کا پس منظر ہو سکتی ہے۔ فطرت کے مناظر دراصل نظم کا موضوع ہیں جو بیانیہ شاعری ہے۔ غزل انسانی دل کے لطیف جذبات و کیفیات کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ و تعبیر درکار ہے۔ تخیل ہی جذبے کا راز دار ہے۔ جو نکہ یوں کہئے کہ غزل جذبے کا بیان ہے۔ تخیل کی زبانی نظم لکھنے والا پیچیدہ حقائق کو سادہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ خیال و تصور کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کی تفصیل بیان کرے۔ غزل گو شاعر جانتا ہے کہ احساس و تاثر کی دنیا میں کیمیاوی طور پر تجزیہ اور تحلیل ممکن نہیں۔ اس لئے وہ پیچیدہ حقائق کو پیچیدہ رہنے دیتا ہے اور اُن کے اندرونی تجربوں کے لئے بجائے تشریح و تفصیل کے اجمال و ابہام کی زبان استعمال کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ مطالب اور حقائق کے الجھاؤ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس سے بیگانہ ہو کر مستانہ وار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا مقصد حقائق کی پیچیدگیوں کو سلجھانا نہیں بلکہ ان کا لطیف تاثر و احساس پیدا کرنا ہے جو رمز و اشتباہ کا رنگ لئے ہوئے ہو، اسی لئے وہ اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس کے بیان میں استدلال کی کوئی کڑی چھوٹی یا نہیں۔ چھوٹ گئی تو چھوٹ جائے۔ وہ اپنے آپ کو تعقل سے زیادہ تاثر کا تابع فرمان خیال کرتا ہے۔ جذبات کی فرماں برداری اس کا طرۂ امتیاز

ہے۔ لطف یہ ہے کہ غزل گو شاعر کی اکھڑی اکھڑی باتیں جن میں منطقی استدلال کا تسلسل اور اس کی سب کڑیاں بھی موجود نہیں ہوتیں۔ اس مبہم اور گہری حقیقت تک ہماری رہنمائی کر جاتی ہیں جس کی خصوصیت کا پتہ اس جذبے سے چل سکتا ہے جو انسانی دل میں پیدا ہوتا ہے۔ غزل کے بعض شعروں کو سُن کر ایسے جذبے اور تاثر پیدا ہوتے ہیں جو منطقی تعقل سے کہیں زیادہ گہرے اور پُراسرار طریقے پر ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ ربط منطقی تصوروں کے ربط سے بالکل علیحدہ نوعیت رکھتا ہے اور باوجود غزل کی ظاہری ریزہ کاری کے ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقل و ادراک کی تہ کے نیچے تحت شعور اور وجدان کی دنیا میں ان جذبات کا کارخانہ علیحدہ چل رہا ہے اور اس کے اعتبارات کی نوعیت ہی بالکل الگ ہے اور اس کے انتظام کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں نہیں۔ غالباً یہ جذبات زندگی کی اصل سے بہ مقابلہ عقل کہیں زیادہ قریب ہیں اور زندگی کی بصیرت انہیں سمجھے بغیر ہمیشہ ادھوری رہے گی۔ منطق اُن کی نسبت کچھ نہیں جانتی اور ہمیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وہ ہمارے وجود کی گہرائیوں میں سے سرگوشیاں کرتے ہیں جنہیں ہمارا دل سنتا اور سمجھتا ہے۔ جن امور کے متعلق مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کوئی چیز پُراسرار نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں ہمارے شعور کی رسائی محدود ہے۔ وہاں طرزِ بیان میں ابہام و رمز کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ غزل کے یہ دونوں عناصر تحت شعور کی مبہم اور پُراسرار کیفیتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

تخیّل کا اندرونی اور خارجی عالم

غزل گو شاعر کی دروں بینی میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں۔ وہ خارجی عالم کی رنگارنگی سے جسے وہ چمن اور گلستان کے علامتی لفظوں اور استعاروں سے یاد کرتا ہے۔ کہیں زیادہ دل کش

اور حسین ہوتے ہیں۔ اس کو سرو وسمن کی سیر کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ اس کے دل کی طلسمی دنیا میں یہ سب کچھ تخیل و جذبے کے فیض سے پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ بقول بیدلؔ ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے نجستہ بو مپسند زحمتِ جستجو
بہ خیال حلقۂ زلفِ او گرہے خورد بہ ختن درآ

اسی خیال کو ایک دوسری غزل میں بیدلؔ نے اس طرح پیش کیا ہے ؎

بیدلاں چند خیالِ گل و شمشاد کنند
خوں شوند ایں ہمہ کز خود چمن ایجاد کنند

یہ مضمون اُردو کے غزل گو شاعروں کے یہاں کثرت سے ملتا ہے۔ ہمارے شاعروں کی دروں بینی اس میں ایسی ایسی نکتہ آفرینیاں کرتی ہے کہ ان کا جواب نہیں۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک انسان کی اندرونی زندگی کا لطیف استعارہ ہے جسے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ جس طرح دل تخیل کا اندرونی

لہ غالباً یہ خیال بیدلؔ نے حافظؔ سے لیا ہے جس کا شعر ہے ؎

حیفم آید کہ خرامی بہ تماشائے چمن — کہ تو خوشتر ز گل و تازہ تر از نسرینی

دوسری جگہ کہا ہے ؎

سرو رش عشق دارد و دل دردمند حافظؔ — کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

سعدیؔ کا شعر بھی خوب ہے ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا مے روی

عالم ہے، اسی طرح گل و گلشن سے تخیل کا خارجی عالم مراد ہے۔ غزل میں خارجی تجربہ بھی داخلی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

کم نہیں ہے دل پر داغ بھی اے مرغ اسیر
گل میں کیا ہے جو ہوا ہے تو طلبگار چمن

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا
اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس راز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

ایک جگہ تو میرؔ صاحب نے صاف صاف کہا ہے کہ گلشن فطرت کی رنگا رنگی خود ان کی اندرونی جذباتی زندگی کی غمازی کرتی ہے ؎

سرو و لب جو لالہ و گل نسرین و سمن ہیں غنچہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگین خیالوں کا

سوداؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

مجھے یارو دماغ اب کیا ہے گلگشتِ دو عالم کا
قدم رکھنے میں باہر گوشۂ خاطر سے کاہل ہوں

غالبؔ کہتا ہے کہ شراب خانے کے دیوار و در یعنی خارجی عالم میں کیا رکھا ہے۔ اصل حقیقت تو جلوۂ گل کا تصور ہے جو ہماری مستی اور نشاط کا موجب ہے شعر ہے ؎

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کی دیوار و در میں خاک نہیں

دوسری جگہ کہتا ہے کہ دل کی دنیا میں معنوی حقائق کی جو بہار جلوہ گر ہے اس سے انسان کو لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ وہ بے خزاں ہے۔ خارجی عالم کی بہار گلوں کی رہین منت ہوتی ہے جو ناپائدار ہیں۔ آج کھلے اور کل مٹی میں مل گئے۔ شعر ہے ؎

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی   غیر گل آئینۂ بہار نہیں ہے

خواجہ احسن اللہ خاں بیاںؔ کا بھی اسی مضمون کا شعر ہے ؎

جھانک ٹک باغِ دل میں اپنے بیاںؔ   اس چمن میں بھی کم بہار نہیں

میر حسنؔ بیٹھے ہی بیٹھے اپنے تخیل کی مدد سے دو عالم کی سیر کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

صورت نہ ہم نے دیکھی حرم کی نہ دیر کی
بیٹھے ہی بیٹھے دل میں دو عالم کی سیر کی

مجروحؔ کا شعر ہے ؎

دل میں آ بیٹھئے اور سیرِ دو عالم کیجئے
ہے بہت دور کا اس منزلِ ویراں سے دکھاؤ

جگرؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہاں کے سرو و صنوبر کہاں کے لالہ و گل   نگاہ ہی میں جو کیفیتِ بہار نہ ہو

عشق میں کیا لالہ و گل کیا چمن کیسا قفس!
میں ہی خود اپنا گلستاں میں ہی خود اپنا قفس!

فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہوں
جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

صیاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچہے   جب میں نہیں تو رونقِ گلزار بھی نہیں

سمجھائے کون بلبلِ غفلت شعار کو   محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حُسن کے جلوے
یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

دستِ جنونِ شوق کی گلکاریاں نہ پوچھ   ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

حُسن کی شانیں چھپی جتنی سب نمایاں ہو گئیں
جو ترے رُخ سے بچیں رنگِ گلستاں ہو گئیں

کہاں تک ہیں یہ رنگ و بُو کی بہاریں   تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں

اب مرے سامنے ٹھہرے تو گلستاں کوئی   ہو چلا ہے مری صورت سے نمایاں کوئی

جلوہ جو اُن کے رُخ کا مری چشم تر میں ہے
شادابیٔ بہار کا عالم نظر میں ہے

نہ چھیڑ ان کے تصور میں اے بہار مجھے   کہ بوئے گل بھی ہے اس وقت ناگوار مجھے

اپنے سینے کے داغ میں لالہ کا رنگ دیکھنا اور چاکِ جیب سے بہار کی کیفیت کا اندازہ لگانا دروں بینی کا کمال ہے۔ اثیر لکھنوی کا شعر ہے ؎

ہر داغ سینہ لالۂ گلزار فیض ہے
پاتے ہیں چاک جیب میں اندازۂ بہار

پھر جس طرح بہار کے تعین میں شاعر اپنے دل کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے اسی طرح وہ خزاں کی بھی توجیہ کرتا ہے ؎

خزاں نہ تھی چمنستانِ دہر میں کوئی   خود اپنا ضعفِ نظر پردۂ بہار ہوا

اگر دل کی بستی آباد نہ رہے تو بہار میں کوئی لطف باقی نہ رہے ؎

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار
دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا   (آرزو)

اصغر کے یہاں بھی دروں بینی کے عناصر ملتے ہیں جن میں شاعر اپنی ذات اور

اپنے تجربوں کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ شعر ہیں ؎

میرے مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو

اس میں وہی ہے بامرا حسن خیال ہے — دیکھوں اٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو

کبھی شاعر کی دروں بینی اپنے تخیل اور جذبے کی تشفی کا سامان اُس کی ذات میں تلاش کرتی ہے جو اس کے دل میں براجمان ہے یعنی اس کا محبوب۔ اب وہ کائنات کو غیر خود کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی دروں بینی ہے۔ اس کا اقتضا ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات خارجی کائنات پر طاری کر دے۔ اور اس کی من مانی توجیہہ پیش کرے۔ موسم بہار کیا ہے؟ وہ کسی کے خرام جلوہ کے نقش قدم سے عبارت ہے اور بس ؎

خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا — آسی غازیپوری

گل و گلشن کے رمزی استعارے

کبھی محبوب کے ساعدِ سیمیں اور دستِ پرنگار کو دیکھ کر شاخ گل مثل شمع جلنے لگتی ہے اور گل پروانہ بن جاتا ہے۔ یہ تخیل کی کرامات نہیں تو اور کیا ہے شعر ہے ؎

دیکھ اس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پُرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمعِ گل پروانہ تھا — غالب نسخہ حمیدیہ

گل و نسرین و سمن کی عزت عاشق کی نظر میں اس وقت بڑھتی ہے جب اس کا محبوب سیرِ گل گشت کی غرض سے چمن کی جانب خرامِ ناز فرماتا ہے ؎

بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین و سمن کی
لائی ہے چمن میں اُنہیں تقدیر چمن کی — (حسرت)

چمن میں غنچہ کھل کر گل کیوں بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب اور اس مسئلے کی شاعرانہ توجیہ و تعبیر سنیئے۔ شاعر کا محبوب گل گشت کے لئے چمن کی طرف جانکلا۔ اُس کے انداز و ادا غنچے کو ایسے بھلے معلوم ہوئے کہ وہ آغوش کھول کر اس سے بغل گیر ہونے کا متمنی ہو گیا۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

گلشن کو ادا نیری از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی[1] ہے

اس مضمون کو آتشؔ نے یوں ادا کیا ہے ؎

گئے جس بزم میں روشن چراغِ حُسن سے کر دی
بہارِ تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے

ناسخؔ خزاں کی توجیہ اسی انداز میں کرتا ہے ؎

اس رشکِ گل کے جاتے ہی بس آگئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ ہو کے چمن سے نکل گیا

گل اپنے پیرہن کیوں چاک کرتے ہیں؟ میرؔ صاحب کا خیال ہے کہ محبوب کی قبا کا بند کھلا رہ گیا تھا جسے دیکھ کر گلوں پر کیفیت طاری ہو گئی۔ شعر ہے ؎

گلوں کے پیراہن ہیں چاک سارے کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا

جب محبوب چمن میں آتا ہے تو فطرتِ نامیہ شوقِ بے حد کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر گل کو اس کے گوشۂ دستار تک پہنچانے کے لئے بیتاب ہو جاتی ہے ؎

---

[1] کبھی گل کی طرح آئینہ بھی فرطِ اشتیاق میں آغوش کشا ہو جاتا ہے۔ حسن توجیہ لاجواب ہے ؎ تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے (غالبؔ)

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے　　　خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

میر صاحب نے نسیم سحری کے اڑانے کی زلفِ محبوب سے توجیہ کی ہے

مگر نکلی ہے کسو کی نگر بکھری زلف سے　　　آنے میں بادِ صبح کو یاں اک دماغ ہے

صبا کی بد دماغی پر اسی مضمون کا دوسرا شعر ہے ؎

شاید اس زلف سے لگی ہے میر　　　باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

بہار میں جو رنگینیوں کا جوش ہے۔ اس کی تہ میں نکتہ رس شاعر کی آنکھ کسی کے خونِ تمنا کو شریک دیکھ لیتی ہے۔ ورنہ ایسا نہ ہوتا تو بہار کے رنگ میں ایسا نکھار اور چوکھا پن نہ آتا ؎

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش
شامل کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا　　　(جگر)

اسی مضمون پر مومن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ تخیل کی ایمائی قوت کا کمال دکھایا ہے ؎

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی
تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو
وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

پہلے شعر میں خوشبو اور دوسرے میں رنگ کی رمزی علامت محرک جذبہ ہیں۔ مومن کا خیال تھا کہ مرغِ چمن بہار کے موسم میں اس لئے بے تاب ہوتا ہے کہ بہار نے محبوب کے مسکرا کے آنے کی ادا سیکھ لی ہے ورنہ اس میں کوئی دلکشی نہ ہوتی۔ شاعر نے اس شعر میں عاشق کے دل کی کیفیت کو مرغِ چمن کے دل پر طاری کر دیا اور اس طرح بہار کی حیثیت ضمنی رہ گئی۔ مرغِ چمن کی وارفتگی کی اصل وجہ معشوق کی مسکراہٹ ٹھہری جو شاعر کی دروں بینی کا کمال ہے ؎

نہ جانے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

نکہتِ گل کسی کے کوچے میں پہنچنے کے لئے ایسی بیتاب ہوتی ہے کہ صبا کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے تاکہ اس کے سہارے وہاں تک رسائی ہو سکے ؎

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا — غالب

اگر چمن سے شاعر کو جذباتی تعلق نہ ہو تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کا مقصد محض خارجی مظاہر کا تماشا نہیں ہوتا بلکہ اندرونی اور تخیلی مطالبوں کو پورا کرنا ہے۔ اس مضمون پر حسرت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زنہار ملے لطف اگر سیرِ چمن کا — ساتھ اپنے جو وہ سرو سرافراز نہیں ہے
سیرِ گل خوش نہیں آتی کسی عنوان ہمیں — جا کے لوٹ آتے ہیں دیوارِ گلستاں کے قریب

فصلِ گل دھوم سے آئی ہے پر اے رشکِ بہار
اک ترے پاس نہ ہونے سے خزاں ٹھہری ہے — (حسرت)

نہیں کہ عشق نہیں ہے گل و سمن سے مجھے
دلِ فسردہ لئے جاتا ہے چمن سے مجھے — (وحشت)

بعض اوقات جدائی کی حالت میں مرغِ چمن کی زمزمہ سنجیوں سے لطف کے بجائے کوفت ہوتی ہے اور سننے والے کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان میں زبردست ایمائی کیفیت ہے جو یادوں کو تازہ کرتی ہے ؎

ازبس جنوں جدائیِ گل پیرہن سے ہے
دل چاک چاک نغمۂ مرغِ چمن سے ہے — مومن

اسی موضوع کی نسبت میر صاحب فرماتے ہیں ؎

محبّت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

اگر ایک دفعہ عاشق چمن سے بیزار ہو کر اٹھ جائے تو پھر اس کی کوئی دلکشی اس کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتی۔ میر صاحب نے عاشق کی نازک دماغی کی تصویر اس شعر میں کھینچی ہے ۔

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا!
ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکارا رہے

میر صاحب کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں ۔

گل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا | گل لگے کہنے کبھو منہ نہ ادھر ہم نے کیا
اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گل | پر اس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گل
گلشن بھرا ہے لالہ و گل سے اگرچہ سب | پر اس بغیر اپنے تو بھائیں لگی ہے آگ
مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں | میں جوں نسیم باد فروشِ چمن نہیں

چمن میں پھول گل اب کے ہزار رنگ کھلے
دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا
تم بن چمن کے گل نہیں چڑھتے نظر کبھو
یہ کیا روش ہے آؤ چلے ٹک ادھر کبھو

گل پھول سے کب اس بن لگتی ہیں اپنی آنکھیں | لائی بہار ہم کو زور آوری چمن میں
اچھی لگے ہے تجھ بن گلگشتِ باغ کس کو | صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو

اسی مضمون کا جرأت کا شعر ہے ۔

یاد کس گل کی تھی یارب مرے تن من سے لگی
آگ سی دل میں جو سیرِ گل و گلشن سے لگی

کبھی عاشق چمن سے کترا کر گذر جاتا ہے کہ کہیں اس کے حال زار کو دیکھ کر ہر گل تر چشم خونچکاں نہ بن جائے ؎

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں چکاں ہو جائے گا (غالب)

غم فراق کی حالت میں عاشق کو گل کی بے محل ہنسی بُری لگتی ہے اور گلشن سے اُس کی طبیعت گھبراتی ہے ؎

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا (غالب)

شاعر کے لئے بہار میں ایک طرح کی ایمائی قوت ہوتی ہے۔ اس سے اس کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں ؎

جلوۂ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

ابر شفق آلودہ کو دیکھ کر شاعر کو یہ یاد آیا کہ کسی کی فرقت میں چمن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر آگ برس رہی ہو ؎

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر (غالبؔ)

اسی مضمون کو فانیؔ نے یوں ادا کیا ہے ؎

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی (فانیؔ)

اصغرؔ کا شعر ہے ؎

نگاہِ شوق کو یارائے سیرِ دید نہ ہو
جو ساتھ ساتھ تجلّیِ حُسنِ یار نہ ہو

چمن میں باد بہاری کے قدم سے جس طرح نئی زندگی جنم لیتی ہے اسی طرح مایوس اور شکستہ دل میں کرم یار کی یاد سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے ؎

دلِ پُر شوق میں آئی کرم یار کی یاد   کہ چمن میں قدم بادِ بہاری آیا

ہماری شاعری میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں کہ شاعر گلشنِ فطرت کی نیرنگیوں کا تماشا اپنے اندرونی احوال و محرکات کے حوالے سے کرتا ہے اور ان کی شاعرانہ توجیہ پیش کرتا ہے۔ اردو کے مختلف دوروں کے شعراء کے کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وؔلی کا شعر ہے ؎

جاتا ہوں باغ یاد میں اس چشم کی ولؔی
شاید کہ بوئے اس کی ہو نرگس کی باس میں

میرؔ صاحب کے دیوان میں گل و گلشن کے رمزی استعاروں کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے دیوان میں اتنی مثالیں نہیں ملیں گی۔ یہاں صرف چند پیش کی جاتی ہیں ؎

سرو و شمشاد خاک میں مل گئے   تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

اس چہرے کی خوبی سے عبث گل کو جتایا
یہ کون شگوفہ چمن زار میں لایا

گل کام آوے ہے ترے منہ کے نثار کے
صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اُس کا دہن نہیں

ہر نقشِ پا ہے شوخ ترا رشکِ یاسمن   کم گوشۂ چمن سے ترا رہ گزر نہیں

کروں کیا حسرتِ گل کو وگرنہ   دلِ پُر داغ بھی اپنا چمن ہے

آتی بخود نہیں ہے بادِ بہار اب تک
دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک
چاہیے رو اس کا سا رو ہو قامت ویسا قامت ہو

اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے
ولیک چاہیے ہے منہ بھی ناز کرنے کو

آغشتہ میرے خوں سے اے کاش جا کے پہنچے
کوئی پر شکستہ ٹک گلستان تلک کو

پائے گل اس چمن میں چھوڑا گیا نہ ہم سے
سر پر ہمارے اب کی تہمت ہے بے پری کی

گل دیکھ کر چمن میں تجھ کو کھلا ہی چاہے
یعنی ہزار جی سے قربان ہو رہا ہے

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم
مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جاتا گیا

گل گشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے
آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتار چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آئے

سرو نہ و بالا ہوتا ہے درہم برہم شاخِ گل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لائے ہو

سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو
ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

گل نے ہزار رنگِ سخن وا کیے ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

گریہ پہ رنگ آیا قید قفس سے شاید
خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ

سچ پوچھو تو کیا ہے گا اس کا سا دہن غنچہ
تسکین کے لیے ہم نے اک بات بنائی ہے

برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ
نکلا نہیں ہے ایک رخ یار سا ہنوز

دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اسے کہیں گُل حیرتی ہے صورتِ دیوار سا ہنوز

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھے تھے سُرخ و زرد
پھُول چمن کے کس کے منہ سے ایسی خجلت رکھتے تھے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو چمن کو یُمن قدم نے ترے نہال کیا

سودا کا شعر ہے ؎

یاد آئے تری زلف جو مجھ کو تو چمن میں
دے تاب مرے دل کو نہ سنبل کی اشارت

سودا نے محبوب کی آمد کا نقشہ ایک جگہ اس طرح کھینچا ہے ؎

باغ میں جب سے گیا تھا وہ خمار آلودہ گل ہیں خمیازے میں انگڑائی میں ہے تاک ہنوز

---

[1] حافظ بھی اپنے محبوب کے توسط سے گلشنِ فطرت کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

در خراماں سرو گلنارش کند میل چمن
سرو را از پا در اندازد دل گل بشکند

فرخندہ نوگل تو چمن را حیات دہ جعد بنفشۂ تو صبا را گرہ کشائے
مرغولِ سنبل از دم کوئے تو خوش نسیم زلفِ صبا نہ خاک جناب تو مشک سائے

(بقیہ بر ص ۶۱)

عبدالرسول نثار دہلوی کا شعر ملاحظہ ہو ؎

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن
منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن

مصحفی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کیا باغ میں آیا تھا صبا وہ اگری پوش — جواب تیغ مہکے ہے چمن عطر کی بو سے

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں — ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

کھول دیتا ہے تو جب جاکے چمن میں زلفیں — پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

غالب کے یہاں یہ مضمون طرح طرح سے ملتا ہے مثلاً اپنی وارفتگی اور حیرانی کو خارجی فطرت پر اس طرح طاری کرتے ہیں ؎

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح (نسخہ حمیدیہ)

گل اور صبح دونوں فطرت کے کس قدر لطیف مظہر ہیں۔ ان دونوں کی حیرانی اور طلسم میں کس قدر شعریت ہے۔ پھر ان کی حیرانی انہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ پورے چمن پر چھا جاتی ہے اور اُسے آئینہ خانہ بنا دیتی ہے۔ حیرانی کی مناسبت سے چمن کا آئینہ خانہ بن جانا شعری رمزیت کا کمال ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ
بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند (نسخہ حمیدیہ)

(بقیہ از صفحہ ۶۰) سلمان ساوجی کا شعر ہے ؎

شگوفہ بہر تماشائے عارض و رُخِ دوست — سر از دریچہ چوبیں شاخ بر می کرد

اگر آنکھ خونِ دل سے نا آشنا ہے اور دل جوشِ نگاہ سے بیگانہ ہے تو ہوسِ گل کی فسوں کا ذکر بے معنی ہے۔ یا یوں کہئے کہ تماشائے گل و گلشن اس وقت وجہ جواز رکھتے ہیں جب کہ آنکھ خونِ دل سے اور دل جوشِ نگاہ سے آشنا ہو۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ لالہ زار کا ہر ورق ورقِ انتخاب ہے۔ اس کی سیر اسی کو زیب دیتی ہے جو صاحب دل و نظر ہے۔ ہر کس و ناکس کا یہ منصب نہیں کہ گلشن کی سیر کی آرزو کرے ؎

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے (نسخہ حمیدیہ)

گلستان کی تمام زمزمہ سنجیوں کی توجیہ غالبؔ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ہیں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

شاعر کو اپنے اہلِ نظر اور چمن کے نظر فریب ہونے کا احساس ہے لیکن زندگی سے شکایت ہے کہ بہت کم ہے فرصتِ نظر جتنی ہونی چاہئے اتنی نہیں ؎

ہیں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

اس مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے ؎

آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

شاعر کے نزدیک گلوں کی برگ ریزی ایک طرح کی زر افشانی ہے جو محبوب کی گل اندامی باج کے طور پر چمن سے وصول کرتی ہے۔ حسن توجیہ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ؎

برگ ریزی ہائے گل ہے وضع زر افشاندگی
باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

گلشن میں محبوب کی بے حجابیوں کو عاشق پسند نہیں کرتا اور اپنے رشک

کو احساسِ حیا سے تعبیر کرتا ہے۔ نکہتِ گل سے عاشق کو شرم آنا عجیب و غریب نزاکتِ خیال پر دلالت کرتا ہے۔ معشوق کی بے حجابی سے پہلے نکہتِ گل کی بے حجابی پر وہ حرف گیر ہوتا تھا لیکن اب اُسے خاموش ہونا پڑا ؎

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں　　　آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کبھی محبوب کی سیرِ گلشن کی یہ توجیہہ کی جاتی ہے کہ وہ اس بہانے سے اپنے زخمیوں کو دیکھنا چاہتا ہے ؎

انھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
گئے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ایک جگہ محبوب کے لیئے بہشت شمائل کی پُرکیف ترکیب استعمال کی ہے اس کی آمد سے رہ گزر کی خاک بھی جلوۂ گل میں مبدّل ہو جاتی ہے۔ شعر ہے ؎

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　　کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

شاعر جب زندگی کو سمجھنے کے لیئے اپنے محبوب یا غیر خود کو مرکز حوالہ قرار دیتا ہے تو اس طرح نغمہ طراز ہوتا ہے ؎

فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے　　　چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
چمن چمن گل آئینہ در کنارِ ہوس　　　امید محو تماشائے گلستاں تجھ سے
اسدؔ! بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے　　　(نسخہ حمیدیہ)

اور جب اپنی ذات کے توسط سے کائنات کی بزمِ تماشا سمجھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ؎

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر　　　ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں　　　صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے (نسخہ حمیدیہ)

پھر اپنی ذات اور محبوب دونوں کی اہمیت اس شعر میں واضح کی ہے ؎

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے آئینہ داری اک دیدۂ حیراں مجھ سے

اسی غزل میں غالب نے ذاتِ باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ شعلۂ ایمان کی آتش افروزی تیرے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان کی اہمیت کسی طرح کم ہو جاتی ہے۔ زندگی کی رونق انسان ہی کی ذات سے وابستہ ہے اس لیئے کہ تمدن کا خالق وہی ہے ؎

آتش افروزی یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے (نسخہ حمیدیہ)

بعد میں اقبال نے اس تصور کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا اور کائنات کے نظام میں انسان کی اہمیت واضح کی۔ انسانی فضیلت کا مضمون اقبال کے کلام میں قدم قدم پر ملتا ہے لیکن اس تصور سے غالب بھی ناآشنا نہیں ہے۔ اس کے نزدیک انسان کا رتبہ دونوں عالم سے بلند ہے۔ اس کی قدر و قیمت اتنی زیادہ ہے کہ نہ تو نقد دینا اور نہ نسیۂ عقبیٰ کے بدلے اسے خریدا جا سکتا ہے۔ صرف انسان کی ہمتِ عالی اس قابل ہے کہ اس کی قیمت ادا کر سکے۔ اس کا شعر ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

غالب نے ایک پوری غزل ہوس گل کے اسرار و طلسم پر لکھی ہے۔ گل یہاں شاعر کے تخیل کا خارجی رمز ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل کے اس وسوسے پر کہ گل کا رنگ و بو قائم رہنے والا ہے، گل ہنس رہے ہیں۔

بلبل کی دیوانی حرکتوں پر گل کبھی ہنستے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں کہ جس چیز کا نام عشق ہے وہ اصل میں دماغ کا خلل ہے ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

گل والی غزل کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں ؎

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

گل کی خوشبو سے عاشق کی رقابت عجیب و غریب مضمون ہے۔ یہ رقابت اس لئے ہے کہ بہار نے یہ خوشبو محبوب کی خاطر پیدا کی اور اس کو محبوب سے قرب و اتصال نصیب ہوگا۔ چنانچہ گل کی ہر ادا ناگوار ہے اور دوسری وجہ اس شعر میں یہ بتائی ہے

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

محبوب کا حسنِ غیور اپنی مماثلت کو عار سمجھتا ہے اور اسے یہ بات پسند نہیں کہ مجھے کسی دوسرے کی ادا بھلی معلوم ہو۔ چنانچہ گل کی رنگینی اور اس کی ادائیں میری نظر میں خون معلوم ہوتی ہیں۔

اب محبوب کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے کر گلوں کے شگفتہ ہونے کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں ؎

تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

(لہ حاشیہ بر صفحہ ۶۶)

یعنی گل جو ایک دوسرے کے بعد چمن میں برابر کھلتے رہتے ہیں تو اصل میں یہ تیرے جلوے کا ذوق و مداد ہے جو انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ مقطع ہے ؎

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

یعنی مجھے اس سے ہم آغوشی کی آرزو ہے جس کے خیال کو گل نے اپنی جیب قبا کی زینت بنایا ہے۔ اس طرح میرا محبوب صرف میرا ہی محبوب نہیں ہے بلکہ کائنات کے لطیف ترین مظاہر بھی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ اس سے اپنی اور اپنے محبوب کی بڑائی ثابت کرنا مقصود ہے تاکہ عشق کسی طرح حسن سے ہیٹا نہ رہے۔

گلشن فطرت کا مشاہدہ ہمارے دوسرے شاعروں نے بھی اپنی اپنی بساط کے موافق کیا اور اس کے نظام عام میں اپنی اور کبھی اپنے محبوب کی اہمیت واضح کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ سوداؔ کے شعر ہیں ؎

جس جا کہ ذکر حسن ہو تیرا تو اس جگہ — لائق نہیں کہ کیجیے گفت و شنید گل
نسبت نہ عندلیب سے سوداؔ کو ڈھونڈ — بسمل یہ اُن کا ہے نری وہ شہید گل

ذوقؔ کا شعر ہے ؎

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوقؔ — اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ظفرؔ کہتے ہیں ؎

(حاشیہ از صفحہ ۶۵) یہی مضمون فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

روش باد بہاری بہ گمانم افگند
کایں گل و غنچہ پئے قافلہ بوئے تو بود (غالبؔ)

نہ ہوس سیرِ چمن کی نہ گل تر کی ہوا   سرِ عاشق میں ہے اس سرو سمن بر کی ہوا

بعض اور دوسرے شاعروں کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تجلی علی شاہ دکنی :۔

دامن کا عکس کس کے پڑا ہے کہ آج تک   پھیلا رہا ہے سرو لب جو سے بار ہاتھ

زکی دہلوی :۔

اے عندلیب تجھ کو ہے راحت چمن ہی کیا   اس رشکِ گل کا جلوہ ہے سرو و سمن ہی کیا

زکی دہلوی :۔

کھولے ہوئے رہتے ہیں گل و یاسمن آغوش   بنتا ہے غرضِ شوق میں تیرے چمن آغوش

شعلہ دہلوی :۔

گل نیا کھلتا ہے او تفرقہ اندازِ چمن   چھڑ گئی بلبل و گل میں ترے رخسار کی بات

برق لکھنوی :۔

بہر گلگشت جو اس گل کی سواری آئی   گل کھلے، غل یہ ہوا بادِ بہاری آئی

جلال لکھنوی :۔

دکھا دیتا جو نرگس رکھتی ہوتی آنکھ میری سی   چمن ہے اک نمونہ یار کی رنگیں ادائی کا

اسیر لکھنوی :۔

رونقِ محفل جو وہ رندِ شرابی ہو گیا   پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

داغ :۔

بہار گل کیا ہے اس کو پھونکو چمن ہی چل کر یہ سیر دیکھو
کہ شمع رخسار پر تمہارے جلے گی بلبل پتنگ ہو کر

داغ :۔

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھمے گیا   اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

اشرف لکھنوی :—

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ — چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا

رند :—

گل ہیں پژمردہ تو غنچہ بھی گرفتہ دل ہے — جاتے ہی یار کے رونق گئی گلزاروں کی

امیر مینائی :—

اس روش سے وہ چلے گلشن میں — بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

امیر مینائی :—

چھپائے منہ اگر وہ یوسفِ گل پیرہن دو دن — چمن کا منہ نہ دیکھے کاروانِ رنگ و بو برسوں

صفیر بلگرامی :—

تو نے گلگشت جو موقوف کیا اے گل تر — پھول مرجھائے چلے آتے ہیں گلزاروں سے

ثاقب لکھنوی :—

تیرے ہوتے گل و گلشن کو میں دیکھوں توبہ — ابھی ایسی تو نہیں قوتِ تسخیر بہار

مست بنارسی :—

گلوں کو دیکھ کے سودائے زلفِ یار ہوا — بہار آئی تو سر پر جنوں سوار ہوا

جلیل :—

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے — کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

جلیل :—

خاکِ چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ — ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

آج ہے وہ بہار کا موسم — پھول توڑوں تو ہاتھ جام آئے

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیم صبح — کچھ اٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خواب ناز میں

موسم گل میں حسینوں کا مرقع ہے چمن — جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

اشرف:۔

چمن میں ہر طرف بوئے محبت مجھ کو آتی ہے ۔۔۔ گلوں پر پڑ گیا شاید پسینہ روئے جاناں کا

حسرت:۔

رنگینیٔ سرشک محبت کے حسن سے ۔۔۔ داماں عاشقاں ہے گلستانِ عاشقاں

ترے رشیٔ دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا ۔۔۔ کہ چشمِ شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے

چمن میں باد بہاری بھی گل کی آنکھوں سے ۔۔۔ چلی کہ دیکھے تماشا تری سواری کا

غالب کے یہاں گلشن فطرت کی رنگا رنگی کے مشاہدے کے ساتھ ایک اور نیا خیال ملتا ہے جو اقبال سے پہلے شاید غالب ہی نے بیان کیا ہے۔ غالب نے بھی فطرت کا مشاہدہ اپنے اندرونی احوال اور محرکوں کے حوالے سے کیا۔ اس نے صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ خارجی فطرت کا مصرف تسخیر و تصرف کو ٹھہرایا تا کہ وہ انسانی خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ اس نے تماشائے گلشن کے ساتھ تمنائے چیدن کی کسک محسوس کی۔ انسانی خواہشوں سے مظاہر فطرت کا جب ربط قائم ہو جاتا ہے تو ان کے مہمل انبار میں ترتیب و معنی پیدا ہوتے ہیں۔ غالب کے نزدیک گلشن کی بہار خود تمنائے چیدن کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جائز ہے اور اگر کوئی اسے ناجائز کہے تو غلط۔ غالب بہار گلشن کے پیدا کرنے والے کو اس طرح خطاب کرتا ہے ؎

تماشائے گلشن تمنائے چیدن ۔۔۔ بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

غالب کے اس شعر میں اقبال کے تصورات کی حرکت اور قوت نہایت لطیف انداز میں نظر آتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ حکیمانہ موضوع شعریت کو مجروح کرتے ہیں۔ اس شعر میں نغمے کے ساتھ حکمت کو بڑی خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ غالب کے انتخاب میں یہ شعر چھوٹ گیا۔ اس غزل

کے دو اور شعر نہایت بلند ہیں۔ کہتے ہیں ؎

نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں　　نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ! شکوۂ کفر و دعا نا سپاسی　　ہجومِ تمنّا سے لاچار ہیں ہم

آپ نے مندرجہ صدر مثالوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ کس طرح تخیل کی گلکاری سے غزل گو شاعر کی درون بینی انسانی جذبات کے طلسم کو فطرت پر طاری کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کائنات مدرکہ میں اس کو بس وہی نظر آتا ہے جس کو اس کا اندرونی احساس دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ جذبہ ہمارے شعور کو طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں خود اس میں اور شعور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یا یوں کہئے کہ جذبہ شعور کا طلسمی عالم ہے جس کے تحقق کے لئے اس کو اپنی انتہائی گہرائیوں میں غرق ہونا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ تخیل کی مدد سے ہوتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جذبہ تخیل کو ابھارتا ہے یا تخیل جذبہ کو ابھارتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان میں زمانی تقدم و تاخر نہیں ہوتا۔ تخیل اور جذبہ دونوں مظہر الوہیت ہیں اور اس لئے تقدس کے حامل۔ یہ زندہ اور موثر حقائق ہیں جو خارجی کائنات کے حوادث کو اپنی گرفت میں لینے اور ان پر اپنا رنگ طاری کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ انہی کے اشارۂ چشم و ابرو پر انسانی دنیا کی ساری حرکت اور رقص بنی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا کیف و سرور دل زندہ ہی کا رہینِ منت ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

کنایہ

تخیل و جذبہ کی آمیزش اور ہم آہنگی اپنے تخلیقی جوش میں ان اسرار کو ہم پر

منکشف کر دیتی ہے جن تک پہنچنے کے لئے تعقل کے پر جلتے ہیں۔ اُن کے باد پا پر سوار ہو کر انسان ابدیت کی وادیوں کی سیر کرتا ہے۔ وہاں اسے جو طلسم اور تماشے نظر آتے ہیں، انہیں رمز و ایما ہی کے ذریعے بیان کرنا ممکن ہے۔ دراصل غزل کی ریزہ کاری کی بھی یہی وجہ ہے کہ رمز و کنایہ کو منطقی تسلسل بیان کی حاجت نہیں ہوتی چنانچہ جہاں بھی شدتِ احساس کی کارفرمائی ہو گی وہاں کلام میں عدم تسلسل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ سامع کے تخیل کا فرض ہے کہ وہ عبارت کے خلا کو اپنی ذہنی کاوش سے پُر کرے۔ دنیا کی اکثر الہامی کتابوں میں آپ یہی خصوصیت پائیں گے۔ منطقی تسلسل خارجی واقعات اور حقائق کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے۔ منطق عقل کی زبان ہے۔ تخلیقی وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہے جو منطقی استدلال و تسلسل سے بے نیاز ہے اور اسی وجہ سے اس کے جذب و تاثیر کی کوئی انتہا نہیں۔

یہ درست ہے کہ جذبے کا رمزی بیان صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں اعلیٰ پائے کی نظم میں بھی یہ ممکن ہے لیکن شاذ و نادر۔ نظم میں عمرانی اور فطری حقائق کے علاوہ اندرونی کیفیات بیان کی جا سکتی ہیں اور خاص حالات میں سامع کے دل میں انبساط و انقباض اور جوش و نفرت و محبت کے جذبات برانگیختہ کئے جا سکتے ہیں لیکن نظم کی ٹیکنک کا اقتضا یہ ہے کہ مطالب واضح طور پر اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ ابہام اور اجمال نظم کے لئے سازگار نہیں اور غزل کی یہی دونوں چیزیں جان ہیں۔ رمز و کنایہ میں اگر تفصیل آ گئی تو بے مزہ ہو جائیں گے۔ پھر اس کے علاوہ چونکہ غزل میں عشق و عاشقی کی وارداتوں کو بیان کیا جاتا ہے جو نہایت گہری اور پُر اسرار ہوتی ہیں اور تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے رمز و کنایہ کے بغیر چارہ نہیں۔ قلبی وارداتیں ہمیشہ ابہام اور اجمال کی مقتضی ہوتی ہیں۔ شرح درد اشتیاق اور ذکر جمال اجمال چاہتا ہے، کنایہ چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات کہی جائے

مبہم طور پر کہی جائے۔ دل کو کنایہ اور اجمال پسند ہے اور دماغ کو تشریح و وضاحت استعارہ اور رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے شاعر کے محدود مشاہدے میں بے پایانی پیدا ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہیئے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے جن سے تحت شعور کی بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور تازہ ہوتی رہیں غالب نے اپنے کلام کی جہاں خصوصیتیں بتائی ہیں، ان میں اجمال و ابہام اور کنایہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ انہی پر تاثیر کا دارومدار ہے۔ ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی نظر ادب کے متعلق کتنی گہری اور وسیع تھی۔ وہ کہتا ہے ؎

فکر میری گہر اندوز اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل

یہ اشعار اگرچہ ایک قصیدے میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں تغزل کی روح بیان کر دی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کے قصیدے میں بھی غزل کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ اس کے قصائد دوسروں کے قصیدوں کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن میں استعاروں اور رمز و ایما کی جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔

رمز و ایما کی اہمیت کے متعلق غالب کے کلام میں اور بھی اشارے ملتے ہیں۔ وہ لیلائے سخن کو محمل نشین راز ہی رکھنا چاہتا ہے ؎

شوخیٔ اظہار کو جز وحشتِ مجنون اسد
بسکہ لیلائے سخن محمل نشینِ راز ہے (نسخہ حمیدیہ)

سخن عشق کی سوختہ نفسی اس کے دل کی اندرونی بہار کی آئینہ دار ہے جسے

وہ رمز چمن ایمائی کی خوشنما ترکیب سے ظاہر کرتا ہے۔ غالب کی اس ترکیب میں روحِ تغزل کی مکمل جلوہ گری نظر آتی ہے۔ شعر ہے ؎

بارغ خاموشی دل سے سخنِ عشق اسد   نفسِ سوختہ رمز چمن ایمائی ہے

غالب کو اس کا احساس تھا کہ عقل و شعور چاہے کتنی کوشش کریں۔ وہ اس کی گفتگو کے رمز کو نہیں پہنچ سکتے ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یہ یقینی ہے کہ غزل گو شاعر اپنے کلام میں جو لفظ برتتا ہے۔ ان سے ظاہری معنوں کے علاوہ بھی اور کچھ مقصود ہوتا ہے۔ لفظوں کو وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ بظاہر جتنا وہ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ حقیقت میں کہہ جاتا ہے۔ غالب کے شعر ہیں ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

فارسی میں اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد   محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نزود

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

فرقیست نہ اندک ز دلم تا بدلِ تو   معذوری اگر حرف مرا زود نیابی

غزل گو شاعر رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے لفظوں میں وہ تاثیر اور رچاؤ پیدا کرنا چاہتا ہے جو موسیقی میں بولوں سے پیدا کی جاتی ہے جو صوتی رموز میں وہ چیز وں

کے نام نہیں لیتا اور نہ واقعات کو مفصل بیان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتا ہے۔ غزل گو شاعر کے اشاروں اور رمزی علامتوں میں تاکیدی اثبات سے کہیں زیادہ تاثیر اور بلاغت ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ تخیل اُن کی تخلیق کرتا ہے دردؔ کے اس شعر کی ایمائی کیفیت ملاحظہ ہو ؎

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

سوداؔ کے اس شعر کی ایمائی قوت کی کوئی حد نہیں ؎

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ　　ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ظفرؔ کا شعر ہے ؎

اے جنوں ہاتھ سے تیرے نہ رہا آخر کار
چاکِ دامان میں اور چاکِ گریباں میں فرق

غالبؔ اور مومنؔ کے یہاں رمز و کنایہ کو بڑی خوبی اور نزاکت سے برتا گیا ہے۔ ان کے لطفِ بیان پر ہماری زبان اور ادب جتنا ناز کریں بجا ہے غالبؔ کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی تھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی   پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال   دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

غالب کی غزلیں کنایوں سے بھری پڑی ہیں۔ پھر یہ کنائے محض کنائے نہیں بلکہ لطف شعری میں سموئے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ رمز و کنائے کی کیفیت میں رچا ہوا ہے۔ پورا دیوان دیکھ جایئے کوئی غزل ایسی نہیں ملے گی جو لطف سے خالی اور محض بیانیہ ہو۔ بیانیہ غزلیں بھی جن میں تسلسل ملتا ہے زیادہ تر استعارے کی زبان میں کہی گئی ہیں۔ ان غزلوں کا تسلسل رمز و کنایہ کا تسلسل ہے نہ کہ منطقی تسلسل۔ ان میں داخلی تجربے کی طلسمی رمزیت نے تفصیل اور خارجیت کو بڑی صفائی سے اپنے اندر چھپا لیا ہے اور بیان وجدان بن گیا ہے۔ اس کی بزمِ خیال کی زنگارنگی ملاحظہ فرمایئے یہاں صرف دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال   مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب   اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا   کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست   بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل   زنہار اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی　　　مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　　دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ　　　یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں　　　نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اس غزل میں جلوۂ یار کی نمود و نمائش اور جاں سپاری کے بازار کی گرماگرمی کا ذکر کرتے کرتے ایک دم سے ناز و انداز کی عدالت میں دل و مژگاں کے مقدمے کی کارروائی بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ غزل کا یہ پورا حصہ حسن و عشق کی کیفیتوں کا استعارہ ہے جن کا اظہار عدالتی اور دفتری اصطلاحوں میں کیا ہے۔ لفظی اور معنوی رعائتیں کنائے کے رنگ میں ہیں لیکن کہیں بھی حقیقت حال سے دامن نہیں بچایا گیا ؎

پھر کچھ اس دل کو بیقراری ہے　　　سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　　آمد فصل لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصد نگاہ نیاز　　　پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلال جنس رسوائی　　　دل خریدار ذوق خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی　　　وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر　　　محشرستان بے قراری ہے
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے　　　روز بازار جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ان دونوں غزلوں میں جو تسلسل ہے وہ رمز اور استعارے کا تسلسل ہے۔ اگرچہ ضمنی طور پر مضمون کا تسلسل بھی آگیا۔ غزل کی اصلی خوبی مضمون کا تسلسل نہیں۔ شاعر کو اختیار ہے کہ اگر اُسے باقی نہ رکھنا چاہے تو ہر شعر میں علیحدہ رمزی کیفیت پیش کرے۔ اس کے ہر شعر کو بجائے خود مکمل حیثیت حاصل ہوگی۔ اور وہ اندرونی تجربے کے ہر لمحے کی طرح کافی بالذات ہوگا۔ اس طرح غزل گو شاعر رمز میں کچھ چھپاتا ہے اور کنائے سے کچھ بتاتا ہے۔ لیکن اس طرح کہ اشاروں کو سمجھنے والے ہی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں غزلوں میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اندرونی کشمکش اور خلش میں مبتلا ہے جسے وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے لیکن کوئی اس کی زبان کو روک رہا ہے۔ یہ طرزِ بیان زمانے کی مصلحتوں کا اقتضا بھی ہے اور تغزل کے آداب کا حامل بھی۔

مومن خاں کے کلام میں بھی کنایہ اور استعارہ بالکنایہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور چونکہ وہ کنایہ کے ساتھ بہت کچھ مطالب اور ان کی منطقی کڑیاں حذف کر جاتے ہیں۔ اس لئے سامع کو ذرا ٹھٹک کر سوچنا پڑتا ہے کہ وہ

کیا کہہ گئے۔ ان کے کلام میں خاص کنائے کی مثالیں کثرت سے ہیں جیسی اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
دلربائی زلفِ جاناں کی نہیں — پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

پوچھنا حالِ یار ہے منظور — میں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا — تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

امتحاں کے لیے جفا کب تک — التفاتِ ستم نما کب تک

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

نہ جانے کیوں دل مرغ چمن کہ سیکھ گئی — بہارِ وضع ترے مسکرا کے آنے کی
خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا — امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقش قدم — کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغییر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

کنائے کے استعمال سے لفظوں میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن آجاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ بات صاف صاف نہیں کہی جاتی لیکن لفظ بغیر ذکر کے خود بخود بولتے ہیں اور اُن کی ایمائی قوت اُجاگر ہو جاتی ہے۔ معانی کی ایمائی رمزیت اُردو کے سب بڑے شاعروں کے کلام میں ملتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

میرؔ :۔

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم — حالِ خوش اس کے خستہ حالوں کا
لطف پر اُس کے ہم نشیں مت جا — کبھی ہم پر بھی مہربانی تھی
کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی

آتشؔ :۔

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

شیفتہؔ :۔

اتنی بھی بُری ہے بے قراری — اب آپ سے اُنس کم کرینگے

مجروحؔ :۔

کج ادائی پہ سب ہمیں تنگ تھی — اب زمانے کو انقلاب کہاں

ریاضؔ خیر آبادی :۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور　　نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

امیر مینائی :-----

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل　　اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

فانی :-----

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی　　چاکِ داماں بھی باندازۂ داماں نکلا

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو　　بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

حسرت :-----

بہت خجل ہے ترے در سے دعا میری　　یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری

اصغر :-----

زندانیوں کو آکے نہ چھیڑا کرے بہت　　جانِ بہار نرگسِ رسوا کہیں جسے

جگر :-----

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن　　اک مسیحا نفس کی بات گئی

ثاقب لکھنوی :-----

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا　　میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا

شعر کے مطالب کی بے پایانی

انسانی شعور اور تحت شعور میں بہت کچھ ہے جسے لفظوں کی صراحت سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اس کے کوئی خارجی معین خطوط نہیں ہوتے بلکہ ایک مبہم سا احساس ہوتا ہے۔ اس قسم کے شعوری یا تحت شعوری تاثر و احساس کو صرف رمز و ایما ہی کے ذریعہ سے بیان کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے جو مسرت یا

تاثر حاصل ہوتا ہے اس کی وہی نوعیت ہوتی ہے جو نغمہ و موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب ہے اور اسی میں اس کی پائداری اور قوت کا راز مخفی ہے لیکن شعر اور موسیقی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر لفظوں کا جامہ زیب تن کرتا ہے جن کے کچھ نہ کچھ معنی ہوتے ہیں اور وہ عمرانی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ذریعہ سے صرف ان تصوّروں کا اظہار ممکن ہے جن میں دوسرے شرکت کر سکیں ہر لفظ حقیقت میں ایک تصوّر ہے جو اپنے اندر بعض مخصوص تاریخی اور تمدّنی لوازمات پوشیدہ رکھتا ہے لیکن موسیقی لفظوں سے بے نیاز ہو کر خالص رمز و علامت سے جمالیاتی اثر آفرینی کرتی ہے۔

موسیقی اظہار کی خالص صورت ہے۔ لفظوں کی طرح وہ معانی اور تصوّرات کے بوجھوں سے بوجھل نہیں ہوتی۔ اس کے ذریعے ہمارے شعور پر حقیقت کا گہرا اثر مرتسم ہوتا ہے اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا شعور تخلیقی مسرّت سے ہم کنار ہو گیا لیکن لفظوں میں جذباتی محرکات کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ موسیقی اور لفظوں کے امتزاج سے تغزل کی تخلیق ہوتی ہے۔ شعر میں وزن اور بحر اور قافیہ اس کی ایمائی کوتاہی کو بڑی حد تک دُور کر دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر لفظ اپنی مکانی اور عمرانی نوعیت کے باوجود زبردست ایمائی قوت رکھتا ہے بشرطیکہ اسے ٹھیک طور پر استعمال کیا جائے۔ بعض بحریں ایسی پھڑکتی ہوئی اور قافئے بولتے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ بجائے خود شعر کے معنی سے زیادہ جاذبِ قلب و نظر ہوتے ہیں۔ سنتے ہی اُن سے احساس متاثر ہوتا ہے۔ بعد میں دماغ معنی پر غور کرتا ہے۔ معنی اور لفظ دونوں سے زیادہ اہم خود شعر ہے۔ جو اگرچہ بادی النظر میں لفظ اور معنی دونوں کے مجموعے سے عبارت ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں دونوں سے الگ اپنا آزاد طلسمی وجود رکھتا ہے۔ شعر صرف احساس و خیال کو منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے کچھ زیادہ

بھی ہے۔ وہ لوگ جو شعر کے مقصد کو سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں، انہیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ خود شعر کیا ہے۔ اس قسم کے نقاد اکثر و بیشتر شعر کی موسیقیت کو نہیں محسوس کرتے۔ تحلیل و تجزیہ شعر کی رُوح کو مجروح کر دیتا ہے شعر کے بنیادی تصوّر کی جب توجیہ کی جائے تو وہ نثر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کی شعریت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس نقطے پر پہنچ کر نقاد کا نقد و نظر سکوت سے بدل جاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا وہ کچھ بھی نہیں ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ شعری رمز کے آگے نطق و بیان سر بگریباں نظر آتے ہیں ہاں تاثر و احساس اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے اور اپنے دامن کو اس کے پھولوں سے بھر لیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غزل کے شعر کو صرف اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم میں سے ہر ایک کی انفرادیت الگ ہے۔ اسی طرح ہر ایک کے ذاتی تجربے علیحدہ ہیں۔ اس لئے شعر فہمی کے علیحدہ علیحدہ معیار ہمیشہ رہیں گے اور انفرادی احساس کی طرح شعر کی شعریت کا تعین بڑا دشوار رہے گا ممکن ہے دو شخص کم و بیش ایک قسم کے شعروں کو پسند کرتے ہوں لیکن اُن سے جو تاثر مترتب ہوتے ہیں وہ دونوں کے لئے مختلف ہوں۔

مثال کے طور پر غالبؔ کی ایک مشہور غزل لیجئے جس کا مطلع ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

پوری غزل میں جذبہ و آہنگ کا لطیف تسلسل ملتا ہے۔ شرح نویسوں نے غزل کے شعروں کا مطلب اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ غالبؔ کی فنی عظمت کا راز یہ ہے کہ اُسی کے اشعار کے مطلب میں ایک طرح کی بے پایانی پائی جاتی ہے

تخیل ان کی توجیہ الگ الگ انداز میں کرسکتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک شعر کی نسبت علامہ اقبال کی رائے خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے۔

علامہ اقبال کے ایک خط میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ نظام الدین اولیاء کی زیارت کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں :—

"شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مرزا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنج معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا ولایت نام تھا۔ اس ظالم نے مرزا کے مزار کے قریب بیٹھ کر۔ ع

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوح مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے، دل کو تڑپا جاتا ہے ۔"

(آج کل —— اکتوبر ۱۹۵۶ء)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا شعر سُن کر علامہ اقبال کیوں اس قدر بے تاب ہو گئے؟ اس کا جواب سوائے اس کے ممکن نہیں کہ اُن کے قوی اور بلند تخیل نے اس کی توجیہ اپنے خاص انداز میں کی جو دوسروں کے انداز سے مختلف تھا۔ اس شعر نے اُن کے جذبات کے تاروں کو چھیڑا اور اُن کے تخیل کے سامنے اسلامی دنیا اور خاص طور پر اسلامی ہند کے زوال کا نقشہ اپنی ساری حیرت ناکیوں کے ساتھ آگیا ہوگا جب بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ماضی کی یاد بن گئی ہوں تو خوابِ سحر میں لذت کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ جب لذتِ خواب سے محروم ہیں تو پھر کیوں نہ اٹھ بیٹھیں! "اٹھے بس اب" کا ٹکڑا خود علامہ مرحوم کے پیغام کی غمازی کرتا ہے۔

سارے شرح نویسوں کی شرح دیکھ جائیے، کسی نے بھی اس انداز میں اس کی توجیہ نہیں کی جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اس قسم کی توجیہ بجائے خود تخلیقی نوعیت رکھتی ہے اور اس سے اعلیٰ درجے کے شعر کے مطلب کی بے پایانی ظاہر ہوتی ہے۔

غزل کا موضوع عشقِ مجازی ہے

ہر عہد کی تنقید میں شعر سے مختلف مطالبے کیے جائیں گے اور مطالبہ کرنے والے اپنی اپنی جگہ حق بجانب ہوں گے۔ کسی زمانے میں بھی کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا کہ شعر کو ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہ ہونا چاہیے صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہر زمانے میں غزل کے شعر سے جو مطالبہ کیا جائے گا اس میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر ملیں گی۔ مثلاً یہ کہ وہ موسیقی میں رچا ہوا ہو۔ ہمارے جذبے اور شعور میں نزاکت پیدا کرے اور زندگی کے واقعات اور تجربوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں اس انداز سے پیش کرے کہ ہم باطنی طور پر انہیں پہلے سے بہتر محسوس کر سکیں اور پہلے سے

بہتر سمجھنے لگیں۔ لفظ "زندگی" بہت وسیع اور جامع لفظ ہے۔ ہمیں ان حقائقِ حیات کا تعین کرنا پڑے گا جو غنائی شاعری یا غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔ پن چکی اور ریل گاڑی نظم کا موضوع ہو سکتے ہیں لیکن غزل کا موضوع نہیں بن سکتے۔ حسن و عشق کی داستان کے علاوہ جو سوز و ساز زندگی سے عبارت ہے اور جو کبھی فرسودہ نہ ہوگی۔ حکمت و اخلاق اور تصوّف کے نکات بھی غزل کا موضوع رہے ہیں لیکن انہیں محض گوارا کیا گیا ہے۔ اس کا اصل موضوع ہمیشہ عشقِ مجازی ہی رہا۔ غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ زندگی نام ہے علائق کا۔ جہاں تعلق ہوگا وہاں جذبہ ہوگا اور جہاں جذبہ ہوگا وہاں کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہوگا۔ جس طرح فطرت کے مظاہر اور ان کی قوتیں علائق کی زنجیروں میں بندھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح زندگی بھی تعلقات کی سنہری ڈوریوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ تعلق فطری بھی ہیں اور معاشری بھی بقول جگرؔ

رہائی ہو نہیں سکتی کبھی قیدِ تعلق سے

جو اک زنجیر ٹوٹی دوسری زنجیر دیکھیں گے

غزل گو شاعر کی رمز آفرینیاں اور استعارے خیالی زندگی کے طلسمی علائق کی تصویریں ہیں۔ ممکن ہے بظاہر معلوم ہو کہ یہ تصویریں خارجی حقیقت کی ہو بہو نقل نہیں لیکن نقل تو شاعر کے پیشِ نظر کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اشیاء اور حقائق کو ویسا نہیں دیکھتا جیسے کہ وہ ہیں یا بظاہر نظر آتے ہیں۔ وہ حیات اور کائنات کے مظہروں کو اپنے جذبے کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ ان کی کیا شکل نکلی۔ وہ اپنے جذب دروں سے زندگی کی تصویر میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ جبھی تو وہ جاذبِ نظر بنتی ہے۔ جذب دروں کی شدت سے اس کی باتوں میں مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بغیر اس کے شعریت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ نہ صرف شعر بلکہ کسی قسم کے ادب کی تخلیق اس کے بغیر ممکن نہیں۔

غزل گو شاعر کی دروں بینی اور تخیل نگاری کا مقصد حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایمائی انداز سے بیان کرنا ہے۔ اس داستان کا وہ خود ہیرو ہوتا ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا ہر شعر اس کے دل کا ایک قطرۂ خون ہو اور اس کے اندرونی تجربے کے کسی ایک لمحے کا اس میں مکمل اظہار پایا جاتا ہو۔ عشق جذباتِ انسانی کا سرتاج ہے۔ وہ فطرت کی طرح لامحدود ہے۔ عالم کی رونق اور ہما ہمی اسی کی کرشمہ ائیوں کی رہین منت ہے۔ زیست کا مزا بغیر عشق کے ممکن نہیں۔ یہ درد کی دوا بھی ہے اور خود ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ بقول غالبؔ ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

دوسری جگہ غالبؔ نے عشق کو اس آگ سے تشبیہ دی ہے جس کا نہ تو لگنا ہی قابو میں ہے اور نہ بجھنا ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فسانۂ محبت اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی زندگی۔ اس دلپذیر افسانے کے جتنے ٹکڑے جسے یاد ہیں وہ انہیں سنائے بغیر نہیں رہتا۔ جگرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ غزل لکھنے والے شاعروں کا عشق کا دعویٰ مصنوعی اور ان کا محبت کا معیار عامیانہ اور پست ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ جب وہ حسن و جمال کا ذکر کرتے ہیں تو بالعموم اُن کی مراد مجاز ہوتی ہے۔ سوائے چند صوفیانہ رجحان رکھنے والوں کے جو اس سے حقیقت مراد لیتے ہیں۔ سوائے خواجہ میر درد، نیاز بریلوی، اصغر گونڈوی اور چند دوسرے

شاعروں کے غزل نگاری میں مجازی عشق ہی کو کمال بینی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور جنسی محبّت کی وارداتوں اور معاملوں کو لطف بیان میں سمو کر دل پذیر بنایا گیا ہے پھر اس وادی کا کوئی نشیب و فراز ایسا نہیں جو ہمارے غزل گو شاعروں کی نظر سے بچ گیا ہو۔ اُن کو محبّت کی دنیا کے حقائق پسند ہیں۔ اُن کے علاوہ خارجی عالم کے حقائق اُن کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس واسطے وہ ان کی طرف اگر کبھی نظر اٹھاتے ہیں تو نظر پلٹ آتی ہے اور پھر وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتے ہیں۔ اُن کے ذہن و فکر پر عشق کا جذبہ ایسا طاری رہتا ہے کہ وہ اس کی بصیرت سے دنیا کو دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ حقیقت کی دنیا ہو یا مجاز کی۔

بقول ولیؔ ؎

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

بعض غزل گو شاعروں کے ہاں شاہد بازی اور کامجوئی کے اشارے بھی ملتے ہیں لیکن بالعموم بوالہوسی اور محبت میں امتیاز کیا گیا ہے۔

میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

غالبؔ کا شعر ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

میرؔ صاحب نے عشقِ بتاں کے شعری رمز کو ایک جگہ صاف طور پر واضح کر دیا ہے ؎

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

عشق کے جذبات کی پاک بازی اسی طرح شعر کا لازمہ ہے جس طرح حسن

کی معصومیت کا تصور، عشقیہ واردات اور اپنی رندمشربی کے لئے غزل گو شاعر جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ بطور علامات و رموز کے ہیں جن کے ذریعہ اَن کہی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں اور اس سلیقے سے کہی جاتی ہیں کہ کیا کہنا۔ اس باب میں ہمارے شاعروں نے رمز نگاری کا جو کمال دکھایا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کی مثال دوسری زبانوں کے ادب میں ملنی دشوار ہے۔ رمز و کنایہ کی ایمائی قوت اور تشبیہ و استعارے کی بدولت کلام کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے اور لطائف و معانی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ سامع پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ مجاز و حقیقت میں جس طرح چاہے اپنی توجیہ کے رُخ کو پھیر دے۔ پھر مجاز مجاز میں بھی فرق ہے۔ جنسی جذبے کی کمال بینی کے انداز ہر زمانے میں بدلتے رہیں گے اور غزل کے شعر کی توجیہ بھی بدلتی رہے گی۔

میر تقی میرؔ کے اس شعر کو آپ حقیقت اور مجاز دونوں طرح سے سمجھ سکتے ہیں اور دونوں طریقے پر اس کے معنی کے لطف میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ عام طور پر میر صاحب مجاز ہی سے گفتگو کرتے ہیں اور اُن کا عشق خالص انسانی عشق ہونے کے علاوہ کوئی اور دعویٰ نہیں کرتا۔ شعر ہے ؎

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

یا مثلاً غالبؔ کا یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر حاوی ہے ؎

غالبؔ مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل

غزل میں دیدہ و دانستہ محبوب کے جنس کو ظاہر نہیں کرتے۔ اس لئے کہ رمز و ایماء کا یہی اقتضا ہے۔ جب کبھی اس کا ذکر آتا ہے تو مذکر صفات و افعال استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بات غیر فطری ہے لیکن جو شخص رُوحِ غزل

کا رازداں ہے۔ اس کے نزدیک اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزل کی رمزنگاری کا بھی اقتضا ہونا چاہیئے تھا کہ جس طرح حقیقت ومجاز کے فرق وامتیاز کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ ذوق خود اس کا فیصلہ کرے۔ اسی طرح معشوق کے جنس کو بھی ابہام کے نقاب میں لپیٹ دیا۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہمارے شاعر کو صنفی کشش کی اہمیت اور شدت سے انکار ہے اور اس کے حقیقی پہلو کو وہ دیکھنے سے کتراتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ خلوت اور پردے کی بات کو صاف نہیں کہنا چاہتا۔ اس باب میں صدیوں کی شائستگی اور تہذیب اس کی رہبری کرتی ہے محبت کرنے والا محبوب کو اپنی شیفتگی کی وجہ بھی نہیں بتاتا کہ کہیں اس کے دل کی بات زیادہ کھل نہ جائے۔ وہ کنائے اور اشارے سے بار بار اعادہ ضرور کرتا ہے جس میں زبان اور جذبے کے سارے لوچ موجود ہوتے ہیں۔ محبوب کی یاد جب اس کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے تو تجاہل عارفانہ سے وہ اُس کو "بے نام سی اک یاد" کہہ کر ٹال جاتا ہے اور اپنے دل کی بے تابیوں کا سبب جانتے ہوئے بھی اس کو ظاہر نہیں کرتا۔ غزل نے محبت کے ان آداب کا پوری طرح احترام کیا ہے۔ جگر نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانئے کس کی

بے وجہ تب وتاب ہے معلوم نہیں کیوں

اس ابہام کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مشرقی آداب اُسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ محبوب کی نسوانیت کو بے پردہ کیا جائے اور دوسرے غزل کی ٹیکنک رمز وکنایہ کو تفصیل اور تشریح پر مقدم قرار دیتی ہے۔ پھر چونکہ اُردو غزل نے اپنی خوشہ چینی فارسی غزل سے کی تھی جس میں محبوب کی جنس کو مذکر ظاہر کیا جاتا تھا اس لئے اُردو میں بھی یہی طریقہ مستعمل ہو گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تہذیب ومعاشرت

ایرانی تہذیب و معاشرت سے اتنی مشابہ تھی کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ اگرچہ بعض جگہ غزلوں میں محبوب کی نسوانیت ظاہر ہو گئی ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہے۔ جہاں نسوانیت ظاہر کی گئی ہے وہاں بھی ایک خاص سلیقہ پیش نظر رہا ہے۔ نسوانیت کا جہاں اظہار ہو گیا ہے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

جس دن کہ اس کے منہ سے برقع اٹھے گا سنیو
اس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے ۔۔۔ اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے ۔۔۔ میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

مصحفیؔ کا شعر ہے ؎

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر ۔۔۔ شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

غالبؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی ۔۔۔ آپ کا شیوۂ انداز و ادا اور سہی

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۔۔۔ پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس ۔۔۔ زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۔۔۔ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

چاہیے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو   زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

شیفتہ کا شعر ہے ؎

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں   جلوے نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں

مومن خاں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا   سائے سے مرے وحشت اے رشکِ پری اتنی

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں   تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

جلال لکھنوی کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیوانہ کیا ناز سے اک زلفِ کجی نے   اتنا تو کیا عشق کی وحشت اثری نے
اٹھتی ہی نہیں شرم سے اپنی نگہ شوق   محجوب کیا ہے یہ تری پردہ دری نے

رند کا شعر ہے ؎

کرے گا عشق تصرف تو دیکھنا وہ پری   پیادہ گھر سے کھلے سر برہنہ پا آئی

امیر مینائی کا شعر ہے ؎

گلے میں ہاتھ تھے شب اس پری سے راہیں تھیں   سحر ہوئی تو وہ آنکھیں نہ وہ نگاہیں تھیں

حسرت کا شعر ہے ؎

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

ایسی مثالوں سے تو دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ جن میں معشوق کے لئے مذکر صفات و افعال لائے گئے ہیں تاکہ اس کی پردہ دری نہ ہو۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ میر صاحب کے شعر ہیں ؎

یار عجب طرح نگہ کر گیا دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا کھب گئی جی میں تری بانکی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہے سنتے ہو میرے بدزباں کی ادا

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا
دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں سیلی لگی صبا کی تو منہ لال ہو گیا

دوسرے شاعروں کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

جرأت :—

احوال کہے بن نہیں بنتی ہے کسی طرح اور کہئے تو ہوتا ہے وہ بیزار کریں گے

مومن :—

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

غالب :—

بجلی سی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

داغ :—

ہمارے پاس جو بیٹھے تو کسمسا کے اٹھے چڑھا کے آنکھ وہ اپنا بدن چرا کے اٹھے

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

نظام رامپوری :—

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

جلالؔ :—

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے حجاب
حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا

حسرت :—

بنے وہ رونق محفل جس انجمن میں رہے
رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں رہے

اسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جس پہ اُنکی نظر
اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نگاہ یار سے اظہار التفات ہوا
تو حال دل نے کہا "گنہگار ہم بھی ہیں"

ناگوارا ہے بہت تلخی ہجراں لیکن
تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترک وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

لطف یہ ہے کہ بعض خواتین صاحب دیوان گذری ہیں۔ وہ بھی اپنے لئے صفات و افعال مذکر استعمال کرتی ہیں اور اس طرح آداب غزل کی پوری پابندی کی جاتی ہے — بدر النساء بیگم (عرف خالہ بیگم)، نواب بیگم حجاب، ضیائی بیگم شاگرد آتش، نواب شاہجہاں بیگم شیریں والیۂ ریاست بھوپال اور شمس النساء بیگم شرم لکھنوی کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

رمز و ایما کی کیفیت کو اور بڑھانے کے لئے غزل گو شاعر محبوب کے لئے عام طور پر ایسے لفظ بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں جن سے جنس ظاہر نہ ہو۔ جیسے بُت، صنم، نازنین، شوخ، گلرو، گل، جاناں، دلدار، دلربا، دلبر، ظالم، تغافل شعار،

خانہ خراب، تند خو، جفا جو، بے وفا، وغیرہ۔ یہ لفظ بغیر اسم اشارہ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور اُن سے مراد محبوب ہوتا ہے۔ ان استعاروں سے انتقال ذہنی اور تلازم تصورات کی وجہ سے دوہری حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے ایک خود محبوب کی ذات اور دوسرے اُس کے وہ اوصاف جن پر جذبے اور تخیل نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہو۔ اس طرح استعارہ ایک طرح سے کنائے اور مقابلے کا کام بھی کرتا ہے جس سے رمزی اثر میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ سب محض اس لئے کئے جاتے ہیں کہ خیال کی باریکیاں اور نزاکتیں مبہم لیکن مؤثر طور پر ظاہر ہوں. جذبے کا یہی انداز پسند ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

حسرت :-

بیاں ہو چکی ہم سے اس گل کی خوبی — سر و برگ رنگیں نگاری کہاں تک

درد :-

بسان کاغذِ آتش زدہ مرے گل رو — ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں

تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
کون دل ہے کہ جس میں خانہ خراب — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا — میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

میر :-

میلان دل رہا ہو کیونکر وفا کے اوپر — دیتا ہے جان عالم اس کی جفا کے اوپر

برقعے کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو — کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے

آج اس راہ دل ربا گزرا		جی پہ کیا جانئے کہ کیا گزرا

قائم :—

دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ		دل دیا تجھ کو تو کچھ میں نے گنہ گاری نہ کی

غالب :—

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

حسرت :—

کیوں نہ ہو دلبروں کو شوقِ ستم		اہلِ دل کو ہے بے کسی کی ہوس

مومن :—

ظالم کہیں روا نہیں عاشق سے احتراز		کہہ دے اگر ہو رشکِ سخن داد خواہ میں

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی		ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

کھل گیا عشقِ صنم طرزِ سخن سے مومن		اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی		خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی

داغ :—

کسی طرح جو نہ اس بُت نے اعتبار کیا		مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

کیا صبا کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے		مجھ کو اپنے دلِ گم گشتہ کی بُو آتی ہے

حیرت الہ آبادی :—

چلتے ہیں عجب چال قیامت کی یہ گُرو		پامال کئے دیتے ہیں ہستی کے چمن کو

حسرت :—

اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں مقام		گلنار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

اس جفا جو سے یہ ایمائے تمنا اب تک ہوس لطف و عنایات چلی جاتی ہے

جلیل :۔

وعدۂ رہا نہ یاد تغافل شعار کو کیا اب جواب دوں نگہ انتظار کو

ہے تیری جوانی کہ پھٹی پڑتی ہے ظالم پر کوئی سنبھالے دل بیتاب کہاں تک

غالب نے سخن محبوب کو بلائے جان بتایا اور اس کی گہری شاعرانہ نظر نے اس کو تین اجزا میں تقسیم بھی کر دیا۔ عبارت، اشارت اور ادا ؎

بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا[1]

یہی تینوں اجزا تغزل کے اصلی عناصر ہیں۔ غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر۔ انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا۔ اوّل الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جو نثر نے اپنے ذمے لے لیا۔ شعر کا اور خاص طور پر غزل کے شعر کا سرمایہ اثر و تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسنِ ادا کے رنگ سے تخیل اور جذبے کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔ ان رنگوں کی

---

[1] اگرچہ اس جگہ شاعر نے ادا سے ناز و ادا مراد لیا ہے لیکن ادا حسن اظہار کے لئے وسیع معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ حسن اظہار مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ زبان و بیان کے ضمن میں حسن ادا اسلوب اور طرز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ غالب نے ایک دوسری جگہ لفظ ادا کو اظہار ہی کے معنوں میں برتا ہے ؎

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغ دل بیدرد نگاہِ حیا ہے

کو محبوب کی گفتگو میں محسوس کیا اور حسرتؔ نے دوست کے تامرّ زنگیں ہیں لیکن حقیقت میں بات دونوں نے ایک ہی کہی ہے۔ ادائیں جب تک جدّت نہ ہو وہ ادا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک ہی ادا بار بار دہرائی جائے تو وہ لازمی طور پہ بے مزا، بے کیف اور بے اثر ہو جائے گی۔ جدّت ہی حسن ادا کی ضمانت ہے۔ غرضکہ مرزا غالبؔ اور حسرتؔ نے سخن محبوب کا جو تجزیہ کیا ہے وہ غزل کی خارجی اور معنوی خوبیوں پر حاوی ہے۔ اور اس کے محاسن کا معیار کہا جا سکتا ہے۔ جب کہ محبوب کی باتوں میں عبارت، اشارات اور حسن ادا کی کارفرمائی ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ عشاق کی گفتگو ان شعری عناصر سے خالی رہے۔ غزل محض شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ اس پر وہی اصول عائد ہونے چاہئیں جن کی جھلک غالبؔ اور حسرتؔ جیسی حساس طبائع رکھنے والوں نے محبوب کے کلام میں دیکھ لی۔ بقول شیکسپیئر شاعر، عاشق اور دیوانہ ہم کیف ہستیاں ہیں جنہیں تخیل نے ایک ہی سانچہ میں ڈھالا ہے۔ اُن میں بہت سی باتیں قدرِ مشترک کے طور پر ملتی ہیں۔ چنانچہ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اُن کے معیارِ حسن و قبح میں بہت کچھ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ عاشق کی گفتگو بہت کچھ محبوب کی گفتگو کا انداز اور ڈھنگ اڑا لیتی ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۹۷) رمز و ایما و اشارات چلی جاتی ہے

چھیڑ کی ہم سے وہی بات چلی جاتی ہے

لیکن یہ چھیڑ چھاڑ بھی دو طرفہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر چاہیں تو اس شعر کو تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اس طرح بھی پڑھ سکتے ہیں ؎

رمز و ایما و اشارات چلی جاتی ہے   چھیڑ کی اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے

یوں پڑھنے میں بھی شعر کے لطف میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوتی اور تغزل کے اصلی عناصر جوں کے توں برقرار رہتے ہیں۔

خواجہ میر درد نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

دل بھی تیرے ہی رنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

حُسن اور عشق کا تعلق اور مقابلہ

دوسرے اساتذہ نے بھی حُسن اور عشق کے تعلق اور اُن کے رُتبے کو تمثیلی طور پر ظاہر کیا ہے۔ بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کے یہ دونوں حقائق ایک دوسرے کے مدِّ مقابل ہوں۔ اس اندازِ بیان میں تمثیل اور استعارے کی آمیزش سے ایک خاص لطف پیدا کیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

قائمؔ :-

بے دماغی سے نہ اُس تک دِل رنجور گیا　　مرتبہ عشق کا یاں حُسن سے بھی دُور گیا

محمد امان نثارؔ :-

ہم عشق میں تم حسن میں مشہور ہیں دونوں　　ہے ذکر ہمارا کہیں اذکار تمہارا

میر حسن دہلوی :-

عشق کا اب مرتبہ پہنچا مقابل حُسن کے　　بن گئے بُت ہم بھی آخر اُس صنم کی یاد میں

آتشؔ :-

حُسن سے رُتبہ ہے اپنے عشقِ کامل کا بلند　　آستانے پر پری ہے بام پر دیوانہ ہے

ہنرؔ لکھنوی :-

بجوابِ عشق میں میرا نہ حُسن میں تیرا　　میں انتخاب ہوں یکتا ہے تو زمانے میں

حسرتؔ نے ایک جگہ اپنے اس خوف کو ظاہر کیا ہے کہ کہیں غرورِ حُسن کی تاثیر میرے عشق کو بھی خود نما نہ بنا دے، شعر ہے ؎

غرورِ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرتؔ
کہیں ایسا نہ ہو یہ عشق کو بھی خود نما کر دے

جگرؔ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ترے حسنِ مغرور سے نسبتیں ہیں کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

دوسری جگہ کہا ہے ؎

عشق کا سحر کامیاب ہوا میں ترا تو مرا جواب ہوا

ایک جگہ اس طرح جذبِ عشق کی تاثیر کو ظاہر کیا ہے ؎

تاثیرِ عشق کا اللہ رے کمال آئینہ بن گئے تری اک اک ادا کے ہم

شمع کی بیباکی اور پروانے کی گستاخی کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حسن اور عشق کے مزاج میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے ؎

ملتا جلتا ہے مزاجِ حسن ہی سے رنگِ عشق
شمع گر بیباک ہے گستاخ پروانہ بھی ہے

عاشق اور معشوق کے اندازِ فکر اور کلام کی یکسانیت، اس لئے ضروری نہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ معاملاتِ شوق زبان و منطق سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس منزل میں بغیر زبان جانے ہوئے بھی سب مطالب ادا ہو سکتے ہیں۔ حافظؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

بکیست ترکی و تازی دریں معاملہ حافظؔ
حدیثِ عشق بیاں کن بہ ہر زباں کہ تو دانی

اسی مضمون کو حسرتؔ نے بھی ادا کیا ہے ؎

دل خوب سمجھتا ہے ترے حرفِ کرم کو ہر چند وہ اردو ہے نہ ترکی ہے نہ تازی

اور بعض اوقات تو زبان کے وسیلے کے بغیر بھی مطالب ادا ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ جگرؔ نے اشارہ کیا ہے ؎

اس نگاہِ ناز میں وہ ہلکی ہلکی جنبشیں
معنیٔ بے لفظ و شرحِ مختصر میرے لئے

حسن و عشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعران کے ذریعے سے رموزِ حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ حُسن سے بڑھ کر تخیل کو چھیڑنے اور اکسانے والی کوئی دوسری چیز نہیں۔ اسی لئے وہ غزل گو شاعر کو عزیز ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے میری رعنائی خیال کا انحصار محبوب کے تصورِ حُسن پر ہے ؎

تھی وہ اک شخص کے تصور سے　　　اب وہ رعنائی خیال کہاں

عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔ یہ ایک فطری کشش ہے جو دل میں ذوق اور کشش پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اسی کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے اور اس کی منزلیں اتنی ہی وسیع ہیں جتنی کہ کائنات کی حُسن کی قدر افزائی چراغ عشق کی روشنی ہی میں ممکن ہے بعض کے نزدیک عشق جو جذبے کی اندرونی حقیقت ہے حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ حُسن عشق کا محتاج ہے لیکن عشق حُسن سے بے نیاز ہے۔ اس انتہائی دروں بینی کو قائمؔ نے بڑے لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ شعر ہے ؎

بے دماغی سے نہ اس تک دلِ رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حُسن سے بھی دُور گیا

عشق اور حسن دونوں اپنی اپنی جگہ کائناتِ مدرکہ کے اہم مظاہر ہیں جنہیں ہمارے شاعروں نے برابر کا مرتبہ دیا ہے جس طرح عشق کی ہمکتی امنگوں کے بغیر حُسن کا وجود بے معنی ہے۔ اسی طرح بغیر حُسن کے مقصود و منتہا کا معیّن کرنا ممکن نہیں۔ اس مضمون پر حسرتؔ کے

متعدد شعر ملتے ہیں ؎

سچ پوچھئے تو حُسن سے کچھ کم نہیں ہے عشق
یہ جانِ عاشقاں ہے وہ جانانِ عاشقاں

اس شعر میں اگرچہ حسن و عشق کا مرتبہ برابر تسلیم کیا گیا ہے لیکن حوالے کا مرکز عاشق کی ذات ہے نہ کہ محبوب۔ عشق میں ایک طرح کی دروں بینی اور خودی کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا اقتضاء ہے کہ وہ جذبے کو ہر چیز پر فوقیت دے یہاں تک کہ بعض اوقات خود حسن پر بھی۔ جذبہ ذاتِ الٰہی کی طرح مطلق محض بننا چاہتا ہے تاکہ وہ خود کائنات کی ہر چیز کے لئے معیار اور قدر کی حیثیت اختیار کرے۔

حسرت حُسن کی عظمت تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بیان تمنا اور زبانِ محبت سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ؎

نہ سمجھا سوا حُسن کے اور کوئی
بیانِ تمنا، زبانِ محبت

عشق چاہے کتنا ہی رامِ حسن رہے لیکن اس کو اپنے وجود کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے ؎

عشق ہر چند رامِ حُسن رہا
پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس

پھر اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ عشقِ صادق حُسنِ کامل سے نہ ذکرِ برتری کرے اور نہ سُنے۔ یہ مکمل مساوات کی شان ہے ؎

عشقِ صادق نے حُسنِ کامل سے
نہ سُنا ذکرِ برتری، نہ کہا

لیکن کبھی کبھی نیازمندی کے عالم میں عشق، حُسن کی فوقیت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ فانیؔ کا شعر ہے ؎

خود حُسن کمالِ حُسن ہے یعنی حُسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق کمالِ عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

کبھی کبھی حسرتؔ نے بھی حُسن کے رُتبے کو عشق سے بلند کر دیا ہے اور ان اہلِ فکر و نظر کی تائید کی ہے جو حُسن کو محبّت کا خالق سمجھتے ہیں ؎

رُتبہ ترے حُسنِ فسوں کار کا شوق کے رُتبے سے بھی مافوق ہے

دوسری جگہ کہا ہے ؎

بڑھا تو خوب مگر نازِ عاشقی کا جلال
حریفِ جلوۂ نازِ جمال ہو نہ سکا

اور عشق چونکہ وجدانی طور پر جانتا ہے کہ سوائے حُسن کے اس پر کوئی دوسرا حکمران نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ اپنی گردنِ نیاز اُس کے آگے خم کر دیتا ہے ؎

سرِ عجز حسرتؔ بھی خم کیوں نہ ہوتا نرا ناز ہے حکمرانِ محبّت

عرفیؔ نے حسن و عشق کو دو شمعوں سے تشبیہ دی ہے جو ایک دوسرے سے روشن ہوتی ہیں ؎

ایں صفا حسن و محبّت ز ہم اندوختہ اند
ایں دو شمع است کہ از یک دگر افروختہ اند

کبھی حُسن و عشق کے معاملات ایسی منزل سے گزرتے ہیں جہاں اُن کی دوئی فنا ہو جاتی ہے اور اُن کا فرق و امتیاز بالکل مٹ جاتا ہے۔ خود حُسن کو عشق کا رُوپ دھارنے میں پس و پیش نہیں رہتا۔ یہ مضمون فانیؔ اور جگرؔ دونوں نے باندھا ہے اور خوب باندھا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دونوں نے موسیقی کے رس میں ہیرے کی چمک گھول دی ہو ؎

فانیؔ :— دل پہ جو نگاہیں تھیں رفتہ رفتہ آہیں تھیں
عشق بن گیا آخر حُسن جلوہ سازاں کا

جگرؔ :— یادِ ایّام کہ تھا حُسن ہی غارت گرِ ہوش
اب وہی عشق مجسّم ہے خدا خیر کرے

نیازِ شوق کے موضوع پر حسرتؔ کی زمزمہ سنجی ملاحظہ ہو ؎

روشن جمالِ یار سے دنیائے عشق ہے
گویا شرابِ حسن بہ مینائے عشق ہے

کیا کیا فراقِ حسن میں ہے نغمہ ریزِ غم
جانِ حزیں کہ بلبلِ گویائے عشق ہے

اے حسنِ بے مثال تری دید کے لئے
درکار دیدۂ دلِ بینائے عشق ہے

تیرا خیال منزلِ مقصودِ آرزو
تیرا جمال شاہدِ رعنائے عشق ہے

مدّت کے بعد پھر وہ ہوئے مائلِ کرم
یہ بھی تو اک طریقۂ احیائے عشق ہے

پنہاں حجابِ ناز میں ہے صورتِ جمال
پیدا حروفِ شوق سے معنائے عشق ہے

حسرتؔ کو پائے بندیٔ ایماں سے کیا غرض
وہ کافرِ جمال ہے ترسائے عشق ہے

اُردو کے تغزّل کا میلان ہر عہد میں زیادہ تر عشقِ مجازی کی طرف رہا۔ اگرچہ بعض شاعروں نے مجاز کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت کے رموز و اسرار کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔ دراصل عشقِ مجازی ہی میں انسانی قلب پر وہ واردات گزرتی ہیں جن کا براہِ راست اُس کو تجربہ ہوتا ہے اور جو اس کے لئے جذباتی اصلیت رکھتی ہیں۔ مجازی حسن چاہے کتنا نامکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گیرائیاں عالمگیر ہیں۔ جمالیاتی تجربہ خود علم کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ جس کی بدولت صداقت اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر چاہے شاعرانہ صداقت میں زندگی کا افادی اور عملی پہلو نظر نہ آتا ہو لیکن حقیقت میں وہ مضمر رہتا ہے۔ جذبے کی رمز آفرینی اُسے لطافت کا جامہ زیبِ تن کرا دیتی ہے تاکہ حسّی تجربہ بدہیئت اور بھونڈا نہ معلوم ہو۔ اس تجربے میں تخیل کے خواب سے حقیقت پیدا ہوتی ہے جس کی پرورش جذبہ اپنے آغوش میں کرتا ہے اور اشیاء اور حقائق کے تعلق کا تعین من مانے طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے غزل گو شاعر کا نقطۂ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کو استعاروں اور کنایوں

کے جال میں اس طرح پھانسنا چاہتا ہے کہ اس کا تعلق اُس کے تخیلی پیکروں سے ٹوٹنے نہ پائے جو اس کے دل کی دنیا میں براجمان ہیں۔

انفرادیت خود مکتفی ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی خارجی مظہر سے چاہے وہ کتنا ہی جمیل اور حسین کیوں نہ ہو دل بستگی نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ اس لئے کہ یہ اُس کے ضعف اور بے کمالی پر دلالت ہو گی لیکن فطرت نے انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک پیدا کر دی تاکہ وہ کافی بالذات ہونے کے احساس کو شکست دے اور اپنے بعض دوسرے مقاصد عالیہ کی تکمیل کرے۔ درد اشتیاق کی کسک نے کافی بالذات خودی کو غیر خودی کشش سے وابستہ کر دیا جسے فطرت کی زبردست کامیابی تصور کرنا چاہئے۔ اسی سے تمدن کی تخلیق ہوئی اور علائق کی دنیا آباد ہوئی جس سے بڑھ کر زندگی میں پر اسرار چیز کوئی نہیں۔ حق اور خیر حسن سے کم پر اسرار نہیں۔ اگر یہ اخلاقی قدریں نہ ہوتیں تو زندگی اپنی انفرادیت کی تنہائیوں میں گھٹ کر رہ جاتی اور اس کی افسردگی اس کی دائمی ہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی۔ غالبؔ نے اس نکتہ کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک طرف تو انسانی خودی کی خواہش ہے کہ وہ آزاد رہے اور اپنے آپ کو کسی سے وابستہ نہ کرے اور دوسری جانب غیر خود کی دل بستگی اس کو اپنی محبت کے دام میں پھانسنے کی فکر میں ہے۔ غرض کہ انسانی شخصیت کو عجیب و غریب کشمکش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاعر خدا سے دعا مانگتا ہے کہ تو ہی میرے آزادمنشی کے دعوے کی شرم رکھ لے۔ اس لئے کہ اگر میں محبوب یعنی غیر خود کی زلف میں گرفتار ہو گیا تو میرا یہ دعویٰ باطل ہو جائے گا۔

شعر ہے ؎

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا!
رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم[۲۵]

[۲۵] (حاشیہ بر صفحہ ۱۰۶)

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ محبّت سے مفر نہیں۔ سرو باوجود اپنی ساری آزادی کے گلشن کے زندان خانے میں گرفتار ہے۔ اسی لیئے اس کا آزادی کا دعویٰ جھوٹا ہے ؎

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

فطرت کی ستم ظریفی دیکھیئے کہ اُس نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان کے دل میں دردِ اشتیاق پیدا کر دیا بلکہ اس کے نفس کو جمالیاتی حس سے آشنا کر دیا اور اس کو یہ صلاحیت دی کہ وہ تخلیقِ حُسن کرے جس طرح وہ آفرینشِ اخلاق کرتا ہے۔ جمالیاتی حس عقل و ارادہ دونوں سے مختلف ہے لیکن ان دونوں کی طرح اس کا وجود بھی ذہنی ہے۔ جس طرح عقل صداقت کی اور ارادہ نیکی کی تخلیق کرتا ہے، اسی طرح جمالیاتی حس عالمِ فطرت اور عالمِ انسانی میں حُسن کی تخلیق کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تخلیقِ حُسن خارجی محرکوں کی محتاج ہے؟ اس سوال کے جواب میں اربابِ فکر میں بڑے اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے حُسن و عشق کی داستان کو اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ تخلیقِ حُسن کے لیئے کسی نے اپنے اندرونی تجربوں کو کافی خیال کیا اور بعض نے تھوڑا بہت خارجی محرکوں کا آسرا لیا۔ ہماری شاعری میں فکر و احساس کے یہ دونوں انداز ملتے ہیں اور دونوں میں جمالیاتی قدروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

چونکہ دروں بینی تغزل کی بنیادی خصوصیات میں ہے اس لیئے بعض غزل گو

(حاشیہ صفحہ ۱۰۵) حافظ کے یہاں اسی قسم کا مضمون اس طرح ادا کیا گیا ہے ؎

دلم کہ لافِ تجرّد زدے کنوں صد شغل
ز بوئے زلفِ تو با بادِ صبحدم دارد

شاعروں میں یہ میلان قدرتی طور پر پیدا ہو گیا کہ تخلیق حسن کو خارجی محرکوں سے بالکل بے نیاز کر لیا جائے یعنی عشق کیا جائے بغیر محبوب کے۔ دروں بینی نے یہ راہ بتائی کہ خود اپنی ذات ہی کو اپنا معشوق کیوں نہ بناؤ۔ یہ خیال اردو شاعروں کی ایجاد نہیں۔ اہل یونان کے ہاں بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ یونانیوں کی دیومالا میں دریا ئے سے فینز گے بطن سے ایک فرزند تولد ہوا جو بڑا ہو کر پورے یونان میں سب سے زیادہ خوش رو نوجوان مانا جاتا تھا۔ ایک دن کسی چشمے کے پانی میں اس نوخیز خوش جمال نے اپنا عکس دیکھا، تو دل و جان سے خود اپنی صورت پر فریفتہ ہو گیا۔ اپنے عکس کو دیکھنے میں اس پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ چشمے میں گر کر ڈوب گیا۔ اہل یونان کا اعتقاد تھا کہ اس خوش رو نوجوان کی روح ایک خوبصورت پھول کی شکل میں ظاہر ہوئی جس کو انہوں نے نرگس کے نام سے موسوم کیا۔ نرگس کا پھول آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی وقت سے آج تک وہ کائنات حسن کا تماشائی ہے۔

یونانی نوجوان نرگس کے نام پر یورپ کی مختلف زبانوں کے ادب میں "نرگسیت" (نرسس ازم) کی اصطلاح رائج ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ آرٹسٹ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز حوالہ قرار دے۔ اس اصول کے حامیوں میں انتہائی دروں بینی اور انفرادیت پائی جاتی ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات کو مصدر خیر و شر تصور کرتے ہیں اسی طرح اس کو خالق حسن بھی خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبوب صرف تخیل کا کرشمہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل حقیقت اپنا جذبہ ہے چاہے اس کا تعلق کسی خارجی شے سے ہو یا نہ ہو۔ چونکہ تخلیق حسن کا تعلق اپنی ذات سے ہے اس لئے نہ کسی خارجی محبوب کی حاجت ہے اور نہ جذبۂ عشق کی کارفرمائی کی۔ اس مسلک کے شاعروں اور ادیبوں نے جن میں سمبولسٹ تحریک کے شاعر بھی شامل ہیں حسن کو مطلق تجریدی شکل میں پیش کیا جو زندگی کی حرارت اور حرکت سے یکسر محروم

ہے۔ یہ ایک طرح کی زندگی سے گریز ہے۔ اس قسم کے تصوروں کا یہ اثر ہوا کہ احساس جمال کو عشق سے بے تعلق کر دیا گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی انفرادیت پرست فن کار اپنی ذات کو عشق و محبت کا مرکز ٹھہرا کر خارجی حسن سے بے نیازی کا اظہار کرے۔ لیکن ادب اور آرٹ کے یہ دونوں رجحان انتہا پسندی پر مبنی ہیں۔ اس لئے انہیں قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ دراصل جذباتی حقیقت ان دونوں کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔ آرٹسٹ اپنے آرٹ کی خاطر انسانیت سے اور دوسرے خارجی محرکوں سے اپنے آپ کو بے نیاز بھی کرتا ہے۔ اس واسطے کہ بغیر ایسا کیئے ہوئے اُس میں تخلیق حسن کے لیئے خود اعتمادی نہیں پیدا ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آرٹ کے ذریعہ انسانیت اور خارجی عالم سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے جس کے پس منظر میں کبھی وہ اپنی تقدیر سے نبرد آزما ہوتا ہے جس سے بڑھ کر پُر اسرار شعری محرک نہیں اور کبھی اپنی محفل خیال کو آباد کرنے کے لیئے اُس کے نقش و نگار مستعار لیتا ہے۔

اُردو غزل نگاروں میں بعض کے یہاں یہ رجحان ملتا ہے کہ عشق کو حُسن سے بے نیاز کر لیا جاوے۔ خاص طور پر عہد جدید کے شاعروں میں جگرؔ کے یہاں اس قسم کے خیالات ملتے ہیں۔ مثلاً اُن کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؂

مایوس ہو کے بیٹھیں جب ہر طرف سے نظریں دل ہی کو بُت بنایا دل ہی سے گفتگو کی

کونین کی ان بھول بھلیوں سے نکل جا اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جا نہ اُدھر جا

کہاں کا میخانہ، کس کا ساقی، کچھ اور بڑھنے دو بیخودی کو
یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا!

بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا — آغوش لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

دستِ جنونِ شوق کی گلکاریاں نہ پوچھ — ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہوں
جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

ایک گوشے میں سمٹ آئے ہیں دونوں عالم — میرا دامن ہے کسی اور کا آغوش نہیں

مندرجہ ذیل شعروں میں یونانی دیومالا کے کیرکٹر نرگس کی تقلید کی گئی ہے ؎

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

دل ہی کو صنم بنائیں گے ہم — آئیں گے کہیں نہ جائیں گے ہم
تجھ سے بھی سوا حسین ہو کر — اپنا سا تجھے بنائیں گے ہم

دیکھئے کیا شور اٹھتا ہے حریمِ ناز سے — سامنے آئینہ رکھ کر خود کو اک سجدہ کریں

اسی مضمون کے جگر کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشقِ معتبر ہو کر — گزر جا ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر

عشق ہے اعتماد کے قابل — حسن کا اعتبار کون کرے
ہمیں بن جائیں کیوں نہ صورتِ یار — دل کو پابندِ یار کون کرے

جس طرح عشق حسن سے بے نیاز ہو کر اپنی علیحدہ ہستی پا لیتا ہے اسی طرح وحشی بہار سے بے نیاز ہو کر صحرا کی طرف نکل جاتے ہیں ؎

سوئے صحرا نکل چلے وحشی — انتظارِ بہار کون کرے

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشر درآغوشِ خیال
حسن کیا؟ خواب ہے اک چشمِ تماشائی کا

اللہ اللہ ری وارفتگیٔ عشق مری ! اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

صیاد میرے دم سے ہیں سارے یہ چہچہے
جب میں نہیں تو رونقِ گلزار بھی نہیں

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے
یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

کہاں کے سرو وصنوبر کہاں کے لالہ و گل !
نگاہ ہی ہیں جو کیفیتِ بہار نہ ہو

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جگرؔ نے ہمیشہ عشق کو حسن سے بے نیاز کردیا ہے۔ وہ عشق کے لئے حسن کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے اور اس کی وسعتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس کا شعر ہے ؎

وہ بھی نکلی اک شعاعِ برقِ حسن میں جسے اپنی نظر سمجھا کیا

جگرؔ ہر موقع پر خودی کو غیر خود کے عشق سے بے نیاز نہیں کرتا۔ حسنِ برق وش کی ادائیں اُسے بھی گھائل کرتی ہیں اور بیتابیٔ محبت وجہ سکونِ غم بنتی ہے۔ اس کی اس غزل کا موضوع یہی ہے ؎

سب اُن پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں

اس حسنِ برق وش کے دل سوختہ رہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں

آلودہ خاک ہی میں رہنے دے اس کو ناصح
دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سمائیں

بیتابیٔ محبت وجہ سکونِ غم ہے
آغوشِ مضطرب میں خوابیدہ ہیں بلائیں

اشعار بن کے نکلیں جو سینۂ جگرؔ سے
سب حسنِ یار کی تھیں بے ساختہ ادائیں

دوسری غزل ملاحظہ ہو جس میں اپنی خودی کو غیر خود کے جمال سے وابستہ کر دیا ہے ؎

ملا کے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے
تجھے قسم ہے مجھے پاکباز رہنے دے

میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے

یہ تیرِ ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا
خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے

ازل سے حُسن تو عاشق نواز ہے لیکن
جو عشق ہی اُسے عاشق نواز رہنے دے

جگرؔ کو محبوب کی ایک موجِ تبسم میں رازِ گلستاں نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

صدقے ترے ہونٹوں کے رنگینیٔ و رعنائی
اک موجِ تبسم میں کل رازِ گلستاں ہے

پھر وہ تعلقات کی ان زنجیروں سے بھی بے خبر نہیں جو اُس کو غیر خود سے وابستہ کئے رکھتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک زنجیر ٹوٹتی ہے تو اس کی جگہ دوسری بندھن بندھ جاتی ہے۔ شعر ہے ؎

رہائی ہو نہیں سکتی کبھی قیدِ تعلق سے
جو اک زنجیر ٹوٹی دوسری زنجیر دیکھیں گے

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے ؎

نہ تعلقات کی حد کوئی، نہ توقعات کی حد کوئی
جو کبھی سمجھ میں نہ آسکے، وہ ہیں ایک فردِ حساب ہوں

جگرؔ نے کبھی تو عشق کو حُسن سے بے نیاز کر لیا ہے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی خودی حُسنِ برق وش کی اداؤں سے بُری طرح گھائل ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اساسی حقیقت عشق ہے یا حُسن؟ مرکزِ حوالہ خود اُن کی ذات ہے یا محبوب؟ اس شعر میں اس کیفیت کا اظہار کیا ہے ؎

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز
تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو

دوسری جگہ کہتے ہیں کہ حسن و عشق ایک دوسرے کے لئے اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جیسے جام و بادہ ؎

یہ حُسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغ جام نہیں

عاشقانہ شاعری کا اعلیٰ ترین مقام عشقِ الٰہی یا عشق افلاطونی ہے۔ درمیانی مقام عشق مجازی اور اسفل مقام ہوس پرستی کے جذبات۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عشق حقیقی اور عشق مجازی میں فرق و امتیاز ناممکن ہو جاتا ہے۔ جگرؔ نے ایک موقع پر عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پرتو سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ صوفیانہ تغزل میں مجاز کو حقیقت کا پرتو بتاتے ہیں جگرؔ کے اس نقطہ نظر میں تغزل کی حقیقی روح کارفرما ہے ؎

صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا
اک پرتوِ لطیف تھا حُسنِ مجاز کا

اردو تغزل میں عشق مجازی کی وارداتوں اور معاملوں کو پیش کرتے ہوئے ایسے ایسے لطیف مطالب و معانی پیدا کئے ہیں کہ ان کی مثال شاید فارسی کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں۔ عشق و محبت کا مضمون بظاہر پامال اور فرسودہ ہے لیکن حقیقت میں اس کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ اس جذبے کی نمایاں خصوصیت اس کی وسعت ہے جسے تغزل کے میٹھے سُروں میں ظاہر کیا گیا ہے، جو اپنی خود رفتگی اور دردمندی کے سبب سے تاثیر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔

جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی، اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات اور ان کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔ اگر حدیثِ شوق بیان کرنے والے کے لب و لہجہ میں اخلاص اور اس کے احساس میں شدت ہے تو دل چوٹ کھائیں گے اور سننے والے متاثر ہوں گے

لیکن اگر اس کے پیش نظر محض لفظوں کا الٹ پھیر یا ایسی مضمون آفرینی ہے جو تصنع کے پر دل پر پرواز کرنا چاہتی ہے تو اس کی بات بے اثر رہے گی اور خود کہنے والے کو جھٹلائے گی۔

غزل میں عشق کی واردات کے علاوہ محبوب کے حسن و جمال، ناز و ادا اور جور و جفا کا بیان اس طور پر کیا جاتا ہے کہ سامع کے حافظے میں بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں۔ اور وہ شاعر کے تجربوں میں خود بھی شریک ہو سکے لیکن غزل گو شاعر ہر حالت میں ایک قسم کا لحاظ اور پردہ برقرار رکھتا ہے تاکہ اُسے جو کچھ کہنا ہے اس میں ابتذال اور رکاکت راہ نہ پا سکے۔ مجازی عشق کے بیان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس واسطے کہ اس کے ڈانڈے ہوس پرستی سے آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں غزل کے بڑے بڑے استادوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا ہے۔ میر صاحب کی شاعری تمام تر عشق مجازی کی داستان ہے۔ انہوں نے انسانی عشق و محبت کے لطیف اور نازک جذبات کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ جن میں تصنع نام کو نہیں۔ اگرچہ خیالات میں کوئی خاص ندرت نہیں لیکن اُن کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں نرم اور ملائم لفظوں میں کہتے ہیں۔ اُن کی غزلوں کا ترنم اعلیٰ درجہ کا ہے، جو اُن کی رُوح کی موسیقیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں معاملہ بندی اور واقعہ گزاری ہے لیکن اس کی سطح بہت اونچی ہے۔ اُن کی سادگی پر لاکھ تکلف قربان ہیں۔ اُن کا ہر لفظ بلاغت اور سوز و گداز میں رچا ہوا ہوتا ہے، اس لئے نشتر کی طرح دل کے پار ہوتا ہے۔ میر صاحب کا ترنم شیریں، نرم اور دل گداز ہے، جو ان کے احساس کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اُن کی ہر بات میں اُن کا داخلی رنگ نمایاں رہتا ہے۔ اُن کا مرتبہ اردو غزل کی دنیا میں ہمیشہ بلند رہے گا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ رمز و اشارہ کی زبان میں کہتے ہیں۔ مجازی عشق کی نسبت اُن کے کلام سے چند مثالیں

ملاحظہ ہوں ؎

جو تو ہی صنم ہم سے بیزار ہوگا
تو جینا ہمیں اپنا دشوار ہوگا

چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا
کھب گئی دل میں تیری بانکی ادا

جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ
ہائے رے چشم دلبراں کی ادا

دل چلے جاتے ہیں خرام کے ساتھ
دیکھی چلتے ہیں ان بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے بھی یہ خوب جانتے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

آرزو اس بلند و بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وہ لب
یعنی اک بات ہی بنائی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

نازکی ان لبوں کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

خدا کرے مرے دل کو ٹک اک قرار آوے
کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے

ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے
خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میرؔ
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آوے

میرؔ صاحب کی غزل گوئی انسانی اور مجازی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن کہیں بھی طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف راغب نہیں کرتی۔ یہ ایک عشق بازی کی نازک قلبی واردانوں کا بیان ہے جو اپنے خلوص اور سوز و گداز کے سبب سے تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے برخلاف جراتؔ کے تغزل میں چونچلاپن اور لطیف سی خارجیت اور ہوس پرستی ہے۔ اُس نے حسّی تجربے کو جذبے میں سمونے کی کوشش نہیں کی جس طرح میرؔ اور غالبؔ نے کی۔ پھر بھی اس کے طرزِ ادا کی شوخی، خوبی اور صداقت سے خالی نہیں۔ اگرچہ وہ اکثر ہوسناکی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لیکن اس میں لطف سخن کی رنگ آمیزی ضرور ہوتی ہے۔ جراتؔ کو لفظوں کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے۔ لیکن وہ بلند جذبات برانگیختہ نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے ان باتوں کو جو درپردہ کہنے کی تھیں، صاف صاف کہہ دیا۔ اور اس طرح اپنے کلام میں ایک عیب کو راہ دی جس سے وہ چاہتا تو بچ سکتا تھا۔ وہ معاملات جو رمز وایما کی زبان سے بیان کرنے کے ہیں خارجی تفصیل کے کس طرح متحمل ہو سکتے ہیں۔ غزل میں معاملات کے اشارے ہونے چاہئیں نہ کہ اُن کا تفصیلی بیان۔ جراتؔ کے کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

مل جائے گا سے تاب اب اسے نازنیں نہیں

ہے ہے خدا کے واسطے مت کہہ نہیں نہیں

کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں

بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں

کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ جی

یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

قشقہ جو وہ کھینچے تو کھنچی جائے اُدھر جان — اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس مار ہی ڈالے

بے ہوش سا محفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا — ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کچھ منہ سے نکالے

تو گیا اور ہم تری صورت کو تکتے رہ گئے — غمزدے روتے تڑپتے سر پٹکتے رہ گئے

عاشقوں کے دل بلاقِ یار کے موتی کی طرح — بوسے کی خواہش میں اس لب پر لٹکتے رہ گئے

اس غزل کے شعروں سے ذہن کسی بلند خیال یا نازک احساس کی طرف مائل نہیں ہوتا لیکن اسی غزل میں ایک نہایت بلند شعر بھی ہے جسے سُن کر ایک دم سے آدمی ٹھٹک جاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجے کی رمزی اور ایمائی قوت موجود ہے

کارواں جاتا رہا اب اور ہم گم کردہ راہ

گرد کے مانند صحرا میں بھٹکتے رہ گئے

غزل کے مقطع میں لفظوں کا چناؤ اعلیٰ درجہ کا ہے لیکن چونکہ شاعر نے رمز و کنایہ کی کوئی طلسمی کیفیت پیدا نہیں کی بلکہ حقیقی خارجی منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس واسطے سامع کے ذہن میں لطف کے ساتھ ایک قسم کا مضحکہ خیز تصور راہ پاتا ہے۔ مقطع یہ ہے ؎

ہو گیا غائب نظر سے برق کے مانند وہ — اور ہم جرأت پلک اپنی جھپکتے رہ گئے

جرأت کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اجل گر اپنی خیالِ جمالِ یار میں آئے | تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے رنجِ فراق | الٰہی موت بھی آئے تو وصلِ یار میں آئے

پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر جمالِ یار کے تصور میں موت آئے تو مزار میں بجائے فرشتے کے پری آئے گی اور دوسرے شعر میں تمنا ہے کہ موت وصلِ یار کی حالت میں آئے۔ دونوں تصورات بھونڈے، غیر شاعرانہ اور رکاکت کا پہلو لئے ہوئے ہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ اس کے اور شعروں میں بھی چھچھلا پن اور خارجیت نمایاں ہیں جو کہیں کہیں لطف سے خالی نہیں ؎

کرو منع ناصح کو ہم سے نہ بولے | کہاں کا یہ ہم خواہ پیدا ہوا ہے
کہے گر کوئی اس سے ملئے کہ جرأتؔ | تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہے وہ از رہِ طعن "ہاں جی | یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے"

مجھ کو ڈر ہے کہ کرے حشر وہ برپا نہ کہیں | زیرِ پا اس دلِ مضطر کو دبائے رکھئے
بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق | آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے

یہاں بھی جرأت کی معاملہ بندی مجاز کی منزل سے نکل کر بوالہوسی کے کوچے میں قدم رکھتے ذرا نہیں جھجکتی۔ اور نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ حسّی تجربے (سینسیشن) کو جذبے (اموشن) میں منتقل کرے لیکن وہ لفظوں کا استعمال خوب جانتا ہے۔ آخری شعر میں بھڑائے کی جگہ "ملائے" یا "لگائے" لایئے تو شعر بے مزہ ہو جائے گا۔ اگرچہ اس شعر میں رمز وایما کی کوئی معنوی یا داخلی خوبی موجود نہیں لیکن لفظ "بھڑائے" نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ بعض لفظوں میں اظہار کی ایسی زبردست قوت اور تازگی ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے مطالب کی پستی کا عیب بڑی حد تک

چھپ جاتا ہے۔

جرأت سے قبل خواجہ میر درد کے ہاں بھی بھڑانے کے لفظ کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا

بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

حسرت نے بھی اس لفظ کو برتا ہے۔

آج تو منہ لبِ ساغر سے بھڑا دے میرا ساقیا تجھ کو مری مستیٔ پیماں کی قسم

شعرائے متوسطین میں مومن خاں مومن نے عشقیہ مضامین کے اسالیب بیان میں جو نزاکت اور لطافت پیدا کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کی حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اگرچہ اُن کی مضمون آفرینی انسانی محبت کی وارداتوں اور معاملوں تک محدود رہی لیکن ان کی خوش مذاقی نے انہیں کبھی پستی کی طرف نہیں جانے دیا۔ اُن کی جذبہ نگاری کا دامن سستی اور مریضانہ جذبہ فروشی کے داغ سے ہمیشہ پاک رہا۔ مومن نے اپنی غزلوں میں عشق کی کیفیتوں، حُسن کی اداؤں اور اس میدان کے تمام تجربوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ذوق وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کنائے اور استعارے کے بادشاہ ہیں اُردو زبان کے اعلیٰ اور دلنشیں تغزل کے نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

کثرتِ سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے وہ بُت آزردہ گر نہ ہو جائے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی میرے قتل کی باتیں اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰؑ اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومنؔ کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی"

داغؔ کی غزلوں کا عام رجحان بھی مجازی عشق کی طرف ہے۔ اس نے رمز و ایما کی کیفیات کو اکثر برقرار رکھنے کی کوشش کی جس کے سبب سے اُس کا تغزل جرأتؔ کے تغزل کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے۔ اس کی شوخی اور البیلے پن میں ایک خاص شان ہے، جسے خوبیِ بیان اور حسنِ ادا نے اور بھی چمکا دیا۔ اس کے یہاں وہی پرانے فرسودہ مضمون ملتے ہیں جنہیں قدما کے وقت سے اب تک باندھتے چلے آئے ہیں لیکن وہ انہی میں اپنے فنی رچاؤ سے نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں غالبؔ کی طرح بلند مضامین نہیں ملتے لیکن حسنِ بیان کی ادبی قدر اس کی ہر غزل میں موجود ہے اور شوخی تو اُس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اُس کی زبان میں خاص لطافت، نزاکت اور لوچ ہے جو اُس کے ہمعصروں میں سے کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ امیرؔ مینائی نے بہت زور لگایا لیکن وہ بات پیدا نہ کر سکے اور سامع کے لئے اس دلبستگی کا سامان فراہم نہ کر سکے جو داغؔ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ داغؔ کی شاعری کا محرک ہوس پرستی کا جذبہ ہی سہی لیکن یہ جذبہ صحت مند ہے۔ جرأتؔ کی طرح محض عیاشی کی آئینہ نہیں ہے۔ اسے ہم بقول حسرتؔ موہانی فاسقانہ شاعری کہہ سکتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں اور جس میں نشاط اور شوخی کی لطیف آمیزش ملتی ہے، جسے طرزِ بیان کی چستی نے اور نکھار دیا۔ داغؔ کے کلام کی جمالیاتی صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چند

مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام	کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے
تم آؤ جب سوارِ توسنِ ناز	قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں ان کی	پھر آرزوئیں کروگے حیا کے آنے کی

بڑا مزا ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوہ	وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

مرے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے	مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا	تمہاری برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف	ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی	اے بتو ایمان داری اٹھ گئی
بے طرح پھیلا ہے ان زلفوں کا جال	اب امیدِ رستگاری اٹھ گئی
دور ہیں اس چشمِ مستِ ناز کے	لذتِ پرہیز گاری اٹھ گئی
کس سے رکھے داغ چشمِ دوستی	اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

بات میری کبھی سنی ہی نہیں	جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں
لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد	ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں
اڑ گئی یوں وفا زمانے سے	کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا	وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

مندرجہ ذیل غزل کے اکثر شعر موسیقی میں رچے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصویر کشی بھی جاذبِ نظر ہے۔ ایمائی محاکات، اور ترنم کی خوبیوں نے داغ کے آرٹ کو اس غزل میں بلند کر دیا ہے۔ خصوصاً دوسرا شعر بہت خوب ہے ؎

حیا نے روک لیا جذبِ دل نے کھینچ لیا
چلے وہ تیر کی صورت کھنچے کماں کی طرح

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی جاتی ہے بیمارِ ناتواں کی طرح

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح

ناصح کی لمبی چوڑی نصیحتوں سے عاشقوں کو ہمیشہ شکایت رہی۔ اُن کے نزدیک یہ طولِ کلامی فضول اور بے محل ہوتی ہے۔ داغ نے اس مضمون کو کس شوخی سے ادا کیا ہے۔ شعر ہے ؎

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

ایک شعر اور سُن لیجئے اور شوخ نگاری کی داد دیجئے ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

عہدِ جدید کے شاعروں میں مجازی عشق کی کیفیتوں کو حسرتؔ نے جس نزاکت اور لطافت سے بیان کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ رنگینی اور جوشِ بیان کے امتزاج سے وہ خیالات کا ایک طلسم سا باندھ دیتے ہیں جس میں داخلی تجربے اور خارجیت کی جھلکیاں ایک دوسرے میں سموئی ہوتی ہیں۔ اُن کا عشق نفسانی عشق ہے۔ وہ میرؔ اور مومنؔ کی طرح ارضیت اور مجاز کی منزل سے آگے بڑھنے کے کبھی دعویدار نہیں ہوئے۔ خیالات کی رفعت اور ٹھہراؤ اور جذبات کے خلوص کے باعث انہیں اگر اس زمانے میں غزل کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انہیں بندشوں کی چستی، لفظوں کی نشست، تشبیہوں اور استعاروں کی جدت میں کمال حاصل ہے۔ وہ عشق و محبت کے نازک اور لطیف جذبات اور اُن کے اتار چڑھاؤ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے وہ

اس وادی کے ذرے ذرے سے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں بھی رنج و کلفت کا ذکر ملتا ہے جو اس میدان میں قدم رکھنے والے کو پیش آتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ پُر امید رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اُردو زبان کے غزل گو شاعروں میں کوئی بھی اتنا پر امید نہیں جتنے کہ وہ ہیں۔ انہیں ہمیشہ اس کا یقین رہتا ہے کہ آخر میں ان کی سب آرزوئیں پوری ہوں گی۔ ان کے یہاں میر کا سوز و گداز اور داغ کی نشاط انگیزی دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ ثانی الذکر کا پلہ بھاری ہے۔ وہ زندگی کے امکانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوئے اور اپنے تغزل کو شعریت کے علاوہ اور کسی دوسرے خارجی محرکوں سے آلودہ نہیں کیا۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ اگر انسانی جذبات زندگی کا جز ہیں تو ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ حسرت زندگی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور ایسے رنگوں میں پیش کرتے ہیں جن کی آب و تاب آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اُن کی شگفتہ بیانی میں جو دلبستگی اور بےساختہ پن ہے وہ دورِ جدید کے کسی غزل گو کے یہاں موجود نہیں ان کے یہاں تغزل کے خارجی اور داخلی پہلو ایک دوسرے میں ایسے مل گئے ہیں کہ انہیں الگ نہیں کر سکتے۔ اُن کے کلام میں معشوق کی اداؤں کا ذکر بھی ہے اور عاشق کے تجربوں کی تشریح بھی۔ اس نازک توازن نے حسرت کے تغزل میں ایک خاص معنویت اور رنگ پیدا کر دیا ہے جو انہیں کے لئے مخصوص ہے۔

حسرت کے ہاں صنفِ غزل اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں غالب اور مومن کی نازک خیالی نے نیا روپ اختیار کیا ہے۔ حسرت کی شاعری اساتذہ سے متاثر ہے لیکن ان کا کلام پڑھتے وقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کے لب و لہجہ میں نیاپن ہے۔ انہوں نے غزل میں ایک نئی لے چھیڑی ہے جو ان کی اپنی انفرادیت کی آواز بازگشت ہے۔ انہوں نے صدق و خلوص کو بڑی خوبی

ہے شعریت میں سمویا ہے۔ آیئے ذرا اُن کی شاعری کا تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ عشق و محبت کی داستان کو انہوں نے کس طرح سے بیان کیا ہے۔ حسرتؔ کے یہاں انسانی زندگی محبت سے عبارت ہے۔ اگر یہ نہیں تو زندگی بے رنگ اور بے کیف ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں عشق کے مختلف مدارج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور اپنے تخیل کی مدد سے عشقی جذبے میں تغزّل کی کمال بینی پیدا کر دی ہے۔ اس کمال بینی میں جنسی جذبے کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور تزکیہ بھی۔ وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی چیز ہے۔ اس کی شدّت اور حرکت کے ہر راز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ محبت کرنے والا ایک قسم کی طلسمی فضا میں زندگی بسر کرتا ہے جو جذبے اور تخیل کے میل سے پیدا ہوتی ہے۔ شروع شروع میں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ دل چاہتا کیا ہے؟ فطرت کی شرارت اپنے کسی منشا کی تکمیل کے لئے پُراسرار طریقے اختیار کرتی ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پردۂ راز سے کوئی پکار رہا ہے ؎

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

جذبۂ شوق کی آواز پر عاشق اس لئے لبیک کہتا ہے کہ یہ آواز خود اس کے دل کی گہرائیوں میں سے اٹھتی ہے اور اس میں ایسا کھنچاؤ ہوتا ہے کہ وہ خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ تحت شعوری ہیجان اپنی تکمیل کے لئے بے چین ہوتے ہیں کبھی تو ان کا اظہار صاف طور پر ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ شعوری انا کے

؎ میر حسن نے بھی اسی قسم کا مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

اتنا معلوم تو ہوتا ہے کہ جاتا ہوں کہیں
کوئی ہے مجھ میں کہ مجھ سے لئے جاتا ہے مجھے

محتسب سے بچنے کے لیے حیلہ سازی اور حکمت عملی سے کام لیتے ہیں جس کا پتہ خواب کی حالت میں چلتا ہے جس کی طرف تحلیل نفسی کے ماہروں نے توجہ دلائی ہے خواب کی حالت شعور اور غیر شعور کے درمیان دھندلکے کی سی ہوتی ہے۔ اس میں فطرت اور روحانی آزادی ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ غیر شعوری ہیجانوں کی بھول بھلیاں ایک ایسے تاریک غار میں واقع ہیں جس کے اور چھور کا پتہ نہیں۔ پھر اس غار کے منہ پہ تہذیب و تمدن کے موٹے موٹے پردے پڑے ہوتے ہیں جو روشنی کی ایک کرن بھی اس کے اندر نہیں جانے دیتے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی خبریں ہمیں سناتا ہے اور اس اعتماد سے سناتا ہے، جیسے آنکھوں دیکھی سنا رہا ہو۔ اس کی نظر سے یہاں کا کوئی نشیب و فراز پوشیدہ نہیں ہوتا۔ جب اس دنیا سے کوئی آواز آتی ہے تو وہ اس کے لوچ اور لہجے اور اشارے کو سمجھ جاتا ہے اور ہمیں بھی اس سے تھوڑا بہت واقف کرا دیتا ہے۔

تحت شعور کے تاریک پردے پہ زندگی کے ارتقاء کے کروڑوں برس کی یادیں نقش ہیں۔ ہم اگر اپنی خواہشوں اور امنگوں کا تجزیہ کریں تو اس سے ان کا رشتہ جڑا ہوا پائیں گے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ہماری زندگی کن چھپی ہوئی قوتوں کا کھیل ہے۔ ان قوتوں میں کون سی واقعی اچھی ہیں اور کون سی بری ہیں۔ ہم اپنی ظاہری زندگی کو تعقل کے سانچے کے مطابق کرنے میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ان چھپی ہوئی قوتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن شاعر تحت شعور کی بھول بھلیوں میں قدم رکھتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتا، وہاں وہ ان چھپی ہوئی قوتوں سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انہیں پھسلاتا ہے اور انہیں اپنے تجربوں میں شریک کرتا ہے تاکہ ان کا اعتماد حاصل کر کے ان کا رازدار بنے۔ عقل ان تحت شعوری قوتوں سے ایسی گھبراتی ہے کہ ان سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ان کے قریب

چھٹکنا اپنی کسرِ شان سمجھتی ہے تو یہ تحت شعوری جذباتی تو تیں بھی اس کو نہیں خطرا یا
شاعر اپنی تخلیق کا مواد خام تحت شعور سے حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے تجربوں میں سمو کر شعوری انداز میں پیش کرتا ہے۔ لیکن اُس کی آواز تو اس کے جذباتی تجربے کی گہرائیوں میں سے اٹھتی ہے اس لئے اس میں رچاؤ اور لبھاؤ ہوتا ہے جسے سُن کر دل اُس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اس کی بات میں لبھاؤ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ عالمگیر تجربے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ وہی ہے جو اُن کے جی میں ہے۔ بقول غالب ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غزل گو شاعر کے تحت شعوری تجربوں پر عشق و محبت کے جذبات چھا جاتے ہیں اور ایسے چھا جاتے ہیں کہ کائنات میں سوائے اُن کے انہیں اور کچھ نظر نہیں آتا وہ منزل کی مسافت بھی ہوتے ہیں اور منزل بھی۔

وادیٔ عشق کا مسافر جذبۂ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ چلتے چلتے تھک کر چور چور ہو جاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوتِ عشق اُس کو سنبھال لیتی ہے ماجرائے عشق کا نقشہ حسرت نے اس طرح کھینچا ہے ؎

قوتِ عشق بھی کیا شے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

آغازِ محبت کا ایک منظر ملاحظہ ہو ؎

دل کو تری وزدیدہ نظر لے کے گئی ہے — اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت — آئینِ وفا مدِ نظر لے کے گئی ہے

جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت
مجبوریٔ دل خاک بسر لے کے گئی ہے

پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں کہ دُعا کو
قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے

لیکن واضح رہے کہ حسرتؔ اپنی محبت کی داستان کو مایوسی کی لے پر ختم نہیں کرتے۔ باوجود ناکامیوں اور نامرادیوں کے امید کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا محبت کے ابتدائی تجربوں میں مایوسی ہوتی ہے اس سے وہ بے خبر نہیں۔ کبھی مایوسی اور محرومی میں عاشق محبت سے دست بردار ہو جانا چاہتا ہے اور محبوب کو جتا دینا ہے کہ دشمنِ وفا ہو کر دل کی خریداری ممکن نہیں۔ یہ جنس گرامی بے وفاؤں کے لئے نہیں ؎

وفا سے دشمنی رکھ کر مرے دل کی طلب گاری
بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری

لیکن بالآخر حُسن و عشق کی کشمکش میں حُسن کو کامیابی ہوتی ہے اور وہ جنس گرامی جس پر عاشق کو بڑا ناز تھا، خرید لی جاتی ہے۔ ایک دفعہ پھنسے تو ہمیشہ کے لئے پھنسے۔ اب اس جال سے رستگاری ممکن نہیں۔ ہجوم غم میں دل عشق کی نیرنگیوں کا جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اسی عالم میں عاشق اس طرح گنگنانے لگتا ہے ؎

ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغازِ محبت میں
نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری

نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی
نہ اٹھے گا مرے دستِ جنوں سے لیچ بیکاری

نہ اُن کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ممکن ہے
کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری

وفورِ اشکِ پیہم سے ہجومِ شوق بے حد ہیں
مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

غضب نیرنگیاں تھیں گریۂ ابتدائی کی
ہوئی ہے جن سے وامانِ محبت پر یہ گلکاری

نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی
کہ ہے اقرارِ دل جوئی نہ انکار ستم گاری

نہ کرتا اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دنیا میں
مبادا ایک قلم اٹھ جائے تہذیبِ وفاداری

نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے
قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری

یہی عالم رہا گر اس کے حسنِ سحر پرور کا
تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

نسیمؔ دہلوی کو دجہ ہے فردوس میں حسرت
جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

ہجر کی کلفتوں میں مشتاقِ دید اپنے آپ کو طرح طرح سے دھوکے میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ محبوب کا حجاب اس کی حیرت سے ہم کلام ہے ؎

تھا حجاب ان کا مری حیرت سے سرگرم کلام
تھی بظاہر خامشی در پردہ خاموشی نہ تھی

تمنا سو پردوں میں لطف و عنایت کی خواہش پیدا کر لیتی ہے۔ وہ دھوکے

کھاتی ہے۔ اور آئندہ اور دھوکے کھانے کے عذر تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر یہ فریب نظر نہ ہوں تو زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہو جائے۔ تمنا کی خواہش لطف و مراعات ملاحظہ فرمائیے ؎

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے
دِل جفا جو سے بہ ایمائے تمنا اب تک — ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے

یہ جانتے ہوئے کہ کرمِ یار ہم رنگ جفا ہو گا پھر بھی دل اس کا متمنی رہتا ہے ؎

پھر اسی لطفِ ستم کوش کا مشتاق ہے دل
ہم نے جس لطف کو ہم رنگ جفا دیکھا تھا

ہجر و محرومی کی راتوں کو کاٹنے کے لیے لطفِ ستم کوش کا متمنی کبھی یہ ترانہ محبت گاتا ہوا سنائی دیتا ہے ؎

ترے کشتے اے جانِ جانِ محبت — حقیقت میں ہیں کامرانِ محبت
کرم بھی ترا یادگارِ وفا تھا — ترا جور بھی ہے نشانِ محبت
جہاں آفریں تھی بہارِ تمنا — بہار آفریں ہے خزانِ محبت
جو سرگشتۂ یاس و حیرانِ غم ہو — وہی عقل ہے کامرانِ محبت

زہے قبلۂ دین و ایمانِ حسرت
خوشا رتبۂ آستانِ محبت

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روئے دلآرا کے تصور سے عاشق کے خیال میں رنگ و بوئے یار پیدا ہو جاتی ہے جسے اس کی درون بینی کی کرامات کہنا چاہیے ؎

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

عاشق جور و جفا سہتا ہے اور دل میں اس کی تاویلیں کرتا جاتا ہے تاکہ معشوق

پر حرف نہ آئے۔

اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا　　　سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب بھولا بھالا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی ستم آئینوں کی توجیہہ نہ کر سکے اور کشمش و پیچ میں پڑ جائے۔ اس لئے معاملوں کو اس طرح سمجھو اور سمجھاؤ کہ اس کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔

ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کر لیں
کیا ہوا اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

کبھی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ تغافل انہیں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کے ساتھ خصوصیت ہوتی ہے۔

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ انبیاز اُن کا
باندازِ جفا ہے التفاتِ دل نواز اُن کا

غالب نے بھی ایک جگہ محبوب کی جفا کی عجیب و غریب توجیہہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب اپنی جفا کو امتحان کا نام دیتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک قسم کی چھیڑ جاری رہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی جفا سے ہم اپنی وفا کبھی ترک نہیں کریں گے۔

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں　　　اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اُس کی وفا شعاری کا اُس کو کوئی صلہ نہیں ملا۔ اس واسطے کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو فراموش کر کے بے نیازِ مدعا ہو جائے آیئے پھر حسرت کی طرف رجوع کریں۔ وہ کیا کہتے ہیں؟

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے　　　اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال　　　آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

لیکن ان عزائم میں کامیابی نہیں ہوتی ؎

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

یہ کہہ کر دل کا حوصلہ بڑھایا جاتا ہے کہ جب اس میدان میں قدم رکھا ہے تو اب واپس جانا کیسا؟

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل اے دلِ مبتلا
مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے ناز بتاں اٹھا

عاشق محسوس کرتا ہے کہ دردِ اشتیاق کی کسک میں ایک خاص قسم کی لذت ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی خواہش اور تمنا یہی رہتی ہے کہ کوئی پیرِ مغانِ عاشقی سیرابِ غم کر دے تاکہ تشنگانِ عاشقی کی پیاس بجھے۔ عاشقانِ عاشقی کا احوال ایک غزل میں نہایت پُر تاثیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں تغزل اور شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محبوب سے بھی زیادہ خود عاشقی سے محبت ہے۔ وہ محبت کرتا ہے محبت کی خاطر نہ کہ محبوب کی خاطر۔ محبت کا یہ اخلاص خود محبت کے مرتبے کو بلند کر دیتا اور اس کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔ عاشقانِ عاشقی کی زبان سے حسرت سوزِ نہاں کی کیفیتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

حسرت کشانِ درد ہیں ہم تشنگانِ عاشقی
سیرابِ غم کر دے کہیں پیرِ مغانِ عاشقی

مطلوبِ آہِ سرد ہیں محبوبِ رنگِ زرد ہیں
معشوقِ اہلِ درد ہیں ہم عاشقانِ عاشقی

ہیں واقفِ انجام ہم کیوں دیں انہیں الزام ہم
جب تک رہیں ناکام ہم ہیں کامرانِ عاشقی

راحت سے دل گھبرائیگا رہ رہ کے غم یاد آئیگا
کیونکر بھلایا جائے گا عیشِ زمانِ عاشقی

منظور دلداری رہا لطفِ نہانِ دلبراں
مقصود رسوائی رہی شانِ عیانِ عاشقی

وہ ہم کہاں وہ دل کہاں البتہ اتنا ہے کہ ہاں
باقی ہے اک سوزِ نہاں اب تک نشانِ عاشقی

باوجود امید پرست ہونے کے حسرتؔ کا عقیدہ ہے کہ عشق کی روحِ پاک تحفۂ غم کے بغیر شاد نہیں ہو سکتی۔

عشق کی رُوحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

جان کو محوِ غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر

حسرتؔ باوجود وادیٔ عشق کی محرومیوں اور مایوسیوں کے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ستم یار تمہید کرم بن جائے گا۔ اب شاعر کو یاس کی تاریکیوں میں امید کی کرن جھانکتی نظر آتی ہے۔

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

جفائے یار کا شکوہ نہ کر اے رنجِ ناکامی
امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی عاشق محض یادِ یار سے فراق کی گھڑیوں کو گوارا بناتا ہے۔ عشق کی ایذا میں دل کو راحت ملتی ہے۔ کرمِ یار کی جھلکیاں اب عالمِ خیال میں نظر آنے لگتی ہیں۔

از بسکہ یادِ یار مسیحائے عشق ہے
راحت فزائے دل ہے جو ایذائے عشق ہے

تیرا خیال منزلِ مقصودِ آرزو
تیرا جمال شاہدِ رعنائے عشق ہے

حسرتؔ کہاں وہ شاہ کہاں تو گدائے حسن
زنہار اگر تجھے سرِ سودائے عشق ہے

مدّت کے بعد پھر وہ ہوئے مائل کرم　　یہ بھی تو اک طریقۂ احیائے عشق ہے

حسن جاناں سے عشق کا خطاب تو ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ خطاب کرنے والے کے تیور بتاتے ہیں کہ اس کو اپنی عظمت کا احساس ہے ؎

حسن جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق　　دُور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا
بے خرد ہو کے محبت کی بدولت اے عقل　　نام بھی اب نہیں لیتا دل فرزانہ ترا

فکر کونین سے بیگانہ ہوا تو حسرتؔ
خوب ٹھہرا غمِ جانانہ سے یارانہ ترا

آخری مصرع کی برجستگی اور موسیقیت کی داد نہیں دی جا سکتی۔

محبت کی مختلف آزمائشوں میں سے گزر کر شوق محفل حسن میں بار پاتا ہے وہاں پہنچ کر دل اٹھنے کا نام نہیں لیتا لیکن مجبوراً اٹھنا ہی پڑتا ہے ؎

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

بالآخر جذبۂ شوق کی رہبری میں وادیٔ عشق کا مسافر شہر وصال پہنچ جاتا ہے ؎

کچھ بھی شہر وصال دور نہیں　　جذبۂ عشق ہو جو راہ نما

منزل پر پہنچ کر مسافر کو جو خوشی ہوتی ہے، عاشق کو وہی مسرت اپنی کامرانی پر ہوتی ہے جسے شاعرانہ زبان میں وصل کہتے ہیں۔

اب حسرتؔ کا ترانۂ وصل سنئے ؎

للہ الحمد کہ تاریکیٔ فرقت ہوئی دور　　مژدۂ وصل بعد جلوۂ انوار آیا
چمنِ جاں میں نسیم ہوس انگیز چلی　　کشت امید پر ابر طرب آثار آیا
بادۂ عشق سے مینائے تمنا جو بھری　　ساغر شوق مے ذوق سے گلنار آیا
بند کر دیگا لب یار کو بوسوں کا ہجوم　　آج بھی ہم سے جو وہ بر سر پیکار آیا

مندرجۂ ذیل اشعار میں شاعر نے اپنے مطالب کو صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ سامع کے ذہن میں اس کی مطلب براری بہ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ لب و لہجہ میں ضبط و اعتدال ہے۔ کہیں ابتذال اور عریانی کا شائبہ نہیں، جو ذوق پر گراں گزرے۔ پھر بیان کی تازگی اور صفائی کے ساتھ مرکزی کیفیت برقرار رکھی ہے جس پر تغزل نازاں ہے ؎

چاندنی راتوں میں پھولوں کا ہے زیور کیا خوب
رنگ لائے گا ترا حسنِ معطر کیسا خوب

روشنی بخش تمنا ہے جو اک ماہِ منیر
وصل کی رات کا چمکا ہے مقدر کیا خوب

دیکھتے ہی انہیں پہچان لیا جان لیا
ہم سے وہ چھپنے چلے تھے پسِ چادر کیا خوب

قابلِ دید تھی گرمی میں پسینے کی بہار
تر ہوا ہے عرقِ حسن سے بستر کیا خوب

بن گئی ہے بدلِ گردشِ گردوں ساقی
آج محفل میں تری گردشِ ساغر کیا خوب

داستانِ عاشقی کا آخری منظر ملاحظہ ہو جس میں حسن شرابی کی ادائیں اور شوقِ بے محابا کی گستاخ دستیاں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نظر آتی ہیں ؎

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسنِ شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
عشرت کی شب کا وہ دور آخر — نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت ان کی وہ نیم خوابی

بزمِ طرب ہے وہ بزم کیوں ہو | ہم غمزدوں کو واں باریابی
اُس نازنیں نے باوصفِ عصمت | کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوقِ اپنی بھولا گستاخ دستی | دل ساری شوخی حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی | ہیں وصف جس کے سارے کتابی

خیال تھا کہ مقصد برآری کے بعد عاشق اطمینان کی نیند سوئے گا لیکن یہ سارا ماجرا فریب نظر ثابت ہوا ؎

وصل میں بھی نہ ہوئی وجہ سکوں کثرتِ شوق
ڈھونڈ لیتا ہے بہانے دلِ مضطر کیا خوب

پھر عاشق کو یہ بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ وصل زوالِ شوق کا سبب نہ بن جائے غرض دل کو چین نہ ہجر و محرومی میں ہے اور نہ مقصد برآری میں۔ اضطراب اور بے تابی زندگی کے ساتھ ہیں۔ جب تک جان ہے اس وقت تک ان سے چھٹکارا نہیں یہی غم آرزو محبت کے نت نئے جادو جگاتا ہے ؎

دل طالبِ وصال ہے بے شک مگر کہیں
حسرت یہی عروج نہ ٹھہرے زوالِ شوق

غالب نے بھی وصل میں زوالِ شوق کے خیال کو اپنے خاص انداز میں ادا کیا ہے اور کنائے کی مدد سے رمزی کیفیت کا ایک سماں باندھ دیا ہے۔ ان کے یہاں وصل عشق و محبت کا معنی رمز ہے جس کا دل متلاشی رہتا ہے۔ خواہش اور تمنا برابر نئے جادو جگاتی رہتی ہے۔ حسن پر چونکہ ہمیں تصرف حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اس تک پہنچنے کی تمنا دل میں چٹکیاں لیتی ہے جسے وصل کہتے ہیں۔ لیکن اگر تصرف حاصل ہو جائے، تو نئی خواہشیں جنم لیتی ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ محبوب میں وہ اوصاف موجود نہیں جن کی دل کو تلاش تھی۔ غرضکہ وصل کے بعد رازِ حسن کی تلاش از سرِ نو شروع ہو جاتی ہے لیکن غالب

اس نفسیاتی حقیقت کے خلاف محبوب کو یقین دلاتے ہیں کہ وصل کے بعد بھی میرے شوق کی شدت وہی باقی رہے گی جو وصل سے پہلے تھی۔ اگر تیرے دل میں اس باب میں کوئی شبہ ہے تو آزمائش کرکے دیکھ لے۔ موج کی مثال سے شاعر نے اپنی خواہش کی صداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ باوجود بحر سے ہم آغوش ہونے کے بے تاب اور مضطر رہتی ہے ؎

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اسی مضمون کو فارسی میں بھی ادا کیا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ وصل میں شوق کی بیقراری اور بڑھ جاتی ہے۔ اور ثبوت میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ بلبل کو چمن میں اور پروانے کو شمع کے قریب دیکھو کیسے بے قرار رہتے ہیں ؎

بلبل بہ چمن بنگر و پروانہ بہ محفل شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

اسی مضمون کو اس طرح بھی بیان کیا ہے کہ وصل کے بعد حریص دل کا شوق اور زیادہ ہو جاتا ہے تو اس میں جھاگ اوپر آنے لگتا ہے جو اس کی تشنہ لبی پر دلالت کرتے ہیں ؎ ہو اوصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ

لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے (نسخہ حمیدیہ)

ایک اور جگہ وصال کے مضمون میں غالبؔ نے عجیب ندرت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عاشق پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جب کہ وصل داخلی تجربے اور تخیلی لطف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کیفیت میں اس اُلجھن کی آمیزش ضرور ہوتی ہے کہ اگر وصل میسر نہ ہوا تو کہاں جائیں گے اور اگر ہوگا تو کیوں کر ہوگا اس اُلجھن میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

اس کے برخلاف داغؔ کے یہاں وصل کے تصور میں حسّی تجربے اور خارجیت کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

شبِ وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا
"وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے"

غمِ عشق

عشق اور موت شاعری کے دائمی موضوع ہیں۔ ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی پراسرار حقیقت نہیں۔ عاشقانہ شاعری کو آپ درد و الم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ سکتے۔ عشق کا خاصہ جذبۂ غم ہے جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس کے لئے غم سہے جاتے ہیں کہ بغیر اس کے اخلاص مشتبہ رہے گا۔ عشق بغیر غم کے عنصر کے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ بغیر ادراکِ غم خود انسانی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ غم کی دھیمی آنچ میں سلگنے سے شخصیت کے جوہر نکھرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں غم کے عناصر ایسے پیوست ہیں کہ انہیں اس سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ خوشی اور مسرت کے گریزپا لمحوں کی یادیں جلد فراموش ہو جاتی ہیں لیکن غم کی یاد دل سے کبھی نہیں جاتی۔ اس کے نقوش ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ زمانے کے ہاتھ سے بڑی مشکل سے بھرتے ہیں۔

؎ بقول حافظ شیرازی ؎

دوامِ عیش و تنعم نہ شیوۂ عشق است | اگر معاشر ماؤئی بنوش جامِ غمے

اسی خیال کو نظیری نے یوں ادا کیا ہے ؎

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

غزل میں جذبۂ غم وہی حیثیت رکھتا ہے جو مغربی ادب میں ٹریجڈی (المیہ) کو حاصل ہے ہر زبان کے ادب میں المیہ ہی کا مرتبہ آپ بلند پائیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم زندگی کی ایک اساسی شے ہے۔ زندگی کی یہ کوشش کہ اپنی تکمیل اور تخلیق کی راہ پر گامزن ہو اپنے جلو میں غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتی ہے۔ انسان کا یہ احساس کہ زندگی کی ابھی تکمیل باقی ہے۔ بجائے خود غم آگیں ہے۔ پھر ہر قسم کی سعی و جہد جو اس راہ میں کی جاتی ہے الم انگیز ہوتی ہے۔ زندگی کچھ عجیب سی چیز ہے۔ جتنا اس معمے کو بوجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اتنا ہی وہ اُلجھ جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُلجھاؤ کبھی سلجھنے والا نہیں۔ اس واسطے کہ زندگی کا منشا ہی یہ ہے کہ یہ کبھی نہ سلجھے۔ اگر سلجھ جائے تو زندگی اپنی قوت محرکہ سے محروم ہو جائے گی جو منشائے قدرت کے خلاف ہے اس قسم کا الجھاؤ ہر ملک کے اعلیٰ ادب یا شعر میں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کے ہر دور میں زندگی کا کوئی ایسا محرک اصول رہا ہے جو اس کی ٹریجڈی کا ماخذ ہوتا ہے اور جس سے ادب میں حسن اور دل فریبی پیدا ہوتی ہے میرؔ و غالبؔ کے یہاں یہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی ٹریجڈی تھی جس نے پرانی قدروں کو تہس نہس کر ڈالا۔ فانیؔ اور اُردو کے جدید شاعروں کی یاسیت میں عہدِ جدید کے ہندوستانی مسلمان کی ٹریجڈی پیش کی گئی ہے۔ جو یہ نہیں جانتا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ — اُس کا غم، اس کے ارادے اور نصب العین اُس کی زندگی کے المیہ (ٹریجڈی) کے آئینہ دار ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ المیہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ انسانی آزادی اپنا وجود رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ انسان اپنی ذات کے تحقق کے بغیر زندگی کی پہیلی نہیں بوجھ سکتا۔ یہ عرفانِ ذات آرٹ کا اور خاص طور پر شعر کے آرٹ کا زبردست محرک بن جاتا ہے۔

انسان کی طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ غم سے بیزار ہو کر مسرت کی

منزل کی طرف رواں دواں جاتا ہے۔ جب وہاں پہنچ جاتا ہے تو کچھ کمی اور تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اور کچھ دنوں میں وہی مسرت جس کا وہ دل و جان سے خواہاں تھا، اجیرن ہو جاتی ہے۔ ایک قسم کی بیزاری اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے اسباب اکثر اوقات نامعلوم ہوتے ہیں۔ تمنا نئی منزلوں کے خواب دکھانے لگتی ہے۔ حاصل شدہ مسرت ایک زنداں بن جاتی ہے۔ جس سے رہائی کے لئے دل بیتاب ہوتا ہے۔ دستِ جنوں اس زنداں کی زنجیریں کھڑکھڑاتا ہے اور از سرِ نو تمنا کی وادیوں میں دشت نوردی شروع ہو جاتی ہے ؎

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے

مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے (ذوق)

سوزِ آرزو کی نیرنگیاں نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بقول میر آثر ؎

کلیجا پک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے

ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام رہتا ہے

غم آرٹ کی تخلیق کا زبردست محرک ہے اور اس طرح وہ ایک خاص لطف کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اس کو اگر کوئی چاہے تو نشاطِ غم سے تعبیر کر سکتا ہے۔ ہر کس و ناکس اس نعمت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ یہ اسی کا حق ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہے بقول مصحفی ؎

دردو غم کو بھی ہے نصیبہ شرط   یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم کی حالت میں انسان کو اپنے وجود کا شعوری احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے جیسا مسرت کی حالت میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس آگہی کی شدت میں ایک قسم کا لطف ہوتا ہے۔ درد کی لہریں رگ و پے میں ایسی سرایت کر جاتی ہیں کہ ان سے پوری روح حرکت میں آجاتی ہے۔ آنسوؤں کی بدولت ہم یہ محسوس

کرتے ہیں کہ ہم وجود رکھتے ہیں، ہم زندہ ہیں اور یہ احساس بجائے خود حسرت آگیں ہے اس طرح اگر دیکھا جائے تو غم اور مسرت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ درد و کرب کی حالت میں ہم احساس کو جذبے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے احساس اور جذبہ الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ایک دوسرے میں ایسے گڈمڈ ہوتے ہیں کہ نفسیاتی طور پر انہیں علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ احساس جب تک جذبے کا جزو نہ بن جائے اس وقت تک وہ آرٹ کی تخلیق کا محرک نہیں بن سکتا۔

کائنات کی تخلیق کے منصوبے میں معلوم ہوتا ہے مسرت کو شامل نہیں کیا گیا جسے ہم مسرت کہتے ہیں، وہ عارضی تشفی ہوتی ہے۔ جس کی مقدار اگر ذرا زیادہ ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ ہم اس میں مسرت محسوس کرتے ہیں کہ جن ضرورتوں کی شدت ہے اُن کی تکمیل ہو جائے اور بس لمحہ بھر کے لئے ہم خوش ہو جائیں۔ ہماری خلقت کچھ ایسی ہے کہ ہم تضادوں سے خوش ہوتے ہیں نہ کہ مستقل کیفیتوں سے۔ غرض کہ مسرت کے امکانات زندگی میں بہت محدود ہیں برخلاف اس کے غم زندگی کے تانے بانے میں سمویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انسان اسی کو غنیمت سمجھتا ہے کہ وہ غم کی مار سے بچ جائے مسرت نہیں ملتی نہ ملے۔ لیکن وہ نہیں بچ سکتا۔ خود اس کا وجود اسے غم دیتا ہے اس کا جسم اور دماغ قدرتی طور پر زوال اور فنا کی طرف مائل ہیں۔ فطرت اسے کوفت پہنچاتی ہے۔ سماج اسے کچھ کے دیتا ہے جو اس کے غموں کا سب سے بڑا ماخذ ہے اور جس سے اس کو مفر نہیں۔

قدماء میں میر تقی میر نے اپنے کلام میں درد و الم اور ناکامی اور مایوسی کی جھلکیاں دکھائیں اور اس سلیقے سے دکھائیں کہ اُن کی نظیر آج تک نہ پیدا ہوئی۔ میر کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے جس کی تاثیر کی کوئی حد نہیں۔ وہ دل پر خوں کے ایک جام ہے

عمر بھر مدہوش رہے۔ اُن کی مدہوشی غمِ زیست کی مدہوشی ہے۔

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُرخوں کی اک گلابی سے

اُن کے نزدیک چمن حیات کا ہر گل لہو سے بھرا ہوا ساغر ہے۔

یہ عیش گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

میرؔ صاحب کا کلام غمِ عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا ہے۔ اسی لئے اس میں بے پناہ تاثیر ہے۔ انہوں نے جس غم کا ذکر کیا ہے وہ زندگی کی اساسی حقیقت ہے اس کے بغیر انسانی سیرت نہیں بن سکتی اور اُس کی پوشیدہ قوتیں اور صلاحیتیں نہیں اُبھر سکتیں۔ عشق کی آگ میں جب جذبات تپائے جاتے ہیں تو اُن میں نکھار پیدا ہوتا ہے میرؔ صاحب کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ وہ مجاز سے بہت کم آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے چونکہ اُن کے جذبات اصلی ہیں۔ اس لئے عشق کی وارداتوں کی مصوری میں فطری سوز اور درد پیدا ہو گیا ہے۔ انسانی عشق و محبت کی کسک نے انہیں صاحبِ نظر بنا دیا اور ان کی ہر بات میں گہرائی پیدا کر دی۔ اُن کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی

کروں جو آہ زمین و زمان جل جائے
سپہرِ نیلی کا یہ سائبان جل جائے
نہ بول میرؔ سے مظلومِ عشق ہے وہ غریب
اگر وہ آہ کرے سب جہان جل جائے

کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ
آخر آخر میرؔ سر بر آستاں مارا گیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
غم کے جانے کا نہایت غم رہا

قائل ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

بہ جو چشمِ پُرآب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

عالم عالم عشق و جنوں دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

صبح سے آنسو نومیدانہ جیسے داعی آتا تھا
آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے

دل جاوے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے
اب ہم تو چلے یاں سے تو رہ جو رہا چاہے

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

منعِ گریہ نہ کر تو اے ناصح
اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

عہدِ جدید کے شاعروں میں فانیؔ نے غم کے مضمون کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اسی کا ہو گیا۔ اُن کی شاعری کا مرکزی تاثر غم کا تاثر ہے۔ میرؔ کے غم اور فانیؔ کے غم میں فرق ہے میرؔ کا غم ایک انفرادی تجربے کا بیان ہے۔ برخلاف اس کے فانیؔ کے یہاں غم جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اُن کا سارا نظامِ تصوّراتِ غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس پر کائنات کے حقائق کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ رنج و الم سے حواس و ادراک میں ایسی تیزی اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کی مدد سے انسان کو زندگی کی حقیقت کا پتہ چل جاتا ہے جس کی تہ تک مسرت نہیں پہنچ سکتی۔ میرؔ نے غم

کے جن خیالات کو انتہائی سادگی سے بیان کیا انہیں فانیؔ فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ فانیؔ نے غم کی پرورش کی تاکہ اس سے لطف اندوز ہوں۔ انہیں غم میں ایک طرح کی لذت محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لذت الم اور عیش غم کے جویا رہے۔ اُن کی یاس غیر مخلوط یاس ہے جس میں کسی قسم کی امید اور کامیابی کی آمیزش نہیں۔ انہیں ہر تبسم پردہ دار غم نظر آتا ہے۔ اُن کے ہاں غم کا تصور اور غم کا احساس دونوں خالص رنگ میں ہیں۔

ہر تبسم پردہ دار غم نظر آیا مجھے
گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

اس میں شبہ نہیں کہ غم زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ اگر آرٹ کے ذریعہ حیاتِ اجتماعی میں اس کی قدر حد سے زیادہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ جماعت کی عملی صلاحیتوں پر اس کا بُرا اثر پڑے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر کسی جماعت کے افراد غم اور دردمندی کے احساس سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری جماعت کا تحت شعور متاثر ہوگا۔ اور وہ بے رحمی کے ایسے وسائل دریافت کرے گی جو دوسروں کو بھی مبتلائے غم کریں اور خود اُس کو بھی۔ مثلاً جنگ کے ذریعے غم کی ضرورت کی تکمیل کی جائے گی۔ جب دل غم کی لطیف کسک سے آشنا نہیں ہوتا تو وہ بے رحمی پر اتر آتا ہے۔ اور دوسروں کو مبتلائے غم کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اس لئے آرٹ میں غم کے عنصرِ حیات کو اس طرح پیش کرنا چاہیئے کہ جذبات کی تہذیب ہو سکے۔ فانیؔ نے غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا ہے جو یقیناً قابل قدر ہے۔

فانیؔ نے غم کو نیا مزاج دیا اور اسے نئے آداب سکھائے۔ اُنہوں نے زندگی کو غم سے ہم آہنگ کر دیا۔ غم کی ہر ادا میں انہیں نئی کیفیتیں محسوس ہوئیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کا عرفان غم مستقل طور پر لذتِ فنا سے فیضیاب ہے۔ امیرؔ اور داغؔ کی شوخ نگاریوں کے بعد فانیؔ کا ترانۂ غم تکملہ کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن بعض جگہ انہوں نے

احساسِ غم میں اتنا غلو برتا کہ کلام کی شعریت مجروح ہو گئی۔ زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، آہ و نالہ بھی ہے اور تبسم اور قہقہے بھی، ناکامیاں بھی ہیں اور کامرانیاں بھی۔ ع

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

فانؔی نے موت میں جو غم کا منتہا ہے کمال بینی کی تصویر دیکھی اور اس تصویر کے بنانے سنوارنے میں انہوں نے ایسے تیز رنگ استعمال کئے کہ بعض دفعہ ذوقِ شعری پر گراں گزرتے ہیں۔ جب کوئی مضمون رمز و ایما کی حد سے باہر نکل جائے اور سامع کو یہ خیال ہونے لگے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے اُس سے مادّوں کو تازہ کرنا مقصود نہیں بلکہ بعض تصوّروں کے متعلق مطلع کرنا ہے تو وہ بالکل دوسرے نقطۂ نظر سے شعر کو جانچتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موت ایک زبردست شعری محرّک ہے۔ لیکن اگر کفن اور جنازے سے واقعی کفن اور جنازہ مراد ہو تو اس اندازِ بیان سے لازم ہے کہ ایک قسم کی کراہت پیدا ہو۔ مثلاً ان شعروں کی شعریت میں مجھے کلام ہے۔ یہ کسی اعلیٰ درجے کی غزل کے شعر نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ انہیں سن کر ذہن رمزی کیفیت کے بجائے امرِ واقعہ کی طرف رجوع ہوتا ہے جو دلآویز نہیں ہے۔

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانؔی دیکھتے جاؤ — تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میّت پر — اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

وہ اُدھر رُخ اِدھر ہے میّت کا — لوگ فانؔی کو قبلہ رو تو کریں

داغؔ اگرچہ عام طور پر خوش باشی اور لذت پرستی کا علمبردار ہے لیکن تبرّکاً کہیں کہیں

غم کا مضمون بھی باندھا جاتا ہے۔ ایک جگہ موت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ عبرت کی بجائے کراہت ہوتی ہے ؎

میت پہ میری آ کے دل اُن کا دہل گیا
تعظیم کو جو لاش مری اٹھ کھڑی ہوئی

چاہے کسی کے احترام کے لئے ہی کیوں نہ ہو لیکن لاش کا کھڑا ہو جانا ایسا مضمون نہیں جسے غزل میں برتا جا سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر رمز و ایما کی کوئی کیفیت نہیں پیدا کر سکا۔ سامع کو اس قسم کا شعر سُن کر معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی لاش کو کھڑا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے جو یقیناً ایک کریہہ منظر ہے۔ اسی مضمون کا ماہرؔ لکھنوی کا بھی شعر ہے ؎

ماہرؔ یہ کس ادا سے وہ شانہ ہلا گئے	یوں دل ہلا کہ قبر میں لاشہ ہلا گیا

امیرؔ کہتے ہیں کہ چونکہ مرنے کے بعد کوئی یاد نہیں کرتا اس واسطے مردے کو مزار میں ہچکی نہیں آتی۔ مضمون میں مریضانہ افسردگی کے سوا کچھ نہیں ؎

کسی کو یادِ پسِ مرگ کون کرتا ہے
کبھی نہ مُردے کو ہچکی مزار میں آئی

مندرجہ ذیل شعر میں لاش کا پھولا نہ سمانا محاورے کے باوجود اپنے اندر کراہت رکھتا ہے۔ لاش کے ساتھ پھولنے کا لفظ لانا کبھی بھی دلآویز نہیں ہو سکتا ؎

لاش پھولی نہ سمائے گی مری تربت میں
کوچۂ یار میں گڑنے کی اگر جا پائے	(امیرؔ)

فانیؔ کے شعر میں جو کفن سرکانے کا مضمون ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ لیکن ویسے فانیؔ کے یہاں غم کے متعلق بے نظیر حکیمانہ اشعار ملتے ہیں جو تغزل میں اچھی طرح کھپتے ہیں۔ انہیں سُن کر سامع کے ذہن میں غم کا وہ تصور آتا ہے جو اس وقت

پیدا ہوتا ہے جب کہ انسان اپنے مقدر سے جنگ آزما ہو۔ یہ غم زندگی کا تخلیقی عنصر اور ان میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان اشعار پر ہمارا ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؂

تو نے کرم کیا تو بہ عنوان رنج زیست
غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا
آزردہ تھا کہ ضبط فغاں میں اثر نہیں
شرمندہ ہوں کہ ضبط فغاں رائیگاں نہ تھا

مرے شکوے سپاس غم کی لے میں دل سے اٹھے تھے
فغاں کو میں نے آہنگِ طرب کا ہم نوا پایا

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر
نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر
بڑھتا ہے گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

غم خانۂ دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں
سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں
گو راحت و رنج میں فرق نہیں یہ فرق مراتب کیا کم ہے
جو سعی حصولِ عیش میں ہے وہ عیشِ غمِ حاصل میں نہیں
جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اجل ہے آگے بڑھ
منزل کا نشاں ہے ہر منزل آرام کسی منزل میں نہیں
ہم بھی ہوں خیالِ یار بھی ہو اس فکرِ محال سے کیا حاصل
بس اے فانی اب ہم ہی نہیں یا کوئی ہمارے دل میں نہیں

فانیؔ کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی ہے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

آ گئی ہے ترے بیمار کے منہ پر رونق جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

زبانِ حال ٹھہر داستانِ عشق نہ چھیڑ کہ خوابِ مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

غم کے بھڑکتے شعلوں سے جب جل کے کلیجہ خاک ہوا
داغِ وجودِ حسرت سے تب دل کا دامن پاک ہوا

میرے سوا تھے اور جو پردے سائے کے سائے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دم میں چاک ہوا

یہ غزل فانیؔ کی ہمیشہ زندہ رہنے والی غزلوں میں سے ہے

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

اس شعر کی بلاغت اور طلسمی رمزیت بیان نہیں کی جا سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقاشِ نے اپنے موقلم کی خفیف سی کشش سے جہانِ معنی پیدا کر دیا ہے۔ کچھ باتیں کہی گئی ہیں اور کچھ دیدہ و دانستہ نہیں کہی گئیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جو باتیں کہی گئی ہیں اُن میں لطافت زیادہ ہے یا اُن میں جو اَن کہی چھوڑ دی گئیں۔ ایک زنداں کا منظر پیشِ نظر ہے۔ کوئی قید و بند میں مبتلا اس پر غور کر رہا ہے کہ آخر درِ زنداں کھلنے کی کیا وجہ ہے؟ کیا موسمِ گل آ گیا یا اجل کی آمد آمد ہے؟ کیا کسی قیدی کو چھوڑا جا رہا ہے یا کسی نو گرفتار

کا خیر مقدم مقصود ہے ؛ جو مطالب اس میں حذف کئے گئے ہیں اور وہ جو بیان کئے گئے ہیں ان دونوں کا مجموعی اثر تغزل کی اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔ اس غزل کے باقی شعر بھی نہایت بلند ہیں ؎

پوچھئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ! ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانیؔ نے اپنے مخصوص انداز میں عشق و حسن کے معاملات اور زندگی کے اسرار بیان کئے ہیں جن کی تشریح وہ غم ہی کی زبان سے کرتے ہیں۔ ان کے خیالات فرضی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہیں۔ اس لئے ادب ہمیشہ ان کی قدر کرے گا۔ وہ بھی جو اُن کے یاس و قنوطیت کے رجحان کو زندگی کی مکمل توجیہ نہیں سمجھتے ان کے کلام کی تاثیر، متانت اور اصلیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شعر محسوس کر کے لکھتے ہیں۔ اور اُن کے احساس و تاثر میں ایک خاص قسم کی گہرائی تھی جسے تحفۂ غم سمجھنا چاہئے۔

زندگی کی کیا خوب توجیہ کی ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ایک تو خواب اور وہ بھی ایک دیوانے کا خواب۔ رمز و ایما کی انتہائی کیفیات ان چند لفظوں میں موجود ہیں۔ دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

محبت کی ایک کیفیت اس شعر میں کیا خوب بیان کی ہے ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

بعض دفعہ رندمشرب جگر بھی ایسی پتے کی بات کہہ جاتا ہے کہ انسان پر ایک قسم کی حیرت سی طاری ہو جاتی ہے۔ آنسوؤں کے خشک ہونے کے مضمون کو ادا کیا ہے ؎

اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا   رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

اس شعر کا ایک ایک لفظ اثر و بلاغت میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق کی تلافی مافات کا تصور بالکل نیا ہے اور اس خیال میں کتنی حسرتیں پوشیدہ ہیں کہ جب آنسو خشک ہو گئے تو رونے کی تمنا پیدا ہوئی۔ جو حصہ حذف ہے یعنی یہ کہ جب آنکھوں میں آنسو تھے، تو اُن کی پوری طرح قدر نہیں ہوئی، کس قدر لطیف اور باکیف ہے۔

اسی مضمون کو غالبؔ نے بھی ادا کیا ہے۔ لیکن جگر کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ زبان کے لحاظ سے بھی اور ایمائی کیفیت کے لحاظ سے بھی۔

غالبؔ کا شعر ہے ؎

غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی   (نسخہ حمیدیہ)

جگرؔ کے شعر کا مضمون داغؔ کے یہاں دوسرے پیرائے میں ملتا ہے ؎

جب پاؤں تھکے تو جستجو کی   جب دل نہ رہا تو آرزو کی

غم کو بحیثیت ایک ادبی اور جمالیاتی قدر کے ہمارے دوسرے غزل گو شاعروں نے بھی برتا ہے۔ غالبؔ نے حسن کے لئے سوز و گداز کو ضروری بتایا ہے اس کے نزدیک کلام میں اس وقت تک اثر نہیں پیدا ہو سکتا جب تک کہ کہنے والے کا دل غم کی لذت سے آشنا نہ ہو ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ایک جگہ اپنی غزل سرائی کی اس طرح توجیہ کی ہے ؎

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی

ہوسِ غزل سرائی تپشِ فسانہ خوانی

...یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ

کرے دل خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

غالبؔ نے غم کی حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے کلام میں اُسے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ لیکن وہ ہر وقت اور موقع بے موقع ماتم کناں نہیں نظر آتا۔ اس کا غم ضبط کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ زندگی میں غم کی اساسی حقیقت کو اس شعر میں کس خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی

دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

بہار کو موسمِ خزاں کے پاؤں کی مہندی کہا جس کا رنگ بہت جلد غائب ہو جاتا ہے۔ دنیا کا عیش بھی رنگِ حنا کی طرح نمائشی اور عارضی ہے۔ اس طرح زندگی اصلی حقیقت غم ٹھہرتا ہے۔

لہ فارسی میں ایک جگہ اس کے بالکل برعکس کہا ہے کہ زندگی کے طوفانِ بہار کے آگے خزاں کو زک کھانی پڑتی ہے۔ اس شعر میں غالبؔ کا لب و لہجہ وہی ہے جو عزمِ حیات کے معلّم کا ہونا چاہیے ؎

پیمانہ رنگیست درین بزم بہ گردش

ہستی ہمہ طوفانِ بہار است خزاں ہیچ

دوسری جگہ زندگی اور غم کو ایک ہی چیز بتایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم، غم عشق ہے، جو زندگی کا جزو کی عنصر ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو ساری کائنات کے غم میں شریک کر لیتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ایک موقع پر کہا ہے کہ غمِ دل کے مکتب میں انسان ہمیشہ سبق لیتا رہتا ہے اور ہمیشہ اس کی حیثیت ایک مبتدی کی رہتی ہے۔ اس طرح کہ غم کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی برخلاف اس کے عیش و فراغت کی انتہا پر انسان بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور اسی لیے اتنا ہی جلد اکتا جاتا ہے۔

بیٹھا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا"

غالب کے یہاں غم مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے کہیں غم روزگار کی اور کہیں غم عشق کی اور کبھی دائمی تمنا اور انتظار کی۔ غمِ عشق کی بدولت غم روزگار سے بآسانی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اسی غمِ عشق سے زیست کا مزا ملتا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

غم عشق کا چسکا ایک دفعہ پڑنے کے بعد چھٹتا نہیں۔ اس کے انداز جنوں سے دل بصیرت اندوز ہوتا ہے اور پھر اس کے آگے کسی دوسرے کی نہیں مانتا۔

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

عشق و محبت میں زندگی ایک دائمی مہجوری کی کیفیت بن جاتی ہے اور

اس فراق اور محرومی کی حالت میں دل کو سیر گلشن کی تاب نہیں رہتی ؎

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

اس احساس مجبوری کا سبب محرمیٔ حسن کی تڑپ ہے۔ اس جستجو میں انسان ہمہ تن چشم شوق بن جاتا ہے ؎

ہنوز محرمیٔ حسن کو تڑپتا ہوں — کرے ہے ہر بُن مو کام چشم بینا کا

حسن کی نارسائیاں تمنا کی آگ کو بھڑکاتی ہیں۔ یہاں تک کہ عشق میں ایک ایسا مقام آتا ہے کہ عاشق حسن محبوب سے بے نیاز ہو کر تمنا کی خاطر تمنا کرتا ہے۔ تمنا، تمنا کی خاطر، اچھوتا مضمون ہے، جو صرف غالب کے یہاں ملتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے مطلب ہی بر آئے

اصل مقصد حسرت وغم کی لذت ہے۔ دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے آئینہ خانہ مراد لیتے ہیں اور پھر مدعائے محروم کو اس کی سیر کراتے ہیں ؎

مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

تمنا حیرت کا روپ بھر کر کسی کے جلوے کے لئے انتظار کی گھڑیاں جھیلتی ہے

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

اس غزل کے ایک اور شعر میں کہتے ہیں کہ محبوب کے وعدے کا احترام اسی شکل میں ممکن ہے کہ باوجود اس یقین کے کہ وہ نہ آئے گا ہم برابر اس کا انتظار کئے جائیں جس طرح تمنا، تمنا کی خاطر تھی، اب انتظار، انتظار کی خاطر ہے ؎

کیا پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

تمنا، حسرت اور انتظار یہ سب غم کی شاخیں ہیں جن کے ذکر سے غالب کا کلام بھرا پڑا ہے۔ غالب کے غم میں غم کی اصلی حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔ جس کا منتہا موت

ہے —— جو ایک زبردست شعری محرک ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

فانیؔ نے جسے "مر مر کے جئے جانا" کہا ہے اسے غالبؔ نے ذوقِ فنا کی ناتمامی سے تعبیر کیا ہے ؎

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے ؎

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

مومنؔ نے غم کی ناتمامی کے مضمون کو اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک غم ختم نہیں ہونے پاتا کہ دوسرے غم کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ گویا ہر بار عشق کا سبق از سرِ نو پڑھا جاتا ہے اور انتہائے عشق کی نوبت نہیں آتی جو موت سے عبارت ہے۔ شعر ہے ؎

مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

ایک جگہ غالبؔ نے اپنے داغِ ناتمامی کو اس شمع کی تشبیہ و رعایت سے بیان کیا ہے جسے کسی نے بجھا دیا ہو اور اُسے پورا جلنے کا موقع نہ ملا ہو ؎

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

دوسری جگہ پھر شمع ہی کے استعارے کو لے کر کہتے ہیں کہ غم کی فطرت ہے کہ وہ جانگداز ہو۔ دوسروں کی غم خواری سے اس کی یہ فطرت نہیں بدل سکتی ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

لیکن ذوقِ فنا کی ناتمامی خود حیات کا اقتضا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر غمِ زیست کیسے حاصل ہو؟ اور اگر غمِ زیست نہ ہو تو تمنا کی رنگینیاں کیسے جلوہ افروز ہوں؟ نفسِ شعلہ بار کی ناتمامی کے ذکر کے ساتھ اس کو زندگی کے ساتھ کس خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے ؎

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

وہی نالے جو عالمِ ازل میں کھینچے جاتے وہ وہاں نہ کھینچے جا سکے تو دنیا میں سانس بن گئے۔ اس طرح زندگی کی بنا غم و الم ٹھہرتے ہیں۔

کبھی عاشق پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ فرطِ غم سے اس کو اپنے وجود کا اعتبار باقی نہیں رہتا ؎

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا   کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

موت اور کفن کے مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

زندگی کی عام نامرادیوں کے مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دونوں شعر غمِ حیات کی لطیف تمثیل ہوں ؎

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا   زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی   میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

غمِ عشق کی خاصیت ویران سازی ہے لیکن اسی سے زندگی کی رونق ہے۔ اگر کسی خرمن میں برق نہ ہو تو اس کی مثال اس بزم کی سی ہوگی جس میں شمع نہ ہو۔ اس طرح عشق کے سوز و گداز اور غم و اندوہ کے بغیر زندگی بے مصرف ہے ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ان اشعار میں بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے ۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغِ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

غالبؔ کا تصورِ غم فانیؔ کے تصورِ غم سے مختلف ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالبؔ بھی اس کے قائل ہیں کہ زندگی کی اساسی حقیقت غم ہے ۔ لیکن اُن کے نزدیک اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جو پُر مسرت اور جاذبِ نظر ہیں ۔ اور جن میں اتنی کشش ہے کہ وہ غم کے احساس کو بھی بھلا دیتے ہیں ۔ چاہے وہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ ہو ۔ غم اور نا امیدی کی تاریکی میں بھی غالبؔ کی حقیقت نگر آنکھ نے امید کی کرن دیکھی کہ یہی انسانی زندگی کی ضامن ہے ۔ چنانچہ زندگی کے پُر امید اور نشاط انگیز گوشوں پر اُس کی نظر گئی اور اس نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جس کا اظہار اس شعر میں بڑی خوبی سے کیا ہے ۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالقِ فطرت نے جب دیکھا کہ انسان اپنی انفرادیت کے خول میں ایسا بند ہے کہ اس سے باہر آنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تو اُس نے انسانی دل کو غمِ عشق کی کسک سے آشنا کر دیا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خودی اپنے آپ میں گھٹ کر فنا ہو جاتی ۔ غمِ عشق بھی فنا (ٹریجڈی) کی طرف لے جانا چاہتا ہے اور لے جاتا ہے ۔ اگر اس پر مذہب و اخلاق کی بندشیں نہ عائد ہوں جن کے بطن سے تہذیب جنم لیتی ہے ۔ غالبؔ کا اوپر کا شعر ہمیں عالمِ تہذیب کی سیر کراتا ہے ۔ وہ کہتا ہے

یہ سچ ہے کہ میں سراپا درد عشق ہوں لیکن اس کے ساتھ میری فطرت میں زندگی سے الفت ودیعت ہے۔ غمِ عشق کا منتہا چاہے موت اور ٹریجڈی ہو۔ لیکن باوجود اس کے زندگی کی گہرائیوں میں سے کوئی سرگوشیاں کرتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تیرا مقدر فنا نہیں بقا ہے۔ زندگی کی یہ عجیب و غریب اور پر اسرار کشمکش ہے کہ وہ ایک طرف تو برق کی پرستش کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حاصل حیات کو سینت سینت کر اور بچا بچا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اس احساس نے غالب کو امید پرست بنا دیا جو باوجود غمِ عشق کی حقیقت کو ماننے کے زندگی کے خوشگوار اور پرمسرت تجربوں کی بھی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی قدر کریں۔ غم و مسرت کی دھوپ چھاؤں جس سے انسانی زندگی عبارت ہے، کائنات ہستی کا ایک طلسمی رمز ہے۔ اگر غم و مسرت ایک دوسرے کے پہلو میں موجود نہ ہیں تو زندگی کی حقیقت سادہ اور یک طرفہ ہو جائے۔ غالب کا زندگی اور آرٹ کا یہ نقطۂ نظر حقیقت پر زیادہ حاوی اور صحت مند ہے۔ اس کو غم کی تاریکی میں بھی امید کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں کہ یہی حاصل حیات ہیں۔

عہد جدید کے شاعروں میں حسرتؔ رجائیت پسند ہیں لیکن لذتِ آزار سے وہ بھی بالکل بیگانہ نہیں۔ اُن کی پُرامیدی کی تہ میں سوز و گداز اور دردمندی کی جھلکیاں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہیں جن سے ان کے تغزل کے اثر و آہنگ کا پتہ چلتا ہے کہتے ہیں ؎

ہوتا ہے بُرا لذتِ آزار کا چسکا — مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرتؔ — یہ کشمکشِ غم تجھے بیکار نہ کر دے

عشق کی رُوحِ پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر — اپنی جفا کو یاد کر، میری وفا کو یاد کر
جان کو محوِ غم بنا، دل کو وفا نہاد کر — بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

جگرؔ کے غم والم میں بھی رنگینی ہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

رنگینیٔ الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر اے دل وہی تو جلوے سرمایۂ نظر ہیں

غزل گو شاعر عاشق ہوتا ہے اور عاشق کی ہر بات دنیا والوں سے الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر انداز نرالا اور اس کی ہر شان میں انوکھا پن ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر نہیں چلتا بلکہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے۔ چاہے وہ سیدھی ہو یا ٹیڑھی اس سے اُسے بحث نہیں۔ اگر ٹیڑھی ہے تو ہوا کرے۔ اس کو یہ اطمینان کافی ہے کہ اگر وہ بھٹکے گا تو بھی اپنی ہی راہ پر بھٹکے گا۔ اس کی اصل منزل تو خود اس کا اپنا دل ہے جس تک اس کی رسائی رہنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ دوسرے غم سے گھبراتے ہیں لیکن عاشق غم کی پرورش کرتا ہے۔ لذّت الم اس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے جس کی وہ چھپا چھپا کر حفاظت کرتا ہے۔ کبھی یہ لذّت الم دائمی حسرت کا رُوپ اختیار کرتی ہے جو تخیّل کے لئے زبردست محرک بن جاتی ہے اور اس کی بدولت آرٹ کی تخلیق جلوہ گر ہوتی ہے۔

دنیا والوں کا قاعدہ ہے کہ رنج والم اور مصیبت کو دُور کرنے کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ دُعا مانگو تاکہ تمہاری احتیاج پوری کی جائے۔ اگر شدّتِ خلوص سے کوئی چیز طلب کی جائے تو ضرور ہے کہ وہ حاصل ہو۔ عاشق کہتا ہے کہ دعا مانگوں گا تو ایک طرح کی شکایت ہوگی۔ مذہب کہتا ہے کہ دُعا سے بہت سی آنے والی بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ میں تو بلاؤں کو دعوت دیتا ہوں۔ ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب تک کہ غمِ زیست کی خلش نہ ہو زندگی کس کام کی؟ وہ زاہدِ ناداں کو اس طرح خطاب کرتا ہے ؎

نہ مانگ زاہدِ ناداں ذرا سمجھ تو سہی
شکایتیں ہیں یہ کس کی دُعا کے پردے میں (دائمؔ دہلوی)

اگر کبھی اس کی زبان سے دُعا کے لفظ نکل گئے تو بہت جلد انہیں واپس لینے کی فکر کرتا ہے۔ اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔ یہ اپنی ندامت کا اظہار اس طرح کرتا ہے ؎

بہت خجل ہے ترے درد سے دُعا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری — حسرت

دُعا قبول نہ ہونے کی وہ دُعا مانگتا ہے ؎

کسی کی خاطرِ نازک کا آگیا ہے خیال — دعائیں مانگ رہا ہوں دُعا قبول نہ ہو

میرؔ صاحب کو دُعا کی محویت میں بھی اس کا خیال رہتا ہے کہ کہیں محبوب کا ذکر نہ آنے پائے۔ اس واسطے کہ اگر اس کا ذکر آگیا تو یہ ایک طرح کی شکایت ہوگی۔ جسے اُن کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی ؎

غیرت سے نام اُس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محوِ دُعا گئے ہیں

غالبؔ کو جب اجابت دُعا کا یقین ہو گیا تو اُس نے سوائے دلِ بے مدّعا کے اور کوئی چیز طلب نہ کی ؎

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ

اُس کے نزدیک فریاد کو اثر نصیب ہونا عشق کی توہین ہے کہ اس کا سرمایۂ دائمی نامرادی ہے ؎

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سالکؔ دہلوی کا شعر ہے ؎

کرتے ہیں یوں دُعا کہ ہم گویا — ہاتھ اثر سے اٹھائے بیٹھے ہیں

داغؔ کی دُعا کو درِ قبول تک جانے میں اسی طرح تامّل رہا جس طرح اس کے محبوب

کو اس کے ہاں آنے میں ؎

آئے وہ بے وفا یہاں اس کی بلا کو کیا غرض
جائے در قبول تک میری دُعا کو کیا غرض

ایک اور جگہ داغ نے عجیب پر لطف انداز میں دعا کی نارسائی کو ظاہر کیا ہے۔ شعر ہے ؎ کیا توبہ کروں عشق سے اے حضرت ناصح

ڈرتا ہوں کہ یہ بھی نہ شبِ غم کی دُعا ہو

اوّل تو عاشق کی دُعا قبول نہیں ہوتی اور اگر کبھی ہوتی ہے تو اس کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ دُعا سے پہلے وہ اضطراب میں مبتلا تھا اور دُعا کے بعد اُس کو سکونِ یاس نصیب ہوتا ہے جو عاشق کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے ؎

اگر ہوا بھی تو اُلٹا اثر دُعا میں ہوا
سکونِ یاس ملا اضطراب کے بدلے حسرتؔ

فانیؔ اُسے محبت کی توہین خیال کرتے ہیں اگر عاشق اپنی دُعا میں اثر کا طالب ہو۔ ان کا شعر ہے اور اخلاقی حیثیت سے نہایت بلند شعر ہے ؎

ننگ ہے سعیِ غرض فرضِ محبت پورا کر
اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

دُعا سے گزر کر جب نالوں تک نوبت آتی ہے تو عاشق کو اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اُن کی رسائی نہ ہو جائے۔ اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگر آہ فلک سوز اپنا کام کر گئی تو پھر شب ہجراں میں کس سے شکوے بیان کئے جائیں گے۔ اگر فلک نہ رہا تو ان شکوؤں کو سننے والا کون ہوگا؟ یہ عجیب و غریب شاعرانہ اندیشہ ہائے دور و دراز میں مجروحؔ کا لاجواب شعر ہے ؎ پھر کس سے یہ شکوے شب ہجراں میں کریں گے

کام اپنا کہیں آہِ فلک سوز نہ کر جائے

کبھی یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں نالوں کی وجہ سے محبوب بیتاب نہ ہو جائے۔ جگر کا شعر ہے ؎ کون دیکھے اسے بیتابِ محبت اے دل

تو وہ نالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے

اصغر نے اُس آہ کو ننگ عشق قرار دیا ہے جو اثر کے لئے ہو۔ اُس کا شعر ہے ؎

بہائے دردوالم دردوغم کی لذّت ہے

وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

خوگرِ غم کے لئے نالہ کشی حسن طلب ہے۔ اس کے نالے شکوۂ جفا کے لئے نہیں بلکہ تقاضائے جفا کے لئے ہوتے ہیں۔ غالب نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشقِ حقیقی

اب تک عشقیہ شاعری کے اس رجحان کا ذکر کیا گیا جس کا خطاب مجاز سے ہے لیکن انسانی ذہن و وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کرنا دشوار ہے۔ حافظ کہہ گئے ہیں ؎

ما در پیالہ عکسِ رُخ یار دیدہ ایم اے بے خبر ز لذّتِ شربِ مدام ما

اہل نظر کو مجاز میں حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے۔ معرفتِ الٰہی بغیر معرفتِ نفس اور معرفت کائنات کے ممکن نہیں۔ ذاتِ احدیت وجوب محض ہے، اسماء و صفات سے منزّہ اور خلق و مجاز سے ماورا بھی لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مظاہر کونیہ اور اُن کے احکام و آثار کی اصلیت کیا ہے؟ بقول غالب ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب غالبؔ نے وہی دیا جو معارف و سلوک کے واقف کاروں نے اس سے پہلے دیا تھا۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہنگامہ ہستی کی کرشمہ سازیوں میں اور پری چہروں کے غمزہ و عشوہ و ادا اور اُن کی شکنِ زلفِ عنبریں اور نگہِ سرمہ سا میں اربابِ عرفان کے لئے تجلّیاتِ الٰہی کی جلوہ فرمائیاں موجود ہیں جو انسان کا حقیقی مطلوب ہے۔ اصل حسن و جمال شاہدِ حقیقی میں ہے اس لئے وہی عشق و محبّت کے قابل ہے۔ دوسرے مظاہر فریبِ نظر سے زیادہ نہیں ہیں۔ وہ جمال بھی ہے اور جمیل بھی۔ حُسن بھی ہے اور حسین بھی۔ اس طرح وہ اسم بھی ہے اور صفت بھی۔ حُسن عشق کی تخلیق کرتا ہے جس کا خاصہ جذب ہے جو عاشق کو اپنے سے باہر لے جاتا ہے۔ اس ماورائی کیفیت میں وہ نئے سرے سے قدروں کی تخلیق کرتا ہے جس میں جذبہ اور تخیل ہم آمیز ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبے پر جب تخیل کی ضرب لگتی ہے تو اس میں سے روشنی پیدا ہوتی ہے جیسے چقماق میں سے یہ روشنی اہلِ تصوّف کے نزدیک الٰہی تجلّی ہے جس کی طرف وہ لپکتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو اس میں شرابور کر دیں۔ اس طرح خودی اور خدا ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غالبؔ کا عرفان اتنا وارداتی نہیں جتنا کہ میرؔ دردؔ یا نیازؔ بریلوی کا۔ اس کا تعلق اندرونی جذب کے مقابلے میں ذہن سے زیادہ ہے۔ اس کے اس ذہنی رجحان نے اس کی وسیع مشربی کو اجاگر کیا جو تغزل کی رُوحِ رواں ہے۔

غالبؔ سے پہلے میرؔ دردؔ کے یہاں خاص طور پر عالم انوار و اقدار اور عشقِ حقیقی کی زمزمہ سنجیاں ملتی ہیں۔ ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ تصوف تغزل سے ایسا ہم آہنگ

ہے کہ ہر اعلیٰ درجے کے غزل گو کے کلام میں اس کی تھوڑی بہت چاشنی موجود ہے۔ یہ خیال بجائے خود اپنے اندر شعریت رکھتا ہے کہ وجود حقیقی جب اپنے تعین کی طرف مائل ہوا تو عالم رنگ و بُو اور مظاہر کونیہ کا ظہور ہوا۔ عالم میں خالق تعالیٰ کا وجود جاری و ساری ہے۔ جو کچھ ہے وہ اسی کے اسماء و صفات کا ظہور ہے۔ کثرت اور تعدد کی تہ میں اصولِ وحدت کارفرما ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر شے میں ذاتِ باری کا جلوہ موجود ہے اسی واسطے مظاہر اپنے اندر کشش اور دلبستگی کا سامان رکھتے ہیں۔ حواس ظاہری کی رسائی چونکہ محدود ہے۔ اس لئے عشقِ حقیقی کے مقامات تک رسائی وجدان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اگر ذاتِ واجب انسانی خودی اور مظاہر سے بالکل ماورا ہوتی تو اس کی محبوبی اور تاثیر کو انسان کیسے محسوس کرتا۔ ہمہ اوستی فلسفے میں انسانی خودی کا منتہا یہ ہے کہ وہ انائے مطلق میں اپنے آپ کو ضم کر دے اور حقیقت سے علیحدگی کا احساس باقی نہ رہے۔ غرضکہ ہمہ اوستی فلسفے کے تمام تصوّرات بجائے خود شعر ہیں۔ اور ان میں تغزل کے تمام عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جنہیں نئے نئے پیراؤں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ صوفی شاعر کے وجود کا ہر ذرہ محبت میں سرشار ہوتا ہے۔ ذاتِ باری کے عرفان و عشق کی بدولت اس کے دل میں ساری کائنات کی محبت کی سمائی ہو جاتی ہے جو فرق و امتیاز کے ظاہری اعتبارات سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کی روح کی سوت سے محبت کے جو چشمے پھوٹتے ہیں وہ بلا لحاظ اس کے کہ چمن ہے یا بنجر زمین سب کو یکساں طور پر سیراب کرتے ہیں۔ محبت کی پُر تاثیر قوت سورج کی روشنی کی طرح کائنات پر چھا جاتی اور ذرّے ذرّے کو روشن کر دیتی ہے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی محبت کا انجام نامرادی ہے۔ کوئی انسان سپردگی کے اس نقطہ پر نہیں پہنچ سکتا کہ دوسرے انسان کے لئے مٹ جائے۔ یہ سچ ہے کہ محبت کے جوش میں عاشق اپنی زندگی کو اپنے محبوب کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرتا

چاہتا ہے اور بڑی حد تک کر دیتا ہے لیکن محبت کا جوش چاہے کیسا ہی تیز اور تند کیوں نہ ہو محبت کرنے والا اپنی انفرادیت کی دیواروں میں اپنے آپ کو ہر حالت میں محدود پاتا ہے۔ کیا کیا جائے انسانی فطرت کا یہی اقتضا ہے۔ انسان کی مکمل سپردگی ذات الٰہی میں ممکن ہے۔ جسم اور روح دونوں اپنے آپ کو اس کی ذات میں فنا کر سکتے ہیں۔ انسان کو صرف ذات واجب میں اپنا محبوب حقیقی ملتا ہے جس کے لئے اس کی روح سرگرداں تھی۔ انسانی محبت ترقی کر کے جب انتہائی منزل پر پہنچتی ہے تو الٰہی محبت کے جلوے اُسے نظر آنے لگتے ہیں۔ الٰہی محبت محض تجریدہ روایت نہیں بلکہ وجدانی طور پر محسوس ہونے والی حقیقت ہے جس کا براہِ راست عرفان و تجربہ ممکن ہے اور جس سے ہر وقت انسان ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔

انسانی اور مجازی عشق چاہے کتنا ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو انسان کو اپنی ذات کی تنہائی سے نجات نہیں ملتی۔ خدا کی ماورائی حقیقت اور اس کا حاضر و ناظر ہونا ہی انسان کو اس کے وجود کی تنہائی سے نجات دلاتا ہے۔ اسلامی صوفیا کے ہمہ اوستی رجحان میں بھی تجرید سے پرہیز کیا گیا۔ ذات واجب اپنے حسن و جمال کی ساری دلربائیوں کے باوجود جمود و تجرید سے عاری ہے۔ تجرید سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ اسلام کا خدا عالم میں جاری و ساری ہونے کے باوجود زندہ اور مؤثر ہے۔ وہ ایک باارادہ اور صاحبِ شعور ہستی ہے جس کی مشیت سے دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اس کی تمام صفات تخلیقی ہیں۔ وہ رحیم و کریم ہے، حی و قیوم ہے اور کائنات کی تخلیقی روح کی معجز نمائیاں اسی سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کا جمال بھی جمودی نہیں تخلیقی ہے۔ اس لئے اس کی محبت بھی تخلیقی ہونی چاہیئے اسی تخلیقی محبت کی جلوہ گری ہماری صوفیانہ شاعری میں ملتی ہے اور اسی کی بدولت سالک اپنی ذات کے تعینات پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

تصوّف کے مسائل کو اردو غزل میں شروع ہی سے برتا گیا۔ اس لئے کہ یہ

موضوع رمز و کنایہ کے ساتھ خاص طور پر مناسبت رکھتا تھا۔ وؔلی اور میر تقی میرؔ کو زیادہ تر مجاز سے دل بستگی رہی لیکن ان اساتذہ کے ہاں بھی آپ کو ایسے اشعار ملیں گے جن میں تصوف کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ میرؔ صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　اپنے سوائے کس کو مسجود جانتے ہیں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے　　اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی زبان اور اسلوب تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملوں کی طرح حقیقی عشق کی کیفیتیں بھی تفصیل، منطقی تسلسل اور صراحت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ غزل میں تصوف کے مضمون اچھی طرح کھپ گئے۔ تصوف کے سہارے فلسفہ و حکمت نے بھی ایوان غزل میں بار پایا۔ جن کی بدولت کلام میں تنوع پیدا ہوا اور علوم و فنون کے لطائف بیان ہونے لگے۔ حافظؔ سے لے کر غالبؔ تک مشرقی ممالک کے علم و فن کی ساری ذہنی ترقی ہمیں غزلوں میں شعری نکات کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ جذبات ہی غزل کی حقیقی اساس رہے ہیں لیکن جذبات جذبات میں فرق ہوتا ہے۔ ایک اس شخص کے جذبات ہیں جس کا سینہ علوم و معارف کی روشنی سے منور ہے۔ ایک اس کے جذبات ہیں جو مادی حیوانی زندگی سے آگے اپنی نظر نہیں لے جا سکتا۔ ضرور تھا کہ اس فرق کا اثر غزل لکھنے والوں کے کلام پر پڑتا اور پڑا۔

اردو غزل میں میر دردؔ کا کلام عشق حقیقی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے لیکن وہ تغزل اور شعریت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

ان کے کلام میں ایک خاص رنگ اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے روحانی تجربوں کو نرم اور ملائم سروں میں بیان کرتے ہیں۔ جو اُن کی قلبی کیفیتوں اور اخلاص کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کے کلام میں تصوف تغزل کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نظر

آتا ہے۔ لفظوں کی گھلاوٹ نے معنوی حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ ہی آڑے آ گئے جیدھر چلے
جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

ازبسکہ جہاں نقش فنا کا ہی نگیں ہے دل جس سے لگا پھر اسے دیکھا تو نہیں ہے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے
میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار | اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے
یارب یہ کیا طلسم ہے ادراکِ فہم یاں | دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے
گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول | دل سے اٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے
اطفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے | یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں
چلے تھے ڈھونڈنے جس کو سو وہ ہے آپ کھو بیٹھے

متوسطین میں غالبؔ اور نیازؔ بریلوی کے یہاں تصوف کا رنگ ملتا ہے۔ خاص طور پر نیازؔ بریلوی نے جو اپنے زمانے کے مشہور صاحبِ حال صوفی گزرے ہیں اپنے کلام میں سلوک کے اسرار اور رموز بیان کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دید اپنی کی تھی اُسے خواہش | آپ کو ہر طرح بنا دیکھا
صورتِ گل میں کھل کھلا کے ہنسا | شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہو کر کے اور پروانہ | آپ کو آپ میں جلا دیکھا
کر کے دعویٰ کہیں اناالحق کا | بر سرِ دار وہ کھنچا دیکھا

تھا وہ برتر شما و ما سے نیازؔ
پھر وہی اب شما و ما دیکھا

کہیں ہے بادشاہ تخت نشین | کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا
کہیں عابد بنا کہیں زاہد | کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا
کہیں وہ در لباسِ معشوقاں | بر سرِ ناز اور ادا دیکھا
کہیں عاشق نیازؔ کی صورت | سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

تو نے اپنا جلوہ دکھانے کو جو نقاب منہ سے اٹھا دیا
وہیں محوِ حیرتِ بے خودی مجھے آئینہ سا بنا دیا
وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی
سو کشش نے دامنِ ناز کی اسے بھی زمیں سے مٹا دیا
کیا ہی چین خوابِ عدم میں تھا نہ تھا زلفِ یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شورِ ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
رگ و پے میں آگ بھڑک اٹھی پھونکے ہی پڑا سبھی بدن
مجھے ساقیا مے آتشیں کا یہ جام کیسا پلا دیا
جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقامِ فنا لیا
جو لکھا پڑھا تھا نیازؔ نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

خاک کے پتلے نے دیکھو کیا ہی مچایا ہے شور — جن و ملک کے اوپر کر رہا ہے اپنا زور
عشق کے میدان میں آ صورتِ انساں بنا — عاشقِ مولا ہوا چاند کا جیسے چکور
سینے میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ رہا — بل بے سمائی تیری او رے سمندر کے چور

خموشی کا عالم ہے اپنا مقام — نہیں آشنا بحث و تکرار کے
مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت — میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

غالبؔ کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے۔ اس کی چشم بینا نے حیات و کائنات کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے دیکھا اور ان کی اس طرح ترجمانی کی کہ اس میں سب کچھ آگیا مجاز اور حقیقت بھی، شرح درد اشتیاق بھی اور حسن کرشمہ ساز کی معجز نمائیاں بھی۔ شوخی اس بلا کی ہے کہ خود اپنے آپ تک کو نہیں چھوڑتے اور کبھی خود اپنے اوپر بھی چوٹ کر

جاتے ہیں ؎ یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مسائل تصوف کے ساتھ پری وشوں کا ذکر بھی کر جاتے ہیں کہ کہیں حکمت و معرفت کی خشکی انسانیت کی شگفتگی پر غالب نہ آ جائے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مجاز کو بعد میں دیکھیں گے، آیئے دیکھیں وہ حقیقت کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہے بڑی بلند آہنگی سے کہتے ہیں۔ متبذل اور پیش پا افتادہ تشبیہوں سے انہوں نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ ان کے طرزِ ادا کی جدت کا یہ اقتضا تھا کہ خود اپنے تخیل سے نئی نئی ترکیبیں، بندشیں اور اچھوتے استعارے اور کنائے ایجاد کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ ہر بات کو انوکھے طریقے سے بیان کیا۔ واجب الوجود کے مسئلے کو کس معنی آفرینی کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؎

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سے تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب — آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ہے تجلی تری سامان وجود — ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم — کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

ہے مشتمل نمود صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موج و حباب میں

بحر کا وجود ان صورتوں کے تعدد پر مبنی ہے جو کبھی قطرہ کا کبھی موج کا اور کبھی حباب کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ مختلف صورتیں بحر سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتیں بلکہ اس کی شانیں ہیں جن میں وہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر یہ شانیں نہ ہوں تو بحر کی ہستی نامکمل رہ جائے۔ شاعر نے بڑے ہی لطیف اور بلیغ طریقے سے انسانی وجود اور مظاہر خارجی کی صفاتی تجلیوں کو اس طرح خالق کائنات سے وابستہ اور خود ان کی وجہ وجود کو آشکارا کیا ہے ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غیب الغیب سے تصوّف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے جو عقل و ادراک کی حدوں سے پرے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کو تم عالم ظاہر سمجھ رہے ہو، جو کثرت و تعدد کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ ذات احدیت ہی ہے۔ اس کی جلوہ فرمائیوں سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ مظاہر کوئی اس سے علیحدہ ہستی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس سے جدا نہیں ہیں۔ غالب نے بڑی دقیقہ سنجی سے مندرجہ بالا شعر میں خواب کی تمثیل سے اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ وضاحت تفصیل سے بے نیاز ہے۔ شاعرانہ وضاحت میں بھی رمز و ایما کی مبہم کیفیت موجود رہتی ہے چنانچہ اس میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے۔ کوئی شخص اگر خواب کی حالت میں یہ دیکھے کہ وہ بیدار ہے۔ تو کیا وہ واقعی بیدار ہوگا؟ نہیں خواب میں اپنی بیداری کا خواب دیکھنے والا خواب ہی میں ہوگا۔

کائنات کے جلووں کی بوقلمونی اور انسان کی طاقت دید کے محدود ہونے کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

دیوان غالب میں اس طرح کے اور اشعار ملتے ہیں جن میں سلوک اور تصوف کے اسرار پیش کئے گئے ہیں ۔

ہے رنگ لالہ و گل نسریں جدا جدا   ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے
یعنی بحسبِ گردش پیمانۂ صفات   عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہئے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب کے کلام کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیت پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں بڑی دقیقہ رسی سے زندگی کی گتھیوں کو حکیمانہ انداز میں رمز و ایما کے ذریعے سلجھایا ہے۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کا طرز ادا ہے جس کو اردو شاعری کے لئے سرمایۂ نازش سمجھنا چاہئے۔ ہمارے اکثر شاعر ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں۔ جو لذت پرستی کی طرف مائل ہوا تو وہ کائنات میں سوائے اس کے اور کچھ دیکھتا ہی نہیں۔ جو اندوہ و الم سے متاثر ہوا تو اسے حسرت و غم کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن زندگی تو بڑی وسیع شے ہے۔ وہ مسرت اور غم اور لذت پرستی سب پر حاوی ہے اور پھر ان سے بالاتر بھی ہے۔ غالب نے اس نکتے کو پالیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں تنوع نظر آتا ہے جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہے۔ اس کے یہاں غم بھی ہے اور مسرت بھی، جوش جذبات بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی۔ تخیل کے نقش و نگار بھی ہیں، اور حقائق و تاثرات کی ترجمانی بھی۔ دیوان کا دیوان ایسی دل آویز موسیقی میں رچا ہوا ہے کہ اسے فردوس گوش کہنا مبالغہ نہ ہوگا، مگر جذبہ اور تخیل کی ایسی لطیف آمیزش اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

غالب اور نیاز بریلوی کے بعد بھی غزل میں تصوف کے نکات اور مسائل بیان

کئے گئے ہیں۔ چنانچہ فانی، اصغر اور جگر بادۂ تصوف کے ذوق شناس ہیں۔ عارفانہ مضامین میں اگر جدتِ ادا کی دل آویزی بھی شامل ہو جائے تو یہ شراب دوآتشہ ہو جاتی ہے اور اہلِ ذوق کے قلب پر بجلیاں گرنے لگتی ہیں۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

فانی کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل　　کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری　　ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال　　منہ دیکھتا ہوں جلوۂ آئینہ ساز کا

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے　　ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

حسن مطلق بھی ہے حجاب ان کا　　اعتبارات بر ملا کی قسم

ہزار ڈھونڈیئے اس کا نشاں نہیں ملتا　　جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ　　بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا　　ہم تمہارے ہیں ورنہ ہم کیا ہیں

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک　　اس مرحلۂ سعیِ تماشا سے گزر جا

اصغر گونڈوی کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شورشِ دل جو وہ ہوتی تھی بدستور ہے آج　　نہیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دور ہے آج
جس سے کل تک دل بیتاب بھڑکا جاتا تھا　　اسی شعلے کو جو دیکھا تو سرِ طور ہے آج

پردۂ حرماں میں آخر کوئی ہے اس کے سوا　　اے خوشا دوری کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
میں تو ان مجبوریوں پر بھی سراپا دیدہ ہوں　　اس کے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے پڑی اس نے صدا — قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف — ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرمِ روِ عرصۂ حیات — میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے — قطرہ میں سمندر ہے ذرّہ میں بیاباں ہے
اے پیکرِ محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں — جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدہ حیراں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

جگر کے شعر ہیں ؎

دھوکا قدم قدم پہ تری بزمِ ناز کا — کیا سخت مرحلہ ہے طلسمِ مجاز کا

حسن کے معجزۂ وحدت و کثرت کی قسم — چشمِ حیرت میں ہے سب کچھ سرِ حیرت کی قسم
تجھ کو دیکھا مگر اس طرح کہ دیکھا ہی نہیں — اپنی کم مائگیِ جرأت و ہمت کی قسم
مجھ سے چھپنا تجھے زیبا نہیں اے پیکرِ حسن — میں محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم

کرشمے ذات و صفات کے یُوں جمالِ قدرت دکھا رہے ہیں
کہ ہر تصوّر سے دور رہ کر وہ ہر تصوّر میں آ رہے ہیں

کہاں کی دید اور کس کا عرفاں حواس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

یہ حادثاتِ زمانہ کیا ہیں اسی کے حسنِ طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

کرشمے ہیں حسنِ بے جہت کے فسوں ہیں چشمِ مناسبت کے
اِدھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں اُدھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں

نفس نفس میں صفات تازہ ممات تازہ حیات تازہ
انہیں میسر ہے ذات تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

نگاہِ شوق ہی کچھ جانتی ہے رازِ مستوری
وہ خود جلوہ ہے اُن کا سب جسے پردہ سمجھتے ہیں

اگر نہیں پس پردہ کوئی حقیقت میں
یہ کون بول رہا ہے طلسم صورت میں
جب آئے محفل وحدت سے بزم کثرت میں
نظر کا بن گئے پردہ نظر کی صورت میں

ہجوم تجلی سے معمور ہو کر
نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
تجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر
بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں
کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

نظر بہ لحظہ دم بدم جلوہ بہ جلوہ آئے جا
تشنۂ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا
لطف سے ہو کہ قہر سے ہو گا کبھی تو روبرو
اس کا جہاں پتہ چلے شور وہیں مچائے جا

معراج عشق کہئے یا حاصل تصور
جس سمت دیکھتا ہوں تو مسکرا رہا ہے

آرٹ اور فریبِ نظر

محبت کی طرح آرٹ کے آداب میں یہ شامل ہے کہ ایک موہوم یا خیالی حقیقت کو اصلیت تصور کیا جائے۔ شاعر یا آرٹسٹ کا تخیل جس میں خواہش اور جذبے کی آمیزش ہوتی ہے۔ مبالغے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے تاکہ ایک قسم کا فریب نظر پیدا ہو۔ جس کی رمزی کیفیت سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اور جس کی طلسمی خاصیت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر اس فریب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس فریب نظر میں بھی صداقت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے پرکھنے کا معیار داخلی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی ناٹک یا

جادو گھروں میں جاتے ہیں تو اس توقع میں جاتے ہیں کہ ہم فریب نظر میں مبتلا ہوں گے جو اداکاری کے کمال کا نتیجہ ہے اور جو خارجی حقیقت سے بس وہی تعلق رکھتا ہے جو ہمارا تاثر اسے عطا کرے۔ اگر کہیں اس توقع کے خلاف ہو تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ آرٹ کی کوتاہی پر دلالت کرتا ہے۔

غزل میں وزن، بحر اور ردیف و قافیے کی عروضی پابندیاں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہم ایک طلسمی دنیا میں آ گئے۔ جہاں ایسے پُر فریب منظر پیش آئیں گے جن سے شاعرانہ حقیقت کی جلوہ گری ہوگی۔ پھر ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ طلسم و رمز کی دنیا نہ اتنی نئی ہو کہ اس کی ہر چیز ہمیں اجنبی اجنبی سی معلوم ہو اور ہمارے حافظے اور تحت شعور کے تاروں کو بالکل نہ چھیڑے اور نہ اتنی پامال و فرسودہ ہو کہ دل اس طرف راغب ہی نہ ہو اس لئے کہ تحیر کے لئے اس میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ توقع اور تحیر دونوں کے عناصر پہلو بہ پہلو موجود رہنے ضروری ہیں تاکہ ہماری تحت شعوری یادیں برانگیختہ ہوں اور ہم پر وہ پُر اسرار طلسمی کیفیت طاری ہو جائے جو آرٹ یا شعر کا مقصد ہے۔ شعر میں یہ سارا طلسم لفظوں کا رہین منت ہوتا ہے۔ لفظوں کی علامتوں سے جذبے کی اندرونی کیفیتوں کا اظہار بھی ہوتا ہے اور ایک حد تک ان کی تخلیق بھی۔ اگر لفظ نہ ہوں تو جذبات کی تاریکیوں میں کبھی روشنی کی کرن نہ چمکے اور فکر و تخیل کے سرچشمے خشک ہو جائیں۔

حسن ایسی قدر ہے جس کا اطلاق صرف تخیلی وجود پر ہو سکتا ہے۔ شاعر لفظوں سے طلسمی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس کا تخیل جمالیاتی حقیقت کو رمز کی صورت عطا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات لفظوں کو اس طرح برتا جاتا ہے کہ ان کی صفائی، سادگی اور صحت ہی رمز و طلسم کے پہلو پیدا کر لیتی ہے۔ اور ایک مکمل فریب نظر کی کیفیت سے سامع کو سابقہ پڑتا ہے۔ مومن کا یہ شعر اسی قسم کا ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شاعر نے اس شعر میں نظر فریبی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے کھینچ دی ہے۔ حسی تجربہ اور جذبہ دونوں اس خوبی سے ہم آمیز ہیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے تو غالبؔ جیسے صاحبِ نظر نے یہ شعر سن کر وجد کیا اور کہا کہ کاش مومنؔ خاں میرا پورا دیوان لے کر یہ شعر مجھے دے دیتے۔

عمل کی دنیا میں جس فریب نظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سے شاعر بے خبر نہیں ہوتا۔ عرفیؔ شیرازی نے یہ خیال بڑی خوبی سے ادا کیا ہے کہ اگر تو نے جلوۂ سراب کا فریب نہیں کھایا تو یہ نہ سمجھ کہ تو بڑا عقلمند ہے بلکہ یہ سمجھ کہ تیری پیاس جھوٹی تھی ورنہ پیاسے کے لئے یہی بات فطری ہے کہ وہ جلوۂ سراب کا فریب کھائے۔ اس کا شعر ہے ؎

بہ نقصِ تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش مناز

دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

عرفیؔ نے ایک دوسرے شعر میں یہ مضمون باندھا ہے کہ اگرچہ دام میں ہر جگہ رخنے موجود تھے اور ہم چاہتے تو اس میں سے نکل سکتے تھے لیکن ہم نے اپنے آپ کو دیدہ و دانستہ اس فریبِ نظر میں مبتلا رکھا کہ رخنے نہیں ہیں اور اس طور پر ساری عمر رہائی کے اندیشے میں گزار دی۔ شعر ہے ؎

ہزار رخنہ بدام و مرا بہ سادہ دلی

تمام عمر باندیشۂ رہائی رفت

غالبؔ نے فریب نظر اور تحیر کی سیمیائی کیفیت کو عالمِ فطرت پر طاری کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کے جلوے کی خاطر پھولوں کی شگفتگی کا سلسلہ چمن عالم میں جاری ہے گویا کہ یہ سب فریب تماشا میں مبتلا ہیں۔ شعر ہے ؎

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک

بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ کے اور دوسرے شعروں میں بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شوق اس بزم میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

تھا خواب میں خیال کا تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کی دیوار و در میں خاک نہیں

جگرؔ کے یہاں بھی اس مضمون کے شعر کثرت سے موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بس ایک نظر کا دھوکا ہے بس اک آنکھوں کا پردہ ہے
نہ مجنوں کوئی مجنوں ہے نہ لیلےٰ کوئی لیلےٰ ہے

ہجوم یاس ایسا کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
وفورِ شوق یہ! آگے بڑھا جاتا ہوں منزل سے

جگرؔ نے "تصویر و تصور" میں فریب نظر کی کیفیت کو مکمل طور پر محسوس کیا جو محبت کی وادی میں پیش آتی ہے۔ اس پوری نظم نما غزل میں تخیل اور تحیر کو اس خوبی سے ہم آمیز کیا ہے کہ فریب آرزو کی اس سے بہتر تصویر ممکن نہیں۔ شعر ہیں ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قد بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسم، وہی ترنم
میں نقش حرماں بنا ہوا ہوں، وہ نقش حیرت بنا رہے ہیں

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں

قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں، جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

تمام رعنائیوں کے مظہر، تمام رنگینیوں کے منظر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں

بہار رنگ و شباب ہی کیا، ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے، جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے، پیئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

خود اپنے نشے میں جھومتے ہیں، وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خراب مستی بنے ہوئے ہیں، ہلاک مستی بنا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم، عرق عرق میں نہا رہے ہیں

یہ مست بلبل بہک رہی ہے، قریب عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دست رنگیں بڑھا رہے ہیں

یہ موجِ دریا، یہ رنگِ صحرا، یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے، وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم اُن کا دامن پکڑ رہے ہیں وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی، یہ دیکھتا ہوں نئی تجلّی
طلسم صورت مٹا رہے ہیں جمال معنی بنا رہے ہیں

خواجہ میر درد نے اپنے خاص انداز میں جلوۂ وصل کے فریبِ نظر کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

چھلاوہ سا جو ہو جاتا ہے جلوہ وصل کا گاہے
جدائی پھر تو اک مدّت عوض کیا کیا دکھاتی ہے

داغ جلوۂ محبوب کو فریب نظر قرار دیتا ہے ؎

اُف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
بل بے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تخیّل اپنے طلسمی عالم میں خواہشوں کا پری خانہ بنا لیتا ہے۔ کبھی خواہش کو دھوکا دینے کے لئے غیر حقیقی پیکر تخیّلی شعور میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخیّل خواہش کی پرورش خود خواہش کی خاطر کرتا ہے نہ کسی دوسرے مقصد کے لئے۔ تخیّلی شعور میں تصوّر اور وہ شے جس کا تصوّر کیا جائے ایک ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات خیالی پیکر حسّی مہیجات سے زیادہ مؤثر بن جاتے ہیں اور خیالی ادراک کی طرح حقیقی وجود اختیار کر لیتا ہے۔ بھوک کے وقت لذیذ کھانے کے ذکر سے لعاب دہن خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ، تصوّر اور حقیقی شے کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر دیتا ہے تاکہ فریب نظر کی سی کیفیت پیدا ہو۔ اگر تصوّر میں حقیقت کی تاثیر نہ ہو تو اس سے شدید قسم کا ردِ عمل کیسے پیدا ہو؟ خواہش جب تصوّر میں اپنی صورت گری کر لیتی ہے تو اس میں تعین اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ تخیّل کی مدد سے شعور اپنے سے ماورا ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ارتقا کی آخری منزل تک پہنچتا اور اپنے تجربے کو نئی تنظیم عطا کرتا ہے۔ تخیّل

جب عالم کا ادراک کرتا ہے تو اس کی اندرونی گرمی جیسے جذبے کا فیضان سمجھنا چاہیئے اس کو پگھلا کر نئی صورتیں عطا کرتی ہے۔ اس طرح اشیاء کے تضاد اور اختلافات رفع ہو جاتے ہیں اور اُن میں لطیف ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تخیّل کی یہ اعلیٰ تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کے تجربے میں گہرائی اور سچائی ہو جو بجائے خود قدر رکھتی ہے۔ اور اس کا کسی ماورائی نظام سے رشتہ جوڑنا ضروری نہیں۔

تخیّل اور جذبے کی ہم آمیزی سے جو فریب نظر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اُس کی طرف عرب شاعر جمیلؔ نے بڑی خوبی سے اشارہ کیا ہے۔ اس کا شعر ہے ؎

اریدُ لانسیٰ ذکرھا فکانما تمثّل لی لیلیٰ بکل سبیل

(میں چاہتا ہوں کہ لیلیٰ کو بھول جاؤں لیکن بھولوں کیسے وہ تو مجھے ہر طرف نظر آتی ہے)

حافظؔ نے بھی نقوش خیالی کا ذکر کیا ہے جو فریب نظر ہی کی ایک صورت ہے ؎

ہر چند آں آرام دل دانم نہ بخشد کام دل
نقشِ خیالی می کشم فالِ دوامی می زنم

واگنز کی موسیقی میں خواب کی سی جو بے تعینی ہے وہی اس کی جان ہے! اس کی جمالیاتی قدر اسی میں پنہاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک تاثرات کا تنوع موجود رہتا ہے۔ اسی وقت تک لطف و مسرت باقی رہتے ہیں۔ تعین کے مقابلے میں ابہام میں یہ بات زیادہ پائی جاتی ہے۔ مسرت کا تموّج پھیلا ہوا رہے تو بہتر ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ وہ ایک جگہ معیّن صورت میں ہو۔ معین ہونے سے تخیل کو پھیلنے اور بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اصلی مسرت ہمیشہ پھیلی ہوئی اور ناتمام سی ہوتی ہے۔ اس میں تعین اور قطعی پن نہ آنا چاہیئے جو تخیل کو باطل کرتا ہے۔ ہم صرف غیر تحقیقی کا جمالیاتی شعور اور خواہش رکھتے ہیں۔ جس تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر رسائی ہو جائے تو اس کے

ساتھ تخیلی تعلق باقی نہیں رہ سکتا تخیل ایک طلسمی عمل ہے جو آرزو کو فریب نظر بنادیتا ہے تاکہ خود اپنی شدت کو بڑھائے۔ تخیل کی رمزیت خواب کی رمزیت کے مثل ہوتی ہے خواب میں تخیل کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ تخیل میں بیداری کی حالت میں خواب کے قانون عمل کرتے ہیں۔ اگرچہ بیداری میں ان کی تاثیر کم ہو جاتی ہے لیکن اعلیٰ درجہ کا شاعر اس تاثیر کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔ اس واسطے کہ اس کے شعور میں تخیل کی شمع کو جذبہ روشن کرتا ہے اور جذبے کی شمع کو تخیل روشن کرتا ہے۔ یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ غالب پیغام سے لذتِ دیدار حاصل کر سکتا تھا ؎

مالذتِ دیدار زپیغام گرفتیم
مشتاق تو دیدن زشنیدن نہ شناسد

جن تمناؤں کی تکمیل بیداری میں نہیں ہوتی اُن کی تکمیل اکثر اوقات خواب میں ہو جاتی ہے۔ چاہے بعد میں وہ چھلاوا ہی کیوں نہ ثابت ہوں۔ غالب کا شعر ہے ؎

تھا خواب میں خیال کا تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

حسرت کا شعر ملاحظہ ہو ؎

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا — سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

استعارے کی رمز آفرینی

شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے لیکن شعر کی رُوح چونکہ رمز و ابہام کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لئے لفظوں کے معنے میں تشبیہ اور استعارے اور کنائے سے وسعت پیدا کی جاتی ہے۔ تشبیہ میں وہ قوت اور تاثیر نہیں ہوتی جو استعارے اور کنائے میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اُس میں رمز و ابہام

کا ایمائی عنصر نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اور اس کے استعمال سے ایک حد تک مطالب میں وضاحت آجاتی ہے۔ اگر استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کا استعمال اس لئے کیا جائے کہ معنی کی تفصیل اور وضاحت ہو تو وہ بھی تشبیہ کی مثل ہو جائیں گے اور اُن کی قوت و تاثیر میں کمی آجانا لازمی ہے۔ استعارے سے حقیقت کی تصویر کشی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پیچیدگی کو ظاہر کرنا۔ عالم فطرت کی وسعت، کثرت، تنوع، اس کی بلندیاں اور پستیاں، زمان و مکاں کی کبھی ختم نہ ہونے والی پہنائیاں، ذہن کی شعوری اور تحت شعوری کیفیتیں دقیق اور اُلجھی ہوئی ہیں جن کی طرف شاعر متوجہ ہو سکتا ہے لیکن ان سب سے زیادہ اُلجھی ہوئی حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور جذباتی حقائق ہیں جنہیں حرف وصوت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ہر استعارہ دوہرا مطلب رکھتا ہے۔ ایک کی جگہ دو تصوّر ذہن کے سامنے آتے ہیں لیکن دونوں میں وحدت پوشیدہ رہتی ہے۔ جو ثبوتی حقیقت اور تاثر دونوں پر حاوی ہوتی ہے۔ استعارے سے صرف ایک تاثر دوسرے تاثر میں تبدیل نہیں ہو جاتا بلکہ ان میں معنوی قوت اور تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک استعارہ دوسرے استعارے کو اپنے ساتھ تحت شعور کی گہرائیوں سے کھینچ لاتا ہے۔ جب ایک استعارہ دوسرے کی تخلیق کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کے جلو میں چھوٹے موٹے نقوش و معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ یا تو اس میں ضم ہو جاتے ہیں یا دھندلے اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یہ سب عمل بڑی خوبی سے تحت شعور میں انجام پاتا ہے۔ استعارے اور کنائے کی مدد سے جذباتی حقائق کی بوقلمونی ایک لمحے میں دل نشین ہو جاتی ہے جس کی وضاحت اگر منطقی طور پر کی جائے تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں۔ لیکن اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ استعارہ ایک طرح کا پس منظر مہیا کرتا ہے جس پر شاعر کی بصیرت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض استعارے کلام کی زینت کے لئے ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ بعض ایسے بھی ہیں جن سے زندگی

کی پیچیدگی ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بعض دفعہ استعارے کے ذریعے بھولی ہوئی یادوں کو زندہ کیا جاتا ہے تاکہ تخیل اس خلا کو پُر کر سکے جس سے آرٹسٹ یا شاعر کو تخلیق کے وقت واسطہ پڑتا ہے۔ غزل میں استعارے اور کنائے کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو۔ اس لئے کہ ثانی الذکر کا مقصد تفصیل اور تشریح سے مضمون کو سامع کے دل نشین کرنا ہے اور اول الذکر کا رمز وایما کے ذریعے تحیر میں اضافہ کرنا۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدتِ ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ذریعے خیال کی بالیدگی اور رسائی میں اضافہ ہوتا ہے اور معمولی بات کو کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔ مثلاً غالبؔ اس مضمون کو استعارے کی زبان میں کیا خوب ادا کرتا ہے کہ انسان کی عمر گزری چلی جاتی ہے اور اس کی گریز پائی پر اس کو کوئی قابو نہیں۔ یہ شعر رمزی محاکات کا کمال ظاہر کرتا ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر دونوں ہم آغوش ہیں ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

استعارے نے معنی کو چار چاند لگا دیئے اور معانی کی بلندی اور خوبی نے لفظوں کے چناؤ میں شاعر کو مدد دی۔ یہی حسنِ ادا ہے جس نے غالبؔ کو غالب بنایا اور اس کے شاعرانہ رتبے کو اتنا بلند کر دیا کہ اب تک وہاں کوئی نہ پہنچ سکا۔ انسان کی ہستی بے ثبات کی تصویر استعارے اور تمثیل کے ذریعے دوسری جگہ یوں پیش کی ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

خالص استعارے کی مثالیں غالبؔ کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دام ہر زنگ میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ایک جگہ مضمون باندھا ہے کہ محبوب ایک لمحے کے لئے سامنے آتا ہے اور شرم سے پھر چھپ جاتا ہے۔ عاشق جو کہنا چاہتا تھا وہ سب دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ اس سب مضمون کو بجلی کے استعارے سے کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہی استعارہ حسرتؔ کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن مضمون ذرا مختلف ہے۔ شعر ہے ؎

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اُس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

اس شعر میں استعارہ بالکنایہ اپنی نکھری ہوئی شکل میں نظر آتا ہے۔ شاعر نے دو کیفیتیں بالکل الگ الگ بیان کر دی ہیں جیسے ان میں کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ظاہر میں اگرچہ ان میں تعلق نہیں معلوم ہوتا مگر حقیقت میں تعلق مضمر ہے۔ اگر تشبیہ کے ذریعے ظاہری تعلق پیدا کیا جاتا تو ایک معمولی سی بات ہوتی۔ جب محبوب حیا سے مجبور ہوتا ہے تو اس کے سینے میں نہ جانے کتنے مچلتے ہوئے ارمانوں کے طوفان موجزن ہوتے ہیں جنہیں حیا ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ عاشق اپنے ارمانوں کو ظاہر کر دیتا ہے لیکن محبوب انہیں نہیں ظاہر کر سکتا۔ اس لئے کہ ایسا کرنا اس کی شانِ محبوبی کے خلاف ہوگا۔ حیا خود اپنے اندر رمز کی کیفیت پنہاں رکھتی ہے تاکہ حُسن کا راز دنیا پر افشا نہ ہو۔ چونکہ حیا اور حجاب محبوب کے ارمانوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس لئے ان میں لازمی طور پر اس برق کی سی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ابر کے اندر پوشیدہ ہو۔ ایک تو شعر کے مضمون میں

رمزی کیفیت پہلے ہی سے موجود تھی، اس پر تمثیل اور استعارہ بالکنایہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور شعر کی تاثیر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس شعر میں استعارے کی حیثیت محض تزئین کلام کی نہیں بلکہ بنیادی ہے جس کے بغیر غزل کی طلسمی تاثیر نہیں پیدا ہو سکتی۔ شاعر کا یہ اشارہ بھی لطف سے خالی نہیں کہ ابر کے دامن میں جو برق پوشیدہ ہوتی ہے وہ کبھی نہ کبھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح محبوب کے ارمان بھی باوجود شرم وحیا کے کسی نہ کسی دن اظہار کے لئے بیتاب ہو جائیں گے۔

کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت، تازگی اور بلندی سے کیا جا سکتا ہے جو معانی و بیان کی جان ہوتے ہیں۔ استعارہ رمز آفریں ہوتا ہے۔ اس لئے جذبے اور اندرونی تجربے کی تصویر اس سے بہتر کھینچنے والا کوئی اور ذریعۂ کلام نہیں۔ ایک حد تک اس کا تعلق تحت شعور سے بھی ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ اس سے شاعر خیال کو مجتمع کرنے کے ساتھ ساتھ اس خیال سے جو یادیں وابستہ ہیں انہیں برانگیختہ کرنا چاہتا ہے۔ زندگی اور خارجی حقیقت، کی ہو بہو نقل کے بجائے استعارے اور کنائے سے اس کی توجیہ اور بازآفرینی ہوتی ہے۔ غزل میں یہ استعارے صرف لفظوں ہی کے نہیں ہوتے بلکہ پورے شعر کے شعر استعارے کہے جا سکتے ہیں۔ جن میں تخیل کی روح رچی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر تشبیہوں یا معانی کی تفصیل پر زیادہ توجہ کی گئی تو شعر کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ غزل گو شاعر کے پیش نظر معنی کی صحت سے زیادہ استعارہ بالکنایہ کی صحت ہوتی ہے جو خالص وجدانی چیز ہے۔ وہ اشیا اور حقائق کائنات کو ویسا نہیں دیکھتا اور نہیں دیکھنا چاہتا۔ جیسے کہ وہ کسی خاص طبیعی یا ارضی منصوبے یا مقصد کے تحت نظر آتے ہیں۔ وہ جب انہیں بیان کرتا ہے تو ان لطیف تعلقات کو بھی اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ جو دوسری اشیا اور حقائق سے انہیں وابستہ و پیوستہ کئے ہوئے ہیں۔ پھر جب اس کا تخیل ان کا تعلق استعارے اور رمزی علامتوں کے

ذریعے اپنے اندرونی جذبے سے جوڑتا ہے تو لازمی طور پر اس کا نقطہ نظر داخلی ہوجاتا ہے اور اس کے بیان میں طلسمی کیفیت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ رمزیت موسیقی کی طرح حقیقت اشیاء کے جو نا قابل فہم عناصر ہیں اُن کی علامت ہے۔ اسی کے ذریعہ جذبوں کی بھول بھلیوں کے پیچ و خم اور اُن کی پراسرار کیفیتوں کا پتہ چلتا ہے ورنہ بیچاری منطق نہ ان تضادوں کو دور کر سکتی ہے جو وہاں قدم قدم پر ملتے ہیں، اور نہ اُن کی کوئی توجیہ کر سکتی ہے۔ جذبے کے روبرو منطق سربگریباں ہو جاتی ہے اور اپنی نارسائی کو تسلیم کرنے میں اُسے تامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایسے موقعوں پر وہ اپنی گدّی پر تخیل کو بٹھا دیتی ہے جو اس وادی کے ہر نشیب و فراز سے واقف ہے

لفظ اور معانی

غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبوں کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لئے کبھی معانی کے لئے موزوں لفظ تلاش کرتا ہے اور کبھی لفظوں کے لئے معانی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت معین ہوتی ہے اور لفظوں کے برمحل استعمال سے خود معانی کا تعین عمل میں آتا ہے یا یوں کہئے کہ ذہن میں خیالوں اور لفظوں کی ترتیب الگ الگ نہیں ہوتی بلکہ ایک ساتھ عمل میں آتی ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ جذبہ اپنی گہرائیوں میں خیال اور لفظ دونوں کو ایک ساتھ سمو کر سڈول بنا دیتا ہے۔ شعر کا ترنم جذبے کے اتار چڑھاؤ کا عکس ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت تزئینی اور آرائشی نہیں ہوتی بلکہ وہ خیال کا جزو ہوتا ہے۔ شاعر کا تخیل زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے اور دونوں میں رشتہ اور ربط قائم کرتا ہے۔ لفظ اور معانی کے صحیح ربط سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آسکتی۔ علم و نظر کی وسعت سے معنی آفرینی کے میدان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی بعض مخصوص شعری علامتوں یا تلمیحوں کا آسرا لیا جاتا ہے۔

کبھی صنائع و بدائع سے شعر کے لفظوں کی نشست و ترتیب میں حسن پیدا کیا جاتا ہے اور کبھی نقل قول سے ایمائی اثر کو بڑھایا جاتا ہے۔ صنعتوں میں حسنِ تعلیل، مبالغہ، تضاد، مقابلہ، ابہام، مراعاۃ النظیر اور تجاہل عارفانہ سب کی سب غزل کی رمزی کیفیت کو بڑھاتی ہیں۔ صنائع لفظی و معنوی سے شاعر کو اپنے تخیل کی پرواز میں مدد ملتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا استعمال برمحل ہو اور تکلف اور تصنع سے احتراز کیا جائے۔ اگر صنعت کی خاطر صنعت برتی گئی اور شعر کہا گیا تو رمزی تاثیر مجروح ہو جائے گی۔ صنائع بھی بلاغت سے بے نیاز نہیں ہو سکتیں۔ ضرور ہے کہ ان سے شعر کی طلسمی تاثیر میں اضافہ ہو نہ کہ کمی۔ صنائع کے استعمال سے رمزی اثر بڑھتا ہے۔ بشرطیکہ وہ شاعر کے خیال کا جز بن گئی ہوں۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ غزل میں حسنِ ادا کہاں سے آتا ہے؟ اس کے قواعد و ضوابط مقرر کرنا ممکن نہیں۔ ایک مطلب کو ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے کہ لطف آجاتا ہے اور دوسرا وہی بات کہتا ہے اور سننے والے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ امتیاز ذوقی چیز ہے۔ عشق کے پامال مضمون پر غالبؔ کا ایک شعر ہے اور ذوقؔ کا ایک شعر۔ دونوں شعروں کے فرق سے دونوں کی شخصیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

ذوقؔ عشق کا مضمون باندھتے ہیں لیکن چونکہ سچے احساس اور اصلی تجربے کی کمی ہے اس لئے تاثیر نام کو نہیں۔ انہوں نے شاید خیال کیا کہ محاورہ اور ضرب المثل سے اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ موضوع کی مناسبت سے محاورہ بے موقع ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ شعری احساس کی نظر میں کھٹکتا ہے ؎

کئے ضبط اشک آہ پہنچی فلک پر مرا عشق کم خرچ بالا نشیں ہے

دوسری جگہ ذوقؔ اپنی فہم ونظر کے مطابق عشق کو تیرۂ خاکدان کے لئے چراغ قرار دیتے ہیں۔ معانی اچھے ہیں لیکن لفظوں کی نشست سے اس مضمون کی بلندی کی طرف ذہن راغب نہیں ہوتا، بلکہ معمولی اور ہلکی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بلند بات کے لئے طرز و اسلوب کی بلندی لازمی ہے ورنہ کلام بے اثر رہے گا۔ اُن کا شعر ہے ؎

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

اپنی ایک غزل میں رفاہِ عام کے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں۔ بات اچھی ہے لیکن کوئی بلند بات نہیں ہے مضمون باوجود اچھا ہونے کے کھٹکتا ہے۔ غزل میں نیکی کی تلقین کا بھی دوسرا انداز ہونا چاہیئے۔ ان کا مشہور شعر ہے جس کی اخلاقی حقیقت پسندی غیر مشتبہ ہے ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اس غزل میں محض رعایتِ لفظی سے جو معنی آفرینی کی کوشش کی ہے وہ کس قدر بھدّی ہے۔ کہتے ہیں ؎

الٰہی کان میں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

ذوقؔ کے ہاں داخلی تجربے کی کمی اور رعایتِ لفظی کی کثرت سے طرز ادا کی ندرت یا حسن پیدا نہ ہوسکا۔ تشبیہ سے آگے بڑھ کر استعارہ یا استعارہ بالکنایہ کا استعمال اُن کے بس کا نہیں معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے لفظوں کی تہہ میں کوئی گہرا تجربہ یا بیتی ہوئی کہانی کا ٹکڑا شاذ ہی ملتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ انہیں چاہے کچھ سمجھتے رہے ہوں لیکن تغزل میں اُن کا مرتبہ بلند نہیں اور غالبؔ کی تو وہ گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

ناسخ نے بالکل یہی مضمون باندھا ہے لیکن اس کے شعر میں غالب کے شعر کا طلسمی اور رمزی اثر نہیں پیدا ہو سکا۔ ناسخ کا شعر ہے ؎

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

ناسخ نے منطقی استدلال کی کوشش کی جو روح تغزل پر گراں گزرتی ہے۔ اسی لئے اس کا شعر تاثیر سے محروم رہا اور اسلوب بیان میں کوئی نزاکت یا بلندی پیدا نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف غالب نے دلیل کے بجائے محض دعویٰ سے اپنا کام نکال لیا اس لئے کہ اس کا شعر ایک مکمل استعارہ یا کنایہ ہے۔ وہ ذہن کی اشارے سے رہبری کرتا ہے۔ استدلال کی بھول بھلیوں میں اسے نہیں بھٹکاتا۔ ایمائی اور رمزی اثر کی کمی کے باعث ناسخ کا شعر غالب کے شعر کے مقابلے میں نثر معلوم ہوتا ہے۔

طرزِ ادا کا انحصار لفظ اور معانی دونوں پر ہے جو کلام کے اجزائے لاینفک ہیں۔ اگرچہ معانی شعر کی جان ہوتے ہیں لیکن انہیں لفظوں کی جو خارجی قبا زیب تن کرائی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔ شعر کی اور خاص طور پر غزل کے شعر کی خارجی ہیئت و اثر کا دارومدار لفظوں کے صحیح اور موزوں استعمال پر ہوتا ہے لفظوں کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو وہ خود معنی بن جاتے ہیں، جس طرح موسیقی کے بول ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صورت صرف بڑے اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے معمولاً لفظ اور معنی کی دوئی قائم رہتی ہے لیکن اس دوئی میں مناسبت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر لفظوں کو شعر کا جسم اور معانی کی روح سمجھا جائے تو ضرور ہے کہ حسین اور لطیف روح کا خارجی قالب کشش اور لطافت رکھتا ہو۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کو نہایت ہی پر اسرار طور پر متاثر کرتے ہیں۔ انسانی روح کے احوال بڑی حد تک مادی جسم میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح

مادّی جسمانی کیفیتیں رُوح پر اپنا گہرا چھاپ لگائے بغیر نہیں رہتیں۔ بالکل یہی حال لفظ اور معانی کا ہے۔ اگر کوئی لفظ موقع محل اور مقتضائے حال کے مناسب ہو تو اس کی تاثیر اس لفظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گی جو یونہی بدسلیقگی اور بے تکے پن سے استعمال کیا گیا ہو۔ چاہے آپ کے معانی کتنے ہی بلند اور گہرے کیوں نہ ہوں اگر اُن کی خارجی صورت غیر جاذب نظر اور دل نشینی سے معرا ہے تو خود معانی بھی لازمی طور پر اس سے متاثر ہوں گے اور تاثیر تو نام کو بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ غزل کے شعر کی رمزی اور ایمائی کیفیت اس وقت تکمیل پاتی ہے جب لفظ اور معانی ہم آہنگ اور مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو پورا کرتے ہوں۔ اسی سے طرزِ ادا کی دل نشینی عبارت ہے جو کسی ایک خیال یا تاثرِ حسن کے کسی ایک لمحے کو ابدی بنا دیتی ہے۔

لفظوں میں تصوّر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ذہنی طور پر ایک مخصوص گرد و پیش میں لے جاتا ہے جس سے بھولی بسری یادیں تازہ ہوتی ہیں۔ ان یادوں کا تعلق حافظہ اور شعور سے بھی ہوتا ہے اور بعض وقت تحت شعور سے بھی۔ یہ یادیں جذبے اور تخیل میں حل ہو کر خیالی پیکر تراشتی ہیں۔ غزل گو شاعر بعض دفعہ تلمیحوں کے ذریعے جو رمزی علامتوں کی حیثیت رکھتی ہیں ہمیں ایک خاص فضا کی سیر کرا دیتا ہے۔ موسیٰؑ اور طور، شیریں اور فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، محمود اور ایاز کی تلمیحیں تلازمِ خیال کی بازآفرینی کے لئے زبردست شعری محرک بن جاتی ہیں۔ اور یہ صرف تلمیحوں ہی تک محدود نہیں ہر لفظ میں قوت اور توانائی کا ایک طلسمی خزانہ مخفی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کو برتنے والا اس کے استعمال کا ڈھب جانتا ہو۔ بقول غالب ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

انسان کا خیال مثل ایک قوت کے ہے جس کا اظہار لفظوں کے ذریعے کیا جاتا

ہے۔ اپنی ساخت اور اصلیت کے لحاظ سے خیال اور لفظ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ خیال ایک لطیفہ ذہنی ہے۔ لفظ آواز کا طلسم۔ لیکن عجیب پر اسرار طور پر آواز خیال سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور خیال آواز کے حسن سے اپنی دل پذیری میں اضافہ کرتا ہے۔ خیال اور آواز کی ہم آہنگی سے شعر کی جاذبیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خیال کو موزوں لفظ نہیں ملتے۔ تو ایسی صورت میں اظہار کی کوتاہی نمایاں ہوگی اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ نرے لفظ ہی لفظ ہوتے ہیں جو خیال اور معنویت سے عاری ہوتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں شعر کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اور لفظوں کی علامتوں سے جذبے اور تخیل کی علامتیں ظاہر نہیں ہوتیں جن کی سامع کو توقع ہوتی ہے۔ جس طرح ستار یا سارنگی کے اچھی طرح سے تنے ہوئے تاروں میں سے موزوں اور دل پذیر صدا نکلتی ہے اسی طرح شعر کے برمحل لفظوں سے جذباتی ارتعاش پیدا ہوتے ہیں۔ جن میں معین اور غیر معین دونوں طرح کے عنصر شامل ہوتے ہیں جو دل کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔

لفظ نہ شاعرانہ ہوتے ہیں نہ غیر شاعرانہ۔ شاعر کے جذبے اور تخیل کی قوت انہیں شاعرانہ بنا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لفظوں میں خلقی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے تخیل کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ خاص طور پر ان لفظوں میں یہ صلاحیت زیادہ ہوتی ہے جن سے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شدید احساس کی حالت میں لفظوں میں ترنم اور وزن خود بخود پیدا ہو جاتا ہے بشرطیکہ شاعر ان کو مناسب ترتیب دینے کا گر جانتا ہو۔

رنگ یا نغمہ و سرود کے مقابلے میں لفظوں میں حسن آفرینی کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ چونکہ زبان کا ہر لفظ حقیقت میں زندگی کی کسی نہ کسی افادی اور عملی غرض کی تکمیل کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے شاعر چاہے اسے محض علامت یا رمز کے طور پر ہی کیوں نہ برتے لفظ کا افادی اور عملی پہلو اس میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست

ہے کہ وہ آرٹ جو لفظوں کے ذریعے سے حسن آفرینی کرتا ہے۔ زندگی سے بے تعلق کبھی نہیں ہو سکتا۔ زبان جو معاشرتی چیز ہے، ادیب اور شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تجرید کے آسمان پر چاہے کتنی پرواز کرے لیکن زندگی سے اپنا دامن کسی طرح نہ چھڑائے۔ موسیقی کے سُر نغمے کی دنیا کے باہر کوئی وجود نہیں رکھتے۔ ان سے عملی زندگی میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اور نہ معاشرے کی افادی تنظیم میں اُن کی کوئی جگہ ہے لیکن لفظوں کو ہم قدم قدم پر برتتے اور اُن سے عملی فائدے حاصل کرتے ہیں۔ معاشرے میں صدیوں کے استعمال سے گھس پس کر اُن کی جوہری توانائی ابھرتی ہے۔ غنائی شاعری یا تغزل میں لفظوں کی حیثیت خالص علامتوں کی ہوتی ہے جن کے معنی میں قوس قزح کی سی رنگا رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح قوس قزح میں ایک رنگ تدریجی طور پر دوسرے رنگ میں حل ہو جاتا ہے، اسی طرح غزل کے لفظوں کی گھلاوٹ علامتی یا رمزی طور پر ایمائی انداز اختیار کر لیتی ہے اور لفظ و معنی کی دوئی مٹ جاتی ہے اور نفسیاتی اور غنائی مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے جو شاعرانہ ادب کا عین ہے۔ شاعر کا کام یہ نہیں کہ اپنے لفظوں سے سننے والے کو اپنے تصورات منتقل کرے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اپنی جذباتی کیفیت دوسروں پر طاری کر دے۔ شاعر کا آرٹ اس کے جذبے کا رمز ہوتا ہے جسے وہ ایسے لفظوں کی علامتوں سے ظاہر کرتا ہے جن میں وجدان کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی ان لفظوں کے محض لغوی معنوں کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو اس کو اصل بات کا کبھی بھی پتہ نہیں چلے گا۔ غزل گو شاعر کا ہر لفظ اس کی جذباتی کیفیت کی علامت یا بیتی ہوئی کہانی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔

ہر لفظ کی ایک جوہری انفرادیت ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالی تلازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے مترادف لفظوں سے کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان

میں جیسا ترجمہ ہونا چاہئے ویسا نہیں ہو سکتا بلکہ خود اس زبان میں جس میں شعر کہا گیا ہے۔ اگر آپ لفظوں کی ترتیب بدل دیں تو اس کی تاثیر فنا ہو جائے گی۔ بعض دفعہ ایک لفظ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے اور ذہن کو ایک خاص فضا میں لے جاتا ہے۔ چنانچہ غزل کے شعر میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی کا جو ایک لطیف ربط قائم ہو جاتا ہے، اس کو کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ وزن اور بحر اور قافیے اور ردیف کے سانچوں میں ڈھل کر لفظوں کی جوہری انفرادیت اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اُن کی بدولت ترنم و ہم آہنگی کی رمزی صورت تخیل میں قائم ہو جاتی ہے۔ جسے جذبہ عزیز رکھتا ہے۔ اور وزن و ترنم کے ذریعے اُن کی بار بار تکرار چاہتا ہے انہیں سُن کر تحت شعور کی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض وقت خواب کی حالت میں گزشتہ واقعات اپنی جیتی جاگتی شکل میں نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ خواب کی کیفیت بھی دراصل اشارے اور کنائے کی کیفیت ہوتی ہے جن کے تفصیلی خلا کو حافظہ بعد میں پُر کرتا ہے۔

غزل کا ہر وزن اور ہر بحر اپنے اندر ایک قسم کا رمز و اشارہ رکھتی ہے۔ مثلاً بحر رمل جو سُرعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اُردو غزل نگاروں کے ہاں اپنی سماعی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ میں یہ بات دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں اس بحر کو اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوئی جتنی کہ اردو میں ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بحر ہندی بحروں سے نسبتاً قریب ہے۔ اس بحر کے اشعار کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رمل مسدس مجنون مقصور۔

شیشۂ مے کی طرح اے ساقی　　چھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

(مصحفی)

ناصحو! اُپ میں جرأت نہ رہا اب سمجھ کر اُسے سمجھائیے گا

رمل مثمن مجنون محذوف (جرأت)

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے (غالبؔ)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(صباؔ لکھنوی)

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (غالبؔ)

رمل مسدس مجنون محذوف :—

نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا کہ مجھے چارہ گری نے مارا

(مومنؔ)

اہلِ تدبیر کی وا ماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

(غالبؔ)

ہجر کے غم سے نہ گھبرا جرأتؔ اتنا حیران نہیں رہنے کا

(جرأتؔ)

یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

(نظامؔ رامپوری)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں "دو قدم کوچۂ رسوائی ہے"

(جلیلؔ)

علامتی لفظ

بحر اور ردیف وقافیے کے موزوں انتخاب کے علاوہ غزل گو شاعر کبھی ایسے

لفظ استعمال کرتا ہے جن کے ساتھ شعری تصور صدیوں سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور اُن سے ایک خاص قسم کی ایمائی فضا کی تخلیق ممکن ہے۔ طرزِ ادا اور حُسنِ سخن اُن سے کوئی علیحدہ چیز نہیں۔ میں اس جگہ صرف اس قسم کے چند رمزی اور علامتی لفظوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں جنہیں ہمارے غزل نگاروں نے شعری محرک کے طور پر برتا ہے۔ مثلاً جنون وگریباں، زنجیر، موج نقاب، آشیاں، قفس، اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے اصطلاحی لفظ اور علامتیں ہیں جو معنوی اعتبار سے وجدان کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔ گریبان کے چاک ہونے میں عشق و شوق کی آشفتہ سری کی خاص رمزی اور ایمائی کیفیتیں پنہاں ہیں جنہیں ہمارے شاعروں نے محسوس کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جنون وگریباں:۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
(میرؔ)

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے
نہ رکھا میرے سر پہ بارِ گریباں
(میرؔ)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
(میرؔ)

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہو گا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے
(یقینؔ)

کیا ہنگامۂ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ
اُدھر آئی بہار ادھر گریباں کا رفو ٹوٹا
(میر محمدی بیدارؔ)

اے دستِ جنوں تیری مدد ہوئے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے
(مصحفیؔ)

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا　　مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط

(جعفر علی حسرت)

مرے دستِ جنوں کو مشغلہ اچھا نکل آیا　　گریباں پھٹ گیا تو دامنِ صحرا نکل آیا

(لا اعلم)

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں　　جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

(غالب)

نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہوا گر اُس نے شدت کی　　ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(غالب)

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی　　لے چلے خانہ سے ہم گوشۂ داماں خالی

(آتش)

کیا کہیں آمدِ بہار ہوئی　　کیوں گریباں پہ ہاتھ جاتا ہے

(مجروح)

ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاجِ بہار　　پہلے ہی چاک گریبان کئے بیٹھے ہیں

(داغ)

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں　　ورنہ یہ ہاتھ گریبان سے کچھ دور نہیں

(داغ)

چاک کر میرے گریباں کو نہ اے دستِ جنوں　　نظر آتا ہے یہ کوچہ مجھے رسوائی کا

(اسیر لکھنوی)

ہنستے ہیں گل بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں　　گویا چمن میں چاک گریباں ہمیں تو ہیں

(تسلیم لکھنوی)

فصلِ جنوں ہے جامہ دری کی بہار ہے　　ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

(صبا لکھنوی)

اُس کے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق
یہ بھی دیوانے کوئی سیدا گریباں ہو گیا

(فانیؔ)

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

(جگرؔ)

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

(اصغرؔ)

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

(اصغرؔ)

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاروں کی بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

(بیخودؔ دہلوی)

زنجیر:—

ہے مدتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا معلوم ہی نہیں کہ دوانے کدھر گئے

(سوداؔ)

دل بند ہے ہمارا موجِ ہوائے گل سے اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی

(میرؔ)

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی

(میرؔ)

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

(میرؔ)

نکہتِ گل نے جگایا کسے زنداں کے بیچ پھر یہ زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

(حشمتؔ)

بہار آئی دوانوں کی خبر لو — اگر زنجیر کرنا ہے تو کر لو

(وحشت)

ہاتھ میں سلسلۂ زلفِ گرہ گیر نہیں — زور دیوانہ ہوں میں بستۂ زنجیر نہیں

(خواجہ وزیر)

حلقہ ہائے خمِ زنجیرِ محبت تیرے — پاؤں پڑ کر ہمیں لائے ہیں تو ہم آئے ہیں

(حیا دہلوی)

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا

(غالب)

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

(غالب)

ہیں شوقِ یار میں ہمہ تن رنگِ اضطراب — موجِ بہار کیوں نہ ہو زنجیرِ پائے گل

(زکی دہلوی)

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے — مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

(ذوق)

زلفوں کو تیری لہر نہانے میں گر آئے — ہر موجۂ دریا پہ ہو زنجیر کا دھوکا

(عبداللہ خاں مہر)

پر نئی صورت کی پہنائیں جنوں نے بیڑیاں — پڑ گئے تارِ گریباں پاؤں میں زنجیر سے

(داغ)

میں نکلوں خانۂ زنداں سے کیونکر جوشِ وحشت میں

کہ حلقہ حلقۂ زنجیرِ جنوں کا پاؤں پڑتا ہے

تسلیم لکھنوی

آگے زنجیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون   کس کے دل میں ہے ادب آپ کے دیوانوں کا

(شاد عظیم آبادی)

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں   صحرا کو نذرِ تشنگیٔ زنداں کئے ہوئے

(فانی)

لہر پھر دل سے اٹھی رگ رگ میں دوڑیں بجلیاں   دیکھئے کہتی ہے اب زنجیرِ دیوانے سے کیا

(آرزو لکھنوی)

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے   پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

(یگانہ)

مطمئن ہو کے کریں سیرِ چمن کیا وحشی   اک قدم باغ میں اک خانہ زنجیر میں ہے

(جگر)

موج:—

موج کی حرکت، بے تابی اور بے تعینی تغزل کی رمز نگاری میں مختلف پیراؤں میں ملتی ہے۔ کہیں موجِ بہار، کہیں موجِ رنگ، کہیں موجِ گل، کہیں موجِ شراب، اور کہیں خالی موج تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں شعری محرک کا کام دیتے ہیں۔ میر صاحب کا شعر ہے ؎

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو

اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

سودا کا شعر ہے ؎

گئی ہے سر سے گزر موجِ اشک آنکھوں کی   مجھے یہ لے گئی خانہ خراب در تہِ آب

ایک غزل کی ردیف "موج مارے ہے" رکھی ہے۔ اور اس سے سودا نے خاص ایمائی اثر پیدا کیا ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مری آنکھوں میں یادِ اشک ایسا موج مارے ہے   کہ جیسے ساغرِ سیمیں میں صہبا موج مارے ہے

پھنسے ہیں بسکہ دل دریا دلوں کے اس میں اے پیارے
ترے مکھڑے پہ کیا زلفِ چلیپا موج مارے ہے

غالبؔ کے ہاں خاص کر لفظ موج کی تشبیہیں کثرت سے ملتی ہیں۔ گل میں موج رنگ کی شوخی فریفتہ ہونے کی چیز نہیں۔ رنگ تو اصل میں گل کی خونیں نوائی کا نتیجہ ہے۔ حسنِ توجیہ ملاحظہ ہو ؎

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

محبوب کی رفتار کی شگوفہ طرازی کے ذکر میں موج کی دل نشیں تشبیہ سے کیا خوب کام لیا ہے ؎

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

موج بہار کی دیوانگی قابلِ ملاحظہ ہے کہ وہ معشوق کو درسِ خرام دینے چلی ہے اسی وجہ سے اس کو نقشِ پا کی طرح غیر متحرک اور پابہ زنجیر ہونا پڑا ؎

دیوانگی ہے تجھ کو درسِ خرام دینا
موجِ بہار یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے (نسخہ حمیدیہ)

موج حرکت و مستی کی علامت ہے جسے غالبؔ نے اپنے کلام میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے۔ لفظ موج کو کہیں تشبیہ اور کہیں استعارہ اور کہیں استعارہ بالکنایہ کے طور پر باندھا ہے۔ اور اس کے استعمال کی کثرت غالبؔ کے ذہنی تصوّر کے حرکی اور قوت آفریں ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح سیل اور سیلاب کے لفظ بھی جا بجا ملتے ہیں۔ اس سے زیادہ حرکی تصورِ حیات کیا ہوگا کہ در و دیوار جیسی سکونی اور جمودی اشیاء کو بھی شاعر کی آنکھ سیلاب کا خیر مقدم کرتے وقت متحرک اور رقص کی حالت میں دیکھتی ہے۔ چاہے اس حرکت اور رقص کا نتیجہ در و دیوار کا انہدام ہی کیوں نہ ہو۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب   کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

دوسری جگہ کہا ہے کہ عاشق کو اپنے مکان کی بربادی کی پروا نہیں۔ اس کو فکر ہے تو اس بات کی کہ سیلاب جلد آئے۔ سیلاب سے وہ ایسا مسرور ہوتا ہے جیسے کوئی جلترنگ سن رہا ہو ؎

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

شاعر کو دشتِ وفا میں موجِ سراب نظر آتی ہے جو سراسر فریب ہے اور اس سُراب کا ہر ذرّہ جوہرِ تیغ کی طرح تیز اور چمکدار ہوتا ہے ؎

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

عام طور پر ہمارے شاعروں کے یہاں عیش و طرب ایسی سکونی کیفیت سے عبارت ہوتا ہے، جس میں دل کی ساری آرزوئیں اور مرادیں پوری ہو جائیں۔ اس کے برعکس غالب کے ہاں عیش و طرب کا تصوّر بھی سکونی نہیں بلکہ حرکی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اُس نے بتایا ہے کہ طوفانِ عیش کا اگر تجزیہ کریں تو اس میں موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ شراب کے اجزا ملیں گے ؎ چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو

موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

مندرجہ ذیل اشعار میں رنگ اور موج کے شعری محرکوں کو معنوی لطافت اور دل فریبی کے ساتھ ایک دوسرے میں سمو دیا گیا ہے۔ ہر شعر سے مستی ٹپکتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ نشۂ رنگ نے عالمِ مستی کو زندگی کی حرکت میں مبدل کر دیا ہے۔ موجِ شراب کبھی تو رگِ تاک میں خون بن کر دوڑی پھرتی ہے اور کبھی رنگ کے نشہ پر لگا کر ہنگامۂ مستی میں بال کشائی کرتی ہے۔ رنگ کی مناسبت سے بال کشائی لطف سے خالی نہیں ؎

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہ پرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل

موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل

ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

داغؔ کے شعر ہیں ؎

دریائے الفت میں ملے کیا جانے آگے کیا بلا — پیش جبینِ یار ہے جو موج ہے ساحل کے پاس

کیا لطف دے رہی ہیں ادائیں عتاب کی — ہے موج بحرِ حسن میں وہ چیں جبیں نہیں

اصغرؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو — کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو

یا زندگی تو تھی ہر موج حوادث کی — یا موت کا طالب ہوں انفاسِ مسیحا سے

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

جرعۂ مے تری مستی کی ادا ہو جائے — موجِ صہبا تری ہر لغزشِ مستانہ بنے

جگرؔ کے ہاں ایک موج مے خانے کو بہائے جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں   آج اک موج بہالے گئی میخانے کو

جگرؔ کے کلام میں لفظ موج کی ایمائی جھلکیاں جا بجا دکھائی دیتی ہیں ؎

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

ترے جلوؤں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں   کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

ساقی کے فیضِ مست نگاہی کے میں نثار   ایک ایک موجِ مے کو رگِ جاں بنا دیا

کیسا قطرہ کس کا دریا، کس کا طوفاں کس کی موج
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے   جگرؔ

"موجِ ہوائے دردِ دل" کی ترکیب اور اس کی معنویت قابلِ داد ہے ؎

جس طرف وہ شوخ نظریں اٹھ گئیں   لے اڑی موج ہوائے دردِ دل

عہدِ حاضر کے چند دوسرے شاعروں کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار   نہ موجِ بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

(فانیؔ)

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

(فانیؔ)

لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے   موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا

(یگانہ)

کیوں کسی رہرو سے پوچھوں اپنی منزل کا پتا   موجِ دریا خود لگا لیتی ہے ساحل کا پتا

(آرزوؔ لکھنوی)

پردہ و نقاب :

نقاب خود رمز و طلسم کی کیفیت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ غزل کی رمز نگاری کے لئے یہ لفظ اور اس کے ساتھ جو مفہوم وابستہ ہے وہ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اردو غزل گو شاعروں کے دیوان حجاب و حیا کی مضمون آفرینیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس مضمون میں معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کی جو جو نزاکتیں پیدا کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشری زندگی کا سچا مرقع اور تحلیل نفس کے ماہر کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

کم تماشا نہیں یہ پردہ کچھ　　ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا

(میر)

ہم نے پہچان لیا منہ نہ چھپا تُو جاؤ　　ہم سے کیا منہ کو چھپاتے ہوئے تم جاتے ہو

(مصحفی)

مجھ میں اوسان نہیں رہنے کا　　پردہ مت منہ سے اٹھانا زنہار

(جرأت)

مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی　　نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا

(غالب)

جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے　　نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا

(غالب)

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا　　منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

(غالب)

ایک جگہ غالب اپنے محبوب کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہم سے خصوصیت سے منہ نہ چھپاؤ ورنہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہوں گے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اگر محبوب بیگانہ وار

بے حجاب رہے تو دوسروں پر محبت کا سوال نہیں کھل سکتا۔ حسنِ طلب کی بلاغت میں ایمائی اثر آفرینی کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں ؎

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے کہ محبوب غیر کے ساتھ بے حجابی سے پیش آتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کے ساتھ اُسے کوئی خصوصیت نہیں لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ اظہار رشک کی بڑی لطیف صورت پیدا کی ہے ؎

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں — جلوے نے تیرے آگ لگا دی نقاب میں
(شیفتہ)

دیکھا نہ ہوگا خواب میں بھی یہ فروغِ حسن — پردے کو اُس کے جلوے نے گلشن بنا دیا
(شیفتہ)

یہ شرمگیں نگہ یہ تبسّم نقاب میں — کیا بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں
(ذکی دہلوی)

ہمیں کو اُن کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں — وگرنہ واں کوئی پردہ نہیں حجاب نہیں
(اعظم الہ آبادی)

نگاہِ شوق نے کیا خواب میں نہیں دیکھا — نیا حجاب ہے چھپتے ہو روبرو ہو کر
(داغ)

در پردہ جوشِ حسن نے بے پردہ کر دیا — ٹوٹی گرہ تڑاق سے بندِ نقاب کی
(داغ)

تمہیں چہرے سے نقاب اپنے اٹھا دو ورنہ — نگہ شوق کو بھی رخنہ گری آتی ہے
(داغ)

داؔغ کا دعویٰ ہے کہ محبوب چاہے چھپنے کی کتنی کوشش کرے لیکن وہ چھُپ نہیں سکتا اس لئے کہ میری نگاہ میں کون و مکاں کے جلوے سمائے ہوئے ہیں ؎

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

باوجود حجاب کے نگہ شوق میں محبوب کا جلوہ موجود رہتا ہے۔ اس شعر میں اثبات ونفی سے حسنِ کلام کے جوہر کو خوب چمکایا ہے ؎

اُف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
اُف رے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

(داؔغ)

وہ دیکھ کر مجھے بے پردہ کیوں ہوئے اے دل
نگاہِ شوق نے سمجھا دیا نقاب میں کیا

(تسلیم لکھنوی)

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے حجاب
حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا

(جلال)

شوخی نے رخنے ڈال دیئے ہیں حجاب میں
سو بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں

(عاشؔق دہلوی)

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے
وہ تو کہ چھوڑ دیا ہے نقاب کر کے مجھے

(وفاؔ رامپوری)

بے مثالی کے ہیں یہ رنگ جو باوصفِ حجاب
بے نقابی پہ ترا جلوۂ یکتا کیا ہو

(حسرؔت)

چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

(حسرؔت)

وہ بے نقاب ہوئے بھی تو کیا ہوا کہ رہے
ہجومِ حسن کے پردے نقاب کے بدلے

(حسرؔت)

جمالِ بے حجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا کلیم برقِ طور تھی کہ تار تھا نقاب کا

(فانیؔ)

جمالِ خود رُخ بے پردہ کا نقاب ہوا نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

(فانیؔ)

ہیں خود محوِ حسن میں شانیں حجاب کی مجھ کو خبر رہی نہ رُخ بے نقاب کی

(اصغرؔ)

جمالِ ہوش رُبا خود ہے پردہ دار اپنا نقاب اٹھا کے بھی وہ بے نقاب ہو نہ سکا

(آرزوؔ لکھنوی)

پردے کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی جو دیکھنا تھا اہلِ نظر دیکھتے رہے

(آرزوؔ لکھنوی)

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں ہتی ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

(جگرؔ)

اسی سے دل کا ہر اک نقش جلوہ تاب ہوا مری نظر نہ ہوئی آپ کا حجاب ہوا

(جگرؔ)

قفس و آشیاں:—

قفس و آشیاں کی رمزی علامت میں اردو غزل گو شاعروں نے جدّت ادا کا حق ادا کیا ہے۔ یہ محض جدّتِ ادا اور حسنِ تخیل ہے جس کی بدولت فرسودہ مضمون میں بھی تازگی اور شگفتگی آجاتی ہے۔ لفظ کے معمولی معنوں سے زیادہ اہمیت اس بات کو ہے کہ اس کو برتنے والے کے ذوق و وجدان میں اس کا کیا مفہوم ہے۔ قفس اور آشیانے کے معمولی لفظوں کو ہمارے شاعروں نے علامتی طور پر برتا اور ان سے طرح طرح کی معنی آفرینی کی ہے۔ خاص طور پر متقدمین نے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے

(میرؔ)

کیسا کیسا قفس سے سر مارا — موسمِ گل میں ہم رہا نہ ہوئے

(میرؔ)

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(غالبؔ)

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

(مومنؔ)

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے — نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوارِ گلشن تک

(نسیمؔ دہلوی)

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

(اصغرؔ)

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے — ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

(اصغرؔ)

گل چیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے — تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دُور تھا

(ثاقبؔ لکھنوی)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقبؔ لکھنوی)

برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر — آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی

(ثاقبؔ لکھنوی)

تعلقاتِ چمن قطع کر رہی ہے صبا — قفس پہ گرتے ہیں تنکے مرے نشیمن کے

(آرزوؔ لکھنوی)

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے　　میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

(فانی)

فصلِ گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا　　فصلِ گل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

(فانی)

قفس سے چھوٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا　　وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

(فراق)

ہماری شاعری میں اسی طرح کے بیسیوں علامتی لفظ ہیں جو باوجود پیش پا افتادہ اور بظاہر فرسودہ ہونے کے حسنِ استعمال سے ایمائی اور طلسمی اثر کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل کسی زبان کا کوئی لفظ کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا۔ نئے لفظ اور نئی بندشیں بیکار ہیں اگر ان میں ایمائی اثر آفرینی نہ ہو۔ اور اگر شاعر رمزی اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تو وہ پرانے اور رسمی لفظوں میں نئی جان ڈال دے گا۔ مثلاً چند رسمی لفظ یہ ہیں۔ رہرو اور منزل، کشتی اور ساحل، شمع اور پروانہ، گل اور بلبل، بہار اور خزاں وغیرہ ان کی مثالیں دینے میں بڑی طوالت ہو گی۔ ان سب رمزی علامتوں کو ہمارے شاعر دو سو برس سے برت رہے ہیں لیکن آج بھی ہمیں ان میں عجیب و غریب لطف ملتا ہے۔ یہ اعجاز ہے ان لفظوں کی رمزی اور طلسمی خاصیت کا۔ ان سب لفظوں کے ساتھ جذبات کی تاریخ وابستہ ہے۔ ان جذباتی تجربوں میں پشتوں کا تحت شعوری احساس کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ اب بھی ہمیں چونکا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں انسانیت کی جذباتی قدریں پوشیدہ ہیں۔ ان لفظوں کے ذریعہ فکر خود اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگتی ہے اور اندرونی نغمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

قادر الکلام شاعر لفظوں کو فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ وہ اگر کسی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کے پیش رو پہلے برت چکے ہیں تو باوجود اس کے وہ اپنی

شخصیت کے اثر سے اور حُسنِ ادا سے اس میں تازگی اور ندرت پیدا کر دے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے کی وجہ سے فرسودہ نہیں ہو جاتا۔ اچھا شاعر اپنے نفسِ گرم سے مضمحل اور مُردہ لفظوں میں بھی نئی رُوح پھونک دیتا ہے۔ غزل گو شاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں جو ذہن کو حقیقت کی طرف منتقل کرتی ہیں۔ تغزّل کا یہی طلسم یا اعجاز ہے جو اس صنفِ سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا اور جو شاعر اس قسم کا جادو جگا سکے گا۔ اسی کو استادی کا فخر نصیب ہو گا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہو جاتا۔ وہ اسی کا ہو جاتا ہے جو اس کو اچھی طرح برت سکے۔ اس باب میں تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتا اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے اسی کو کچھ عرصے بعد باندھا اور اپنے پیش رو کے مضمون کے مقابلے میں اس کو زیادہ بلند کر دیا یا اس میں کوئی ندرت پیدا کر دی تو وہ مضمون اس کا ہو جائے گا۔ نظیریؔ کا مشہور شعر ہے ؎

بوئے یارِ من ازیں سُست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سوداؔ نے تھوڑے سے تصرّف سے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ؎

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

مومن خاں کا شعر ہے ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنّت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

غالبؔ نے اسی مضمون کو دوسری طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اور بلند کر دیا ہے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سوداؔ کا شعر ہے ؎

ساقی ہے اک تبسّمِ گل موسمِ بہار ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

غالبؔ نے اسی مضمون میں کیا طرفہ کاری دکھائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عمر برق کی طرح تیز رفتاری سے گزری چلی جا رہی ہے۔ اس کی رواروی میں انسان کو بس اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ اپنا دل خون کر سکے اور بس!

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

دوسری جگہ کہا ہے ؎

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

ذوقؔ نے اسی مضمون کو زیادہ بلیغ انداز میں ادا کیا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خواجہ میر دردؔ کہتے ہیں کہ حضورِ یار میں انسان ہی نہیں غیر جاندار اشیاء بھی رعب حسن سے متاثر ہوتی ہیں ؎ رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

داغؔ نے اسی مضمون کو اپنی شوخ بیانی سے چار چاند لگا دیئے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

غالبؔ نے شوقِ پابوسی کے مضمون پر معاملہ بندی کا شعر کہا ہے جس میں فکر اور تخیلؔ پر حسیّ تجربہ غالب ہے ؎

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا

حسرت نے اسی مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا۔ ان کا شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے اے شوق پا بوسی
نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطفِ ایما کو

رنگ و بُو کے شعری محرکات

اگرچہ طرزِ ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے لیکن اس کی تاثیر لفظی استعمال کے بعض مخصوص طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔ دراصل غزل ایک طرح کا طلسم ہے۔ غزل نگار شاعر اس طلسم کے بھیدوں کو جانتا ہے۔ اس کو لفظوں کے استعمال کے ذریعے ایسی قوتیں عطا کی گئی ہیں جنہیں دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ شاعرانہ لفظ انسانی ذہن کو اس کے بندھنوں سے رہا کرتے ہیں اور ان سے جذبے اور تخیل کی بے پناہ قوتوں کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اُن سے بڑھ کر اثر آفرینی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بعض ایسے لفظ ہیں جن سے رمزی کیفیت کی اثر آفرینی ایک خاص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً وہ لفظ جن سے رنگ و بُو کے محرکات کی تخلیق ہوتی ہے اور وہ غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ غزل گو شاعر پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نشے کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ جس طرح نشے کی حالت میں رنگ و بُو دونوں کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح داستان شوق بیان کرنے والے پر ان دونوں جذباتی محرکوں کا اثر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ بعض وقت رنگ و بو جذباتی زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ذریعے تحت شعور کی یادیں برانگیختہ ہوتی ہیں جو تخلیق کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ بُو کی مستی عشق و محبت کی مستی سے کچھ ملتی جلتی ہوتی ہے جس کی وہ یاد دلاتی ہے۔ بُو اور محبت میں بڑا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ انسانی ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں بُو کے محرک کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہوگی۔ جس کو ہمارا تحت

شعور اب تک بھولا نہیں۔ محبت میں اس کی یادیں بڑی شدت کے ساتھ ابھر آتی ہیں جیسے سمندر کی لہریں اس کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور اس کی پشت پر پورے سمندر کی قوت اور جوش اور حرکت کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ان یادوں کی پشت پر بھی زندگی کے ارتقاء کی پوری تاریخ ہے۔ زندگی کو فراوانی بخشنے اور اس کو جاری رکھنے میں قوت شامہ سے مدد ملی ہوگی۔ جبھی تو وہ آج تک اس کا احسان مانتی ہے اور جب کبھی اس سے سامنا ہو جاتا ہے تو بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی جانفزا اور لطیف پرسکون کیفیتوں میں زندگی کی جذباتی اور تحت شعوری سمندر کی قوتیں اور لہریں پوشیدہ ہیں جن کا مدوجزر اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانیت اور اس کے سوز و ساز کا اتار چڑھاؤ۔ اس سے بڑھ کر شاعر کو اور کون سی رمزی اور طلسمی علامت ہاتھ آسکتی ہے۔ اسے وہ عشق کے عینی رمز کے طور پر برتتے تو ایک زبردست شاعرانہ حقیقت اس کے قابو میں آجائے گی۔

اسی طرح رنگ بھی زندگی کی تازگی اور لطافت کا معنوی رمز ہے۔ چمن اور بُو کے رموز اور استعاروں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ بہار جو زندگی کی بارآوری اور شادابی سے عبارت ہے طوفان رنگ کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ غالب نے ایک جگہ یہ خیال بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے کہ بزم عالم میں رنگ کا پیمانہ گردش میں ہے۔ ہستی کے طوفان بہار کے آگے خزاں ہیچ ہے۔ خزاں یعنی افسردگی اور موت، بہار یعنی زندگی کی رنگینیوں اور شادابیوں پر غالب آجانا چاہتی ہے لیکن اسے زک اٹھانی پڑتی ہے۔ شعر ہے۔

پیمانۂ رنگیست دریں بزم بہ گردش

ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں ہیچ

علم نفس کا ماہر اس کی چاہے کچھ بھی توجیہ پیش کرے لیکن توجیہ سے حقیقت کی تاثیر اور تاثر تو نہیں بدلتے۔ رنگ اور بُو دونوں میں بے پناہ ایمائی اور طلسمی خاصیت

پائی جاتی ہے۔ جو دراصل اندرونی کیف ونشاط کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اردو کے غزل گو شاعروں نے اس لطیف حقیقت کو ہر زمانے میں محسوس کیا۔ جدید شاعروں میں حسرتؔ کے یہاں ان شعری محرکوں کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ دوسروں کے یہاں بھی اس احساس کی کمی نہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اے صبا کس طرف سے آتی ہے — تجھ سے بوئے نگار آوے ہے
ٹک ادھر بھی گزر کہ اس بُو سے — میرے دل کو قرار آوے ہے

(شاہ مبارک آبروؔ)

اے رشک گل کرے ہے عبث جستجوئے عطر — یک شمہ تجھ شمیم بدن سے ہے بوئے عطر
ہو جس دماغ میں مرے گل پیرہن کی بُو — بیدارؔ ہو نہ اس کو کبھی میل بوئے عطر

(بیدارؔ دہلوی)

بھاتی نہیں ہے باس کسی گل کی اے صبا — کس کی ہوا ہے بُو سے معطر دماغ و دل

(بیدارؔ دہلوی)

کیوں نہ لے گلشن سے باج اس ارغواں سیما کا رنگ
گل سے ہے خوش رنگ تر اس کے حنائے پا کا رنگ

(بیدارؔ دہلوی)

گو گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بُو — آتا نہیں نظر وہ طرحدار ایک طرح

(میرؔ)

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہ جائیں نہ کیوں
منہ بوے ہے یارہ گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی

(میرؔ)

کیا کوئی اس کے رنگوں گل باغ میں کھلا ہے — شور آج بلبلوں کا جاتا ہے آسماں تک

(میرؔ)

نکہتِ خوش اُس کے پنڈے کی سی آتی ہے مجھے
اس سبب گُل کر چمن کے دیر میں نے بُو کیا

(میرؔ)

گُل پیرہن نہ چاک کریں کیونکر رشک سے کس مرتبے میں شوخ ہے اس کی قبا کا رنگ

(میرؔ)

موئے دلبر سے مشک بُو ہے نسیم حال خوش اُس کے خستہ حالوں کا

(میرؔ)

میرؔ صاحب نے گُل کے رنگ و بُو دونوں کو دنیا کی ناپائیداری اور اس کی بیوفائی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور اُن سے شعری محرک کا کام لیا ہے۔ شعر ہے ؎

بوئے گُل اور رنگ گُل دونوں ہیں دلکش اے نسیم
لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

ایک دوسرے شعر میں گُل کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بُو سے اپنی بے خودی کے پیدا ہونے کی توجیہ کی ہے کہ اس سے کسی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ گویا بُو انتقالِ ذہنی کے لئے ایک وسیلے کا کام دیتی ہے۔ شعر ہے ؎

سحر پائے گُل بے خودی ہم کو آئی کہ اس سست پیماں میں بُو تھی کسو کی

انعام اللہ خاں یقین کا شعر ہے ؎

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند برگِ گُل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا[1]

---

[1] آنند رائے مخلص کا بالکل اسی مضمون کا فارسی شعر ہے ؎

ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گُل بندِ قبائے کیست کہ وامی کنیم ما

(تذکرہ میر حسن ص ۲۰۲ ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو)

سوداؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

خطا ہے زلف کو تیری کہوں جو مشکِ ختن — سیاہ فام تو وہ ہے پہ ایسی بُو معلوم

بحرؔ لکھنوی کا شعر ہے ؎

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں — مجھ کو اس پھول سے خوشبوئے وفا آتی ہے

اثیرؔ لکھنوی کا شعر ہے ؎

چمن سے مر کے نہ نکلے کسی طرح بلبل — بدن سے جان جو نکلے تو گل میں بُو ہو جائے

داغؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کیا صبا کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے — مجھ کو اپنے دلِ گم گشتہ کی بُو آتی ہے

غرور کیوں نہ ہو جب دل سی چیز ہاتھ لگے — بڑا دماغ تری زلفِ مشک بُو نے کیا

جب سے بسی ہوئی کسی گلگوں قبا میں ہے — میں کیا کہوں کہ نکہتِ گل کس ہوا میں ہے

زہے تلاش کہ سرگرم جستجو ہو کر — ملا ہوں رنگ میں رنگ اور بُو میں بُو ہو کر

اُس کی گلی سے آئے کیوں، نکہتِ زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض

لہ امامِ غزل حافظؔ شیرازی کے اشعار میں بھی بُو کا شعری محرک جا بجا ملتا ہے۔ نکہتِ گل کے متعلق لسان الغیب سے سنیئے ؎

در آں چمن کہ نسیمے وزد ز طرۂ دوست — چہ جائے دم زدنِ نافہائے تاتاریست

در مجلسِ ما عطر میامیز کہ جاں را — ہر لحظہ ز گیسوئے تو خوشبوئے مشام است

اگر تو شانہ زدی زلفِ عنبر افشاں را — کہ باد غالیہ سا گشت خاک عنبر بوست

تاب بنفشہ می دہد طرۂ مشک سائے تو — پردۂ غنچہ می درد خندۂ دل کشائے تو

(بقیہ بر صفحہ ۲۱۵)

اس غنچے میں سمائی ہے وحشت بہ رنگ بو   دل کتنی تنگیوں پہ بیاباں ہو گیا

مصحفیؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیکھا ہے تجھ کو جلوہ کناں جب سے چمن میں   ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر   لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

جرأتؔ کے شعر ہیں ؎

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی   بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلہن کی سی

بو محبت کی نسیم آہ سے کھلتی ہے واں   گرچہ سو پردوں میں جوں غنچہ چھپائے جائیے

سنگھا بدن کو کہا کس مزے سے چتون میں   ربودگی یہ کسی عطر کی بھی بو میں نہیں

ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے   جوں بوئے گل کرے ہے زخود رفتہ بو مجھے

جعفر علی حسرتؔ کے شعر ملاحظہ طلب ہیں ؎

بہار ہو چکی اور شور بلبلوں کا گیا   مرے دماغ سے اس گل کی ہائے بو نہ گئی

بوئے یوسف مگر آئی نہیں کنعاں میں ہنوز   کہ صبا ڈھونڈے ہے اس بو کو گلستاں میں ہنوز

غالبؔ کے خیال میں پھول رنگ کے نشے سے مست ہو کر اپنی بند قبا حسینوں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۱۴)

مجلس بزم عیش را غالیہ مراد نیست   اے دم صبح خوش نفس نافہ زلف یار کو

صبا تو نکہت آں زلف مشکبو داری   بیادگار بمانی کہ بوئے او داری

زمانہ گر بہم مشک ختن دہد بر باد   فدائے تو کہ خود خال مشکبو داری

بہ بوئے زلف و رخت می روند و می آیند   صبا بہ غالیہ سائی و گل بہ جلوہ گری

کی طرح کھول دیتا ہے۔ حسنِ تعلیل لاجواب ہے ؎

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل ۔۔۔ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غالب کے اسی مضمون کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں نے جنوں میں کی جو اسدؔ التماسِ رنگ ۔۔۔ خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں رنگ کی گرمی چمن کی تباہی کا موجب نہ بن جائے۔ سایۂ گل میں اُسے داغ اور نکہتِ گل میں اُسے موجِ درد نظر آتی ہے۔ رنگ و بُو کے دونوں شعری محرکوں کو اس شعر میں ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے ؎

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل، موجِ درد
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر ہیچ ۔۔۔ (نسخہ حمیدیہ)

ظفرؔ کے شعروں میں خوشبو کا حسّی تجربہ خاص طور پر نمایاں ہے ؎

؎ بمقابلۂ بو غالب رنگ کے شعری محرک سے زیادہ متاثر ہے۔ یہ بات اس کے دو مخصوص رجحانوں کی آئینہ دار ہے۔ ایک تو اس کے احساس و ذہن کی لطافت اور دوسرے اس کا رنگ کا حرکی نقطۂ نظر۔ رنگ میں بہ نسبت بو زیادہ لطافت ہے۔ رنگ کا احساس روشنی کی موجودگی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ گویا ہماری نظر کو کسی مادّی توسط کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ برخلاف اس کے بُو میں مادّے کے ذرّات فضا کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔ چونکہ رنگ موجوں کے توسط سے ہماری نظر تک پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ سراسر حرکت ہے اور بو کی طرح اس میں مادّیت مطلق نہیں۔ فطرت میں ہر طرف رنگ ہی رنگ ہے۔ اگر کائنات کو صرف عالمِ رنگ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۱۷)

گل بدن تیرے بدن کی کیا کہوں خوشبو کرو داں　　نے چنبیلی کی ہے بو ایسی نہ جوہی کی ہے بو

شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی مہک پھر ویسی ہی

جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہی

مجروحؔ دہلوی کا شعر ہے ؎

کسی کی کاکلِ مشکیں کی نکہتِ خوش نے　　گلِ شگفتہ میں چھوڑا نہ رنگ و بُو باقی

مومنؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

خوش آئے مجھ کو صبا کب گلوں کی باغ میں بُو　　بھری ہوئی ہے یہاں اور ہی دماغ میں بُو

یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے　　آئی چمن میں نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

کس کی زلفوں کی بُو نسیم میں تھی　　ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں

تنقید کہتا ہے ؎

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۱۶) اس پر تعجب نہیں کہ رنگ کی طلسماتی دلفریبی نے غالبؔ کو متاثر کیا۔ اس کے اردو دیوان میں ایسے شعر کثرت سے ہیں جن میں یہ شعری محرک ملتا ہے جو اس کی لطافت طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ویسے بُو کے شعری محرک کی مثالیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں لیکن رنگ کا محرک غالب ہے۔

گل و صبح والی غزل پوری کی پوری رنگ و بو کے محرکات کے تحت لکھی گئی ہے۔ رنگ کے ساتھ گل اور صبح کی تازگی بھی معنوی محرک کی حیثیت رکھتی ہے

دعویٔ عشق بتاں سے بہ گلستاں گل و صبح　　ہیں رقیبانہ بہم دست و گریباں گل و صبح!

ساقیٔ گل رنگ سے اور آئینہ زانو سے　　جامہ زیبوں کے سدا ہیں نہ داماں گل و صبح

آئینہ خانہ ہے صحن چمنستاں یکسر　　بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسدؔ　　غفلت آرائی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

(بقیہ بر صفحہ ۲۱۸)

خالِ عارض پہ گماں عنبرِ اشہب کا ہوا   سونگھ کر زلف کی بُو مشکِ ختن یاد آیا

نگی مراد آبادی کا شعر ہے ؎

عشق شہ ہے رنگِ حنا کو کہ یہ کس خوبی سے   بوسہ لیتا ہے ترے ہاتھ کی زیبائی کا

محرکِ بُو کا مضمون نسیم دہلوی کے یہاں ملاحظہ ہو ؎

چارہ گر سودا ہے بوئے زلفِ برہم کا مجھے

قید کر زنجیرِ موجِ نکہت برباد ہیں

تسلیم کا شعر ہے ؎

شمیم یار نہ جب تک چمن میں چھو آئے   نہ رنگ اُڑے کسی پھول پر نہ بُو اُٹھے

برقؔ نے رنگ و بو کے مضمون کو اپنے شعروں میں اس طرح پیش کیا ہے ؎

نکہتِ زلف سے اے برقؔ معطر ہے دماغ   دم جیسے ہیں مجھے بادِ صبا کے جھونکے

ملتا ہے بوئے گل سے نشاں بوئے یار کا   نقشہ ہے بوئے گل میں گلِ روئے یار کا

موجِ نسیم سے نہ پریشاں ہو کیوں دماغ   دیوانہ ہوں میں نکہتِ گیسوئے یار کا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۱۸) اس شعر میں رنگ و بُو دونوں کے معنوی محرکات کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ نکہتِ گل کو موجِ درد کی تشبیہ سے ظاہر کرنا اور رنگ میں گرمی محسوس کرنا غالبؔ ہی کا حصّہ ہے ؎

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل موجِ درد

رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

بہارِ نالہ اور رنگینیٔ فغاں کی ترکیبیں اور تصورات بالکل انوکھے ہیں۔ شاعر نے ان میں رمز و طلسم کے خزانے چھپا دیئے ہیں ؎

طراوتِ سحر ایجادی ہے اثر یکسو   بہارِ نالہ و رنگینیٔ فغاں تجھ سے

؎ آفریں ہے۔

بڑھ گیا اور جنوں بُو جو تمہاری آئی بن کے زنجیر بلا بادِ بہاری آئی

مٹی سرشت پاک میں یہ کس چمن کی ہے پھولوں میں بُو تمام تمہارے بدن کی ہے

رنگ اس شوخ کا شوخی سے چوا پڑتا ہے پاؤں جس خاک پہ رکھتا ہے حنا ہوتی ہے

جلالؔ کے شعر ملاحظہ ہوں۔ زلفِ یار کا تصوّر جنونِ شوق کے لئے سامانِ بہار مہیا کرتا ہے ؎

بعد مدت اے جنوں تیری بہار آنے کو تھی
ہوش بھتے جانے کو بوئے زلفِ یار آنے کو تھی

جلالؔ نے ایک جگہ بُو کو جذباتی محرک کی حیثیت سے بڑی خوبی سے برتا ہے تحلیل نفسی کے ماہر ممکن ہے اس سے جنسی طلب و تکمیل کی توجیہ کریں لیکن اگر ایسا ہے تو پھر شعر کی اعلیٰ شعریت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

وحشی وہ ہیں کہ ہم کو لگا لائی بوئے گل پوچھی بہار میں نہ کسی سے چمن کی راہ

ایک، دوسرے شعر میں گل داغِ عشق میں رنگ و بُو کے محرک کو اس طرح محسوس کیا ہے ؎

کیا پھول ہے جلالؔ گُلِ داغِ عشق بھی
گہ اس کی بُو سے مست ہوں گہ غش ہوں رنگ پر

دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

تمہارے وعدوں نے بدلیں صورتیں بے اعتباری کی کبھی بوئے وفا ٹھہرے کبھی رنگِ حنا ٹھہرے

بادِ صبا کی بد دماغی کی شکایت ملاحظہ ہو ؎

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

میر صاحب کو بھی بادِ صبا کی بد دماغی کی شکایت رہے فرماتے ہیں ؎

لگ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے آنے میں بادِ صبح کو یاں اک دماغ ہے
شاید اُس زلف سے لگی ہے میرؔ باؤ سے اک دماغ نکلے ہے

حنا لکھنوی کا شعر ہے ؎

صبحِ جنّت سے نہیں کچھ کم بیاضِ روئے دوست
نکہتِ گلہائے گلزارِ جناں ہے بوئے دوست

حسرتؔ نے رنگ و بُو کے رمزی اور طلسمی اثر کو جس خوبی سے اپنے عاشقانہ کلام میں استعمال کیا ہے۔ اس کی مثالیں کہیں اور نہیں ملتیں۔ رنگِ حیا، خوشبوئے حیا، خوشبوئے حسن، خوشبوئے آرزو، بوئے وفا، اور خوشبوئے دلبری کی ترکیبوں اور رمزی علامتوں میں بلا کی ایمائی قوت ہے جس سے حسرت نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان میں داخلیت اور خارجیت اس خوبی سے ایک دوسرے میں سمو گئی ہیں کہ ان کی دوئی باقی نہیں رہی۔

حسرتؔ کے ہاں خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو عشقِ شیریں کار کا کرشمہ ہے ؎

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

اب حسرتؔ کے کلام میں رنگ و بُو کے شاعرانہ محرکوں کی رنگا رنگی ملاحظہ فرمایئے ؎

جانفزا تھی کس قدر یا رب ہوائے کوئے دوست
بس گئی ہے جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست

ہو چکی اب ہم گرفتارانِ فرقت کو نصیب
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست

اس پوری غزل میں بُو کے جذباتی اور شعری محرک کی لپٹیں موجود ہیں ؎

جس نے سونگھی ہو تری زلفِ سیاہ کار کی بُو	کیا پسند آئے اُسے نافۂ تاتار کی بُو
آج تک جس سے معطّر ہے محبّت کا مشام	آہ کیا چیز تھی وہ پیرہنِ یار کی بُو
بے پئے مست کئے دیتی ہے اے پیرِ مغاں	مے پرستوں کو ترے ساغرِ سرشار کی بُو

ہوس انگیز تمنا ہے لبِ یار کا رنگ — روشنی بخش نظر ہے لبِ گلنار کی بُو
دلدہی سے بھی تری بڑھ کے ہے کچھ روزِ فراق — دلنوازی ہیں ترے نامۂ دلدار کی بُو

ہجرِ ساقی میں یہ حالت ہے کہ اب جائے ہے سر — بوئے مے وجہِ غمِ بادہ کشاں ٹھہری ہے

آشنا ہو کے بوئے یار سے ہم — سخت بیزار ہیں قرار سے ہم

میں اس طرۂ زلفِ مشکیں کو حسرت — سے پئے غارتِ جاں دوڑنا چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی طرف — آہ وہ نکہتِ برباد کہ برباد نہیں

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

یادِ شہر و کوئے یار آنے لگی — آرزو کو بوئے یار آنے لگی
شوقِ مخمورِ ہوس ہونے لگا — نکہتِ گیسوئے یار آنے لگی

پیرہن کوئی اتارا نہ انہوں نے حسرت — وہ کہ خوشبوئے محبت سے ہم آغوش نہ تھا

ہے بوئے شوق سے جو معطر مشامِ جاں — ارماں نہیں ہوائے جناں کی شمیم کا

خوشبو ترے ملبوس کی لائی ہے کہاں سے — تجھ تک نہ ہوا تھا جو گزر بادِ صبا کا

سونگھی تھی جو اک بار وہ خوشبوئے گریباں — اب تک یہ اسی بوئے گریباں کا نشہ ہے

کیا کیجئے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت — خوشبو میں ہے گل بُو تو لطافت میں ہے سب رنگ

پائی ہے جگہ پاکیٔ دامانِ نظر میں — خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر

اک بار بس گیا جو کہیں اُن کی باس میں
خوشبوئے حُسن برسوں رہی اس لباس میں

رفتہ رفتہ مٹ رہی ہے جور بیداد سے
رنگ میں بوئے وفا میں نکہت برباد کے

خوشبوئے حیا کے علاوہ رنگِ حیا کا مضمون اس طرح باندھا ہے ؎

عمزۂ دل فریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیاد کر

رنگِ حیا کی ترکیب کو دوسری جگہ اس طرح استعمال کیا ہے ؎

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
اُن میں یہ سحرکاری رنگِ حیا ہے کیا

خوشبوئے دلبری کی ترکیب ملاحظہ طلب ہے ؎

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

محبوبیٔ و رنگینی ہیں جزو بدن تیری
سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

پیرہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

کیا کیا ہوس کو آتی ہے خوشبوئے آرزو
آنکھیں جب اپنی ملتے ہیں اُن کی ردا سے ہم

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت
گھیر لیتی ہے انہیں زلفِ معنبر کیا خوب

تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں
شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

وصل میں بوئے جسمِ یار کو آج
شوق ہے پردۂ قبا نہ رہے

مشک و عنبر میں یہ تفریح کے سامان کہاں
پیرہن اُن سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوشبو تیرا

دامنِ حسن ترا شوقِ شہادت نے مرے
عطرِ خوشبوئے محبت میں بسا کر دیکھا

یہی لائی ہے اڑا کر ترے ملبوس کی بو
بے خودی ہائے تمنا کی صبا ہے باعث

حسرتؔ مجھے بھاتی ہے پریشانی دل بھی آئی ہے جو اس گیسوئے ابتر سے نکل کر

قریب ہے کہ ترے گیسوئے دراز کی بو نسیم باغ جوانی کو مشک بار کرے

رنگ و بُو کے حسی تجربے کے شعری محرک فارسی شاعروں کے یہاں بھی ملتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اردو غزل میں خیال کی جو لطافت اور نزاکت نظر آتی ہے وہ بہت کچھ فارسی شاعری کے اثر سے ہے۔ اہل ایران کسی چیز کی خوبی یا کمال ظاہر کرنے کے لئے رنگ و بو کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ فردوسی نے ان دونوں لفظوں کو اسی معنی میں برتا ہے۔ وہ فوج کی تعریف ان نازک لفظوں سے اس طرح بیان کرتا ہے ؎

سوئے شہر ایراں نہادند روئے سپاہی بداں گونہ با رنگ و بوئے

رنگین ادائی اور رنگین بیانی وغیرہ کی ترکیبیں بھی اُردو میں فارسی سے آئیں۔ اس کے علاوہ رنگ و بُو کے ساتھ اور دوسرے لاتعداد محاورے اُردو میں استعمال ہونے لگے لیکن سب میں خوبی اور کمال کا پہلو موجود رہا۔

شیخ سعدیؒ نے بُو کے شعری محرک کو اخلاقی غرض کے لئے اپنی اس منظوم حکایت میں استعمال کیا ہے جو تمثیل (الیگری) کے انداز میں ہے۔ انہیں دستِ محبوب سے جو خوشبودار مٹی ملی اور اُس نے اُس سے جو گفتگو کی وہ ان لفظوں میں تھی جو بلاغت کی جان ہیں ؎

گِلے خوشبوئے در حمام روزے فتاد از دستِ محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دل آویزِ تو مستم
بگفتا من گِلے ناچیز بودم ولیکن مدّتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

سعدی، حافظ اور فارسی کے دوسرے اساتذہ کے کلام میں رنگ و بو کے محرکوں کی مثالیں موجود ہیں لیکن اتنی کثرت سے نہیں جتنی اردو میں۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ایران کے مقابلے میں ہندوستان گرم ملک ہے۔ یہاں کے باشندوں کو ان محرکوں کا احساس جتنی شدت سے ہوتا ہے وہ نسبتاً ٹھنڈے ملکوں کے لوگوں کو نہیں ہوتا لیکن اس احساس کی شدت کے لئے صرف گرم آب و ہوا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ شعری ذوق و امتیاز کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ ہندوستان کے ان شاعروں کے ہاں جنہوں نے فارسی میں شعر کہا اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ غنی کشمیری نے تو کہا ہے کہ محبوب کا رنگِ حنا میری فکر رنگیں کے لئے محرک ہوتا ہے ؎

جلوۂ حسن تو آوردہ مرا بر سرِ فکر — تو حنا بستی و من معنیٔ رنگیں بستم

اس ضمن میں اردو کے شاعروں کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ طلب ہیں ؎

ہم بوئے دوست تجھ کو سنگھائیں گے شیفتہ — محوِ شمیمِ طرّہ عنبر فشاں نہ ہو

(شیفتہ)

بوئے گل لائی تو ہے یار کی بُو کے بدلے — اس تری چھیڑ کو ہم بادِ صبا جانتے ہیں

(مجروحؔ)

کیا چمن میں ہے گئی بوئے گریباں اُس کی — آج غنچہ کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں

(مجروحؔ)

لا لے اس کی شمیم عطر آگیں — مجھ کو تڑپا دیا صبا تو نے

(مجروحؔ)

یہ قدغن ہے نہ لے جا نکہتِ زلف — وہ بدخواب تو لڑتا ہے ہوا سے

(مجروحؔ)

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں — مجھ کو اس پھول سے خوشبوئے وفا آتی ہے

(بحر لکھنوی)

اشک میں رنگ گل شراب میں بو   موجِ بادِ بہار میں دونوں

(نامعلوم)

وہ نونہالِ خوبی، نازک ہے دلربا ہے   عالم ہے اُس کی بُو میں گل کی شمیم کا سا

(رنگیؔ دہلوی)

کاکل جانفزا کی بُو سونگھ چکی ہے اے صبا   کچھ تو سمجھ کے ذکر کر عنبر و مشک و عود کا

(شادؔ عظیم آبادی)

بوئے وفا کہاں چمنِ روزگار میں   دل ہٹ گیا ہے جیسے کوئی پھول جھڑ گیا

(یگانہ)

طرۂ گیسوئے جاناں! تری نکہت کی قسم   میں نے دیکھا تھا مگر مشکِ ختن یاد نہیں

(ثاقبؔ لکھنوی)

جذبِ شمیم زلف ہے دانۂ دام سے سوا   سینکڑوں دل کھنچ اٹھے ہیں گیسوئے مشکبار میں

(ثاقبؔ لکھنوی)

مرے لہو سے اگر ہو کے سرخرو آئے   ملو تو برگِ حنا میں وفا کی بُو آئے

(ثاقبؔ لکھنوی)

اُوپر کے شعر میں یہ خیال بالکل اچھوتا ہے کہ حنا سے بجائے رنگ وفا کے بوئے وفا پیدا ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے نزدیک بمقابلۂ بو رنگ زیادہ قوی شعری محرک ہے۔ شاعر کا یہ اشارہ بھی لطف سے خالی نہیں کہ حنا میں صرف رنگ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک خاص قسم کی بُو بھی ہوتی ہے۔ جس کی لپٹوں میں رُوحِ مستی اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہے ؎

دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں   رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

(جلیلؔ)

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے — کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

(جلیل)

سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلفِ مشکبو — کیا کیا ملا رہا ہوں نسیمِ سحر کو میں

(جلیل)

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے — کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بُو تیری

(جلیل)

مرزا یگانہ کے اس شعر میں رنگ تماشا اور بوئے تمنا کی ترکیبیں ایمائی تازگی سے لبریز ہیں ؎

حیراں ہیں نظر والے، بیتاب ہیں دل والے
کچھ رنگ تماشا سے، کچھ بوئے تمنا سے

یگانہ کے اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

حریمِ ناز میں کب تک گھٹے گی بوئے پیراہن — ہوائے شوق میں لازم ہے اک دن منتشر ہونا

یاد آئی بوئے پیرہن یار نامحا — اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے — جذبِ صادق غائبانہ رہنما ہو جائے گا

بسی ہے نکہتِ آوارہ کن نازک دماغوں میں — مبارک ہستئ برباد پر مغرور ہو جانا

کیوں نکہتِ آوارہ جامے سے نہ ہو باہر — کس دن کو وفا کرتی پیراہن رسوا سے

جگر کے کلام میں رنگ و بو کے شعری محرک ملاحظہ ہوں ؎

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بُو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

جا بھی اے ناصحِ ناداں نہ کر اُس کو بدنام — ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
شباب رنگیں، جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

اصغر کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اے دلِ شوخ و حیلہ جو زیر کمینِ رنگ و بو — طائرِ قدس کو بھی لے دام گہِ مجاز میں

فریب دام گہِ رنگ و بو معاذ اللہ — یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے

تھی بوئے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ — یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے — آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے

جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہِ شوق میں — ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر — چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

خوشبو کے مضمون کو مستی اور نشاط کے احساس سے علیحدہ نہیں رکھ سکتے لیکن فانیؔ نے اپنے مخصوص حزنیہ رنگ کو اس شعری محرک کے برتنے میں بھی بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے ؎

چمن سے رخصتِ فانیؔ قریب ہے شاید
کہ اب کی بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

حس اور تاثر میں کیا تعلق ہے؟ یہ آرٹ کا بنیادی سوال ہے۔ رنگ کی صورت میں جمالیاتی قدر حسی تجربے میں مرکوز ہوتی ہے۔ لیکن جب تک وہ جذبے سے ہم آمیز نہ ہو۔ اس میں گہرائی نہیں آتی۔ حسی تجربے اور جذبے کو تخیل اپنی طلسمی تاثیر سے ملا کر ایک کر دیتا ہے۔ رنگ تجریدی طور پر کوئی لطف نہیں رکھتا لیکن ان تعلقات کی وجہ سے جو

اس میں اور دوسری اشیا میں قائم ہو جاتے ہیں۔ اس کی لطافتیں بڑھ جاتی ہیں اور جاذب نظر بن جاتی ہیں۔ رنگ کی نفسیاتی تحلیل کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے غزل گو شاعروں نے خون یا لہو کو گرمی اور رنگ کی مناسبت سے علامتی طور پر برتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لہو اور اس کے لوازمات سے انسان کی نفسیاتی زندگی کا بڑا قدیم تعلق ہے۔ اس تعلق کے سبب سے خونِ دل اور خونِ جگر کے اصطلاحی لفظ جذبے کے علامتی رمز بن گئے۔ کہیں یہ علامت غم و اندوہ کی ترجمانی کرتی ہے تو کہیں جذبے کے اتار چڑھاؤ کی۔ وہ حرکت اور عمل کو بھی ظاہر کرتی ہے اور رنج و محن کو بھی جن سے روحانیت عبارت ہے۔ ہمارے شاعروں نے اُسے شوق کی طلسمی وادی کا نشانِ منزل اور رنگِ حقیقت کی بہار قرار دیا ہے اور اس مضمون کو طرح طرح سے باندھا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

عمر بھر ہم رہے شرابی سے   دل پُرخوں کی اک گلابی سے

(میر)

گریہ پہ رنگ آیا قیدِ قفس سے شاید   خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

(میر)

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور   دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

(غالب)

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(غالب)

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب   اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

(غالب)

گل رنگ ہو اگر یہ خوں سے مرا دامن   کیا اب بھی خجل چرخ سیہ فام نہ ہوگا

(مومن)

یہ رنگ آمیزیاں کبھی ہیں کس کا دل ہے دیکھو تو	مجھے تو کچھ نظر آتا ہے یہ خوناب اپنا سا

(مومن)

وہ ہیں کہ مجھے سیر گلستاں سے غرض تھی	ہے خونِ جگر اور مرا دیدۂ تر آج

(داغ)

دلِ پُرخوں مگر ہے جامِ طلسم	کبھی خالی نہ یہ ایاغ رہا

(داغ)

اور کیا زخمِ جگر سے کوئی دریا بہتا	بے خطر سُرخ ہوئے اس ستم ایجاد کے ہاتھ

(ناصر)

چشمِ رنگینِ یار کو ہے پسند	سرخیٔ اشکِ عاشقاں کی بہار

(حسرت)

اللہ اللہ ری رنگِ حقیقت کی بہار	کون سا خون کا قطرہ ہے جو منصور نہیں

(جگر)

حسنِ ادا کی مختلف صورتیں

غزل میں حسن ادا کا انحصار لفظوں کے ایسے استعمال پر ہوتا ہے جس سے ذہن میں خیالی تصویریں اُجاگر ہوں۔ اجاگر ہونے پر بھی یہ تصویریں رمز و ابہام کے لباس میں ملبوس رہتی ہیں۔ اس طرح ان کے خدوخال اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں اور ان سے جمالیاتی حقیقت کی تخلیق ہوتی ہے۔ مثلاً بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسنِ ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "نکاتِ سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسنِ سخن میں شمار کیا ہے (صفحہ ۱۶۲) لیکن انہوں نے یہ نہیں تبلایا کہ ایسا کیوں ہے؛ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور ابہامی کیفیت ضروری

ہے۔ صیغہ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور طلسمی اثر ہوتا ہے۔ صیغہ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود حسرت کی غزلیں ملاحظہ کیجئے۔ جمع کے حسنِ استعمال نے اُن کو کس قدر بلند کر دیا ہے ؎

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں　　دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا　　شوق کی بے قراریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگ ناز اُن کے ستم　　دل کی امیدواریاں نہ گئیں
حُسن جب تک رہا نظارہ فروش　　صبر کی شرمساریاں نہ گئیں

ہم پر بھی مثل غیر ہیں کیوں مہربانیاں　　اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں
حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز　　باقی ہیں شوق یار کی اب تک نشانیاں

خاموشیوں سے رازِ محبت وہ پا گئے　　گو ہم سے عرضِ حال کی جرأت نہ ہو سکی

اللہ رے چشم یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزۂ گل سے بہار میں　　شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام

مری مجبوریاں شوق وفا سے باز رکھیں گی　　ترا شوقِ ستم ظالم خیالِ امتحاں تک ہے

رنگینیوں کی جان ہے وہ پائے نازنیں　　اپنی نگاہِ شوق جہاں سر کے بل گئی

جمع کا حسنِ استعمال ہر دور کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے۔ قدما میں خاص طور پر میر صاحب کے کلام میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ؎

یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھیاں   جاں کاہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں   کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ   ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں   بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں   طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میرؔ اب   دور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں   اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

مومنؔ کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اُلجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم   کرتے ہیں اس پہ ناز اداوانیوں میں ہم
ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہِ رشک   حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبح شبِ فراق   کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

نسیمؔ دہلوی کا شعر ہے ؎

نسیم غفلت کی چل رہی ہے اُمنڈ رہی ہیں قضا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

داغؔ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نہ کر عشق وجنوں میں گفتگو اے ناصحِ ناداں
زمانہ ہے کہ تو بولے یہ سرکاروں کی باتیں ہیں
خفا ہوتے ہو کیوں عہدِ وفا کے ذکر پر سچ ہے
نہ تم وعدہ خلافوں میں نہ ہم بے اعتباروں میں

سر شوریدہ کو تسکین وہیں ہوتی ہے مجھ پہ احسان ہے اس کوچے کی دیواروں کا

دوش پر اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں اللہ جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

شاد عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز اُن کے

جگر کے شعر ملاحظہ ہوں جن میں جمع کے استعمال سے کلام کا حسن دو بالا ہو گیا ؎

دل میں باقی نہیں وہ جوشِ جنوں ہی ورنہ
دامنوں کی نہ کمی ہے نہ گریبانوں کی

میں نے جب شرم سے محشر میں جھکالی گردن بخشوانے کو مجھے میری خطائیں آئیں

اللہ اللہ اعتبارات نظر اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں

اس نگاہ ناز ہی سے پوچھیے اک اسیر شوق کی صیادیاں

نقل قول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز و ابہام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حالانکہ نثر میں اس کے بالکل خلاف ہے۔ نثر میں نقل قول مطالب کی صفائی اور تعین کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ غزل میں اس سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے اور شعر کی بے تکلفی اور تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نقل قول سے اطلاع مقصود ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعر اس کے ذریعے ایک قسم کی طلسمی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حسرت نے "نکات سخن" میں نقل قول کی تازگی کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی وجہ نہیں پیش کی (صفحہ ۱۷) اساتذہ کے کلام سے یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

ٹک ہمرہانِ قافلہ سے کہہ جیو اے صبا
"ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے" (سودا)

کہتے تو ہو "یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا"
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(میرؔ)

دل جائے ہے جو رو کر شبنم نے کہا گل سے
"اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہیے"

(میرؔ)

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے "تم کیوں ہوئے پیارے"

(میرؔ)

کہیو صبا کہ "جس کو تو بھٹکا گیا تھا سو
جوں نقشِ پا پڑا تری دیکھے ہے راہ وہ"

(میر حسن دہلوی)

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "ادھر کو چلئے"

(میر حسن دہلوی)

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ "یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس"

(مصحفیؔ)

پڑتی ہے بزم میں جس شخص پہ نگاہ تری
وہ منہ کو پھیر کے کہتا ہے "اُف پناہ تری"

(جرأتؔ)

کہے گر کوئی اس سے مِلنے کو جرأتؔ
تمہارا طلب گار پیدا ہوا ہے
تو کہتا ہے وہ از رہِ طعن "ہاں جی
یہی تو خریدار پیدا ہوا ہے"

(جرأتؔ)

جتاؤں وہ جو محبت تو کس ادا سے کہے
"کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دوانہ پن کی سی"

(جرأتؔ)

اُس چشم پہ آنکھ پڑتے ہی ہم نے کہا
"جادو برحق ہے کرنے والا کافر"

(جرأتؔ)

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوے سے کہے
"آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس" (ذوقؔ)

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے "تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"
(غالبؔ)

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
(غالبؔ)

میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں" کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
(غالبؔ)

میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی" سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
(غالبؔ)

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہے کیا کہئے"
(غالبؔ)

رشک کہتا ہے کہ "اس کا غیر سے اخلاص حیف" عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا"
(غالبؔ)

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہئے
(غالبؔ)

ہنس کے بولے سوالِ بوسہ پر "ایسی باتوں کا یاں جواب نہیں"
(مجروحؔ)

نقشِ پائے رفتگاں سے آرہی ہے یہ صدا "دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیئے"
(آتشؔ)

باغ میں آج جو اس گل کی سواری آئی　　　شور بلبل نے کیا "بادِ بہاری آئی"

(ناسخ)

اٹھتے ہی تیری بزم سے اٹھا یہ غلغلہ　　　"بہتوں کا دل کشاکشِ محفل میں رہ گیا"

(عیسیٰ)

امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا　　　نگاہیں بول اٹھیں "وہ لے لیا دل"

(امیر مینائی)

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی　　　"ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی"

(امیر مینائی)

مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے　　　"نہ ہے خیال ہماری بھی نارسائی کا"

(امیر مینائی)

یہ کہتی ہیں ہم سے جفائیں تمہاری　　　"نہیں باز آئیں وفائیں تمہاری"

(جلال)

نگاہِ شوق بہت اضطراب خوب نہیں　　　"ٹھہر! وہ آپ ہی پردہ اٹھائے دیتے ہیں"

(جلال)

کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے یہ کہا　　　"وہ چمکی برقِ تجلّی، وہ کوہِ طور آیا"

(داغ)

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا　　　دیکھ پچھتائے گا "خاموش یہ دستور نہیں"

(داغ)

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں　　　"اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے"

(داغ)

یہ کیا کہا کہ "میری بلا بھی نہ آئے گی"　　　کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

(داغ)

ناز کرتے ہیں وہ ہر ناز پہ یہ کہہ کر   "اس کو کہتے ہیں ادا اور ادا کون سی ہے"

(داغ)

میں سوالِ وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا   ہنس کے فرمایا کہ "یہ درخواست نامنظور ہے"

(رسا)

نگاہ ناز یہ کہتی ہے تیر افگن کی   کہ "میں ہوں دل کے لئے تیر ہے جگر کیلئے"

(جلیل)

نقاب کہتی ہے "میں پردۂ قیامت ہوں   اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے"

(جلیل)

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں   "دو قدم کوچۂ رسوائی ہے"

(جلیل)

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں   "وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں"

(شاد عظیم آبادی)

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے "آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم"

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
"آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم"

(شاد عظیم آبادی)

نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا   تو حالِ دل نے کہا "آشکار ہم بھی ہیں"

(حسرت)

"محبت کیوں کرو گر ہو نہیں سکتی وفا مجھ سے"
یہ تم نے کیا کہا مجھ کو، یہ تم نے کیا کیا مجھ سے   (حسرت)

"دیکھے نہ ہمیں کوئی محبت کی نظر سے" کیا خوب یہ اندازِ تحکم ہے تمہارا

(حسرت)

وہ اب یہ چھیڑ سے کہتے ہیں "میرے غم نے تجھے نہ بے قرار کیا ہے نہ بے قرار کرے"

(حسرت)

حالِ دل سے نہیں آگاہ کئے دیتے ہیں اب کبھی "ہم کو خبر کیا تھی" نہ کہنا دیکھو

(حسرت)

دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل ہم نے یہ اُن کے تغافل کو سنا رکھا ہے

(حسرت)

عشاق کی جانب سے تقاضائے وفا پر کہتے ہیں وہ "جھگڑا یہ نکالا ہے کہاں کا"

(حسرت)

"کوئی شکوہ سنجِ ستم اور ہوں گے" وہ کہتے ہیں "حسرت ہمارا نہ ہوگا"

(حسرت)

یہ کہہ کر دیا اُس نے دردِ محبت "جہاں ہم رہیں گے یہ ساماں ہوگا"

(جگر)

کہتی ہے یہ اب وسعتِ دیوانگیِ شوق "منزل بھی جو آ جائے تو منزل نہ سمجھنا"

(جگر)

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار خود مجھی سے پوچھتے ہیں "کون دیوانہ ہے"

(جگر)

بزم سے باچشمِ تر اٹھ گئے کہتے ہوئے "ہم سے تری داستاں اب نہ سنی جائے گی"

(جگر)

آ رہی ہے یہ صدا کانوں میں ویرانوں سے "کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے"

(مرزا یگانہ)

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

(مرزا یگانہ)

شاعر بعض اوقات غیر ذی روح اشیاء اور مجرّد کیفیتوں کو ذی رُوح فرض کر لیتا ہے یا ان میں ایک طرح کا تشخص پیدا کر دیتا ہے جسے استعارے ہی کی ایک شان کہنا چاہیئے۔ بادی النظر میں تشخص سے ایک طرح کا تعین لازم آتا ہے لیکن غزل گو شاعر کا مقصد اس کے برعکس ہوتا ہے۔ جس طرح نقل قول کے ذریعے بظاہر مطالب میں تعین پیدا ہونا چاہیئے۔ لیکن غزل میں اس کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح تشخص سے بھی رمزی اثر بڑھانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات اس قسم کا تشخص استعارے کی ندرت کا کرشمہ ہوتا ہے، جس کی تاثیر سے ہمارا تعلق حقیقت کے ساتھ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ مجرّد کیفیات کے تشخص کی مثالیں قدماء کے کلام میں نہیں ملتیں۔ یا اگر ملتی ہیں تو شاذ و نادر۔ غالب نے اس اسلوب کو برتا ہے۔ خاص طور پر جدید زمانے کے غزل گو شاعروں کے یہاں اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں۔ اساتذہ کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشم تر سے دیوار و در سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم

(میرؔ)

پوچھی تھی کل بتاں سے کہیں دل کی میں خبر سو آج لا کے سر سے وہ میرے ٹپک گئے

(آحمد گجراتی)

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

(میر دردؔ)

کچھ کشش نے تری اثر نہ کیا تجھ کو اے انتظار دیکھ لیا

(میر دردؔ)

حسن کہتا ہے کہ عارض سے الٹ دے پردہ — شرم کہتی ہے ذرا منہ کو چھپا کر دکھلا

(مصحفی)

بے کسی پر رحم آتا ہے اگر میں مر گیا — پھر کہاں اس کا ٹھکانا در بدر ہو جائے گا

(مصحفی)

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

(غالب)

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا — افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

(غالب)

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا طوفانِ بلا میرے بعد

(غالب)

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ ششِ جہت انتظار ہے

(غالب)

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے — دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

(غالب)

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(غالب)

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

(غالب)

یعنی مایوسیوں کی وجہ سے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور آئینہ خانے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اب مدعا اس آئینہ خانے کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہے۔ مدعا کا تماشا

دیکھنا خاص لطف رکھتا ہے۔ شاعر نے مجرد کیفیت کو بڑی خوبی سے تشخص عطا کر دیا۔

غالب کے دو شعر اور ملاحظہ کیجئے ؎

مے سے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہِ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

اس آخری شعر میں شاعر نے اپنے تصورات کی دنیا کو ایک میکدہ فرض کیا ہے جس میں شربتِ دیدار شراب کا حکم رکھتا ہے۔ حوصلے کے ذمے ساقی گری ہے اور نگاہ مے خواری میں مست ہے ان سب کیفیات کے تشخص نے کلام میں عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔

دوسرے غزل گو اساتذہ کے کلام میں سے تشخص کی مثالیں ملاحظہ طلب ہیں ؎

وہ سادگی سے تغافل کو ناز کہتے ہیں
مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہئے (ذکی دہلوی)

یاس (شاگرد مومن)، کے اس شعر میں تشخص اور نقل قول کی دونوں خوبیاں موجود ہیں ؎ عشوہ و ناز و ادا طعن سے کہتے ہیں جسے

"ایک دل رکھتے ہو کس کو دیا چاہتے ہو" (یاس)

وہ پوچھیں بھی تو اظہارِ تمنا کر نہیں سکتی غضب میں پڑ گئی بن کر خموشی رازداں میری
(جلال)

خجل کرتی ہے کیا گریہ فرقت کی نیرنگی نہیں ہوتا جو رونا کارگر تاثیر ہنستی ہے
(جلال)

تم آؤ جب سوارِ توسن ناز قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے
(داغ)

کسی کا دل تو گیا شیشہ نہ ٹوٹا بادہ خواروں میں
یہ توبہ ٹوٹ کر کیوں جا ملی پرہیزگاروں میں (داغ)

کیوں رحم نہ آئے بے کسی پر جب مجھ سے گئی رہی کدھر کی
(داغ)

تیغ قاتل پہ ادا لوٹ گئی رقص بسمل پہ قضا لوٹ گئی
(امیر مینائی)

خانقاہوں میں جو یہ پھرتی ہے بہکی بہکی توبہ بھی پی کے مگر نکلی ہے میخانے سے
(امیر مینائی)

نکلا وہاں سے میں تو مرے دل کی آرزو سر پیٹتی ہوئی تری محفل میں رہ گئی
(رسا)

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانے میں بے حجاب اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی
(فانی)

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کئے
(فانی)

گو ضرور نہیں حال بے خودی معلوم تمہاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی
(فانی)

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے
(اصغر)

عشق کی بے تابیوں پر حسن کو رحم آگیا جب نگاہِ شوق تڑپی پردۂ محمل نہ تھا
(اصغر)

اب طور پر وہ برقِ تجلی نہیں رہی — نظر آ رہا ہے شعلۂ عریانِ آرزو

(اصغر)

حسرت کے ان شعروں میں نقلِ قول اور تشخص دونوں خوبیاں پہلو بہ پہلو موجود ہیں ؎

دلِ ہوس جو نشانہ تری نظر کا ہوا — تو روحِ شوق پکاری شکار ہم بھی ہیں
نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا — تو حالِ دل نے کہا آشکار ہم بھی ہیں

"دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل" — ہم نے یہ ان کے تغافل کو سنا رکھا ہے

حسرت کے کلام سے چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

عشق سے ہے کہاں روا اے حسن — اس قدر اہتمامِ شرم و حجاب

فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے — مل کے رویا خوب ابرِ نوبہار اب کی برس

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آ گئی تھی آج — سو کتنے شرمسار ہوئے بیکسی سے ہم

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت — آئینِ وفا مدِ نظر لے کے گئی ہے

دلِ غم سے یہ کہتا ہے محبت کا برا ہو — ایسے میں تری یاد بھی آ جائے تو کیا ہو

وہ عرضِ وصل پہ بگڑے حجاب کے بدلے — نگاہِ ناز نے پہلو عتاب کے بدلے

محفلِ ناز میں ہیں جمع بتانِ کافر — دل کی ہو خیر کہ اس بزم میں تنہا ہے یہی

حضورِ یار کرے عرضِ آرزو اے شوق — مجھے امید نہیں تیری بے زبانی سے

شوق پر اب تک نہیں ثابت رکھائی آپ کی — کس قدر ہشیار ہے بے اعتنائی آپ کی

تمنّا نے کی خوب نظارہ بازی   مزا دے گئی حسن کی بے شعوری

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے   تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے   ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی

شاید جہاں سے حسرتِ دیوانہ چل بسا   ہاں ہاں جبھی تو چشمِ جنوں اشک بار ہے

جگر کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

ترے حسنِ مغرور سے نسبتیں ہیں   کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

عشق ہی کے ہاتھوں کچھ سکت نہیں رہتی   ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

مزاجِ حسن و تکلیفِ تجلّی، اے معاذ اللہ   بس اب رسوا نہ کر اے بیخودیِ شوقِ پشیماں کو

تلمیح بھی کنایہ اور استعارے کی طرح رمز و ایما کو نکھارتی ہے۔ اس میں بھی کنائے کی طرح لازم و ملزوم میں واسطہ برقرار رہتا ہے جس کی لطافت کا یہ اقتضا ہے کہ تعقید نہ پیدا ہو۔ کنائے کی طرح تلمیح بھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ سامع اپنے ایمائی اثر کی تازگی کا متوقع رہتا ہے۔ مثلاً ؎

بے ستوں کیا ہے کوہ کن کیسا   عشق کی زور آزمائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دوانے نے موت پائی ہے
(میرؔ)

آگے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد   نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد
(میرؔ)

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
(غالبؔ)

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب   ہم کو منظور نکو نامی فرہاد نہیں

(غالب)

غزل میں بعض اوقات استفہام سے بھی حسنِ کلام پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کنائے کی کیفیت اجاگر کرنے میں مدد ملتی ہے جو اثبات و تاکید سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ استفہام بالعموم انشائیہ جملوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جو خبریہ جملوں کے مقابلے میں زیادہ لطافت و بلاغت رکھتے ہیں۔ استفہام میں متکلم وضاحت کے لئے مخاطب سے کچھ دریافت کرتا ہے۔ لیکن غزل میں اُس کے ذریعے شعر کے ایمائی اور رمزی اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعر ایک طرح کا تجاہل عارفانہ برتتا ہے۔ درحقیقت وہ استفہام و استفسار سے کبھی اپنے اندرونی تحیر کو ظاہر کرتا ہے اور کبھی دیدہ و دانستہ اپنے تجربوں کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو نمایاں کرتا ہے۔ استفہامی شعروں کی مثالیں ہر بڑے شاعر کے یہاں ملتی ہیں یہاں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ میر صاحب کے دیوان میں کثرت سے اس قسم کے اشعار ہیں اور بعض غزلیں پوری کی پوری استفہامی انداز میں ہیں۔ ایک جگہ اپنی خانماں بربادی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں لیکن استفہام کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے محبوب کی زبانی خود اپنے اوپر طنز کر رہے ہیں۔ شعر ہے ؎

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ   کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو؟

ان کے اور دوسرے شعر ملاحظہ ہوں ؎

تڑپتا نقشِ پائے ناقہ پر جاتا ہے اے مجنوں   بیاباں میں وہ لیلیٰ کا کدھر محمل ہے کیا جانے؟

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی   کیا پتنگے نے التماس کیا؟

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب   اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب؟

تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گر اے بجلی   جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا؟

لے اس سرے سے یارو اجڑی ہے اس سرے تک — اقلیم عاشقی میں آباد گھر کہاں ہے؟

جاتا نہیں اگر وہ مسجد سے مے کدے کو — پھر میر جمعے کی شب دو دو پہر کہاں ہے؟

ہے حوصلہ تیرا ہی جو تنگ نہیں آتا — کس سے یہ ستم ورنہ اے میر سہا جائے؟

غالب کے یہاں بھی متعدد غزلیں استفہامی انداز میں ہیں۔ مثلاً ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟

غم عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں — کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے؟

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟ — تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

کہو جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

بعض دوسرے شاعروں کے کلام سے مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس — اور اپنی خاطر امیدوار میں کیا تھا؟
(فضل علی ممتاز)

گریباں پھاڑ کر دیوانے نے زنجیر کیوں پہنی؟ — کرے کیا عقل دخل اس میں جنوں کا کارخانہ ہے؟
(آتش)

کون وہ دل ہے جو محوِ رخِ جاناں نہ ہوا — کون آئینہ ہے جو دیدۂ حیراں نہ ہوا؟
(ناسخ)

یہ غنچہ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا — کیا جانے دلِ عاشقِ دلگیر میں کیا ہے؟
(ذوق)

سنتا ہی نہیں وہ بُتِ گمراہ کسی کی   ایسا نہ ہو سُن لے کہیں اللہ کسی کی

(رِنؔد)

اتنا بھی نہ پوچھا کبھی کیا حال ہے تیرا   کیا دردِ محبت کی تغافل ہی دوا ہے؟

(جلاؔل لکھنوی)

رِنؔد کے اس شعر میں نقل قول اور استفہام کی دونوں خوبیاں موجود ہیں ؎

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی بادِ بہاری   کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے؟

(رِنؔد)

پہلے تمہارے آنے سے تھا یہ ہی رنگِ گل؟   تم نے تو گلستاں کو دیا گلستاں بنا

(سالکؔ دہلوی)

داؔغ کے اس شعر میں بھی نقل قول اور استفہام دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں ؎

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داؔغ   ہر ایک پوچھتا ہے کہ "حضرت اِدھر کہاں؟"

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

محروم پھر آیا درِ میخانہ سے واعظ   رندانِ قدح خوار کی ہمّت کو ہوا کیا؟

(مائؔل دہلوی)

خیریت دل کی پوچھتے ہو جو تم   یہ تقاضا نہیں تو پھر کیا ہے؟

تو گلستانِ دل ربائی کا   گُلِ رعنا نہیں تو پھر کیا ہے؟

لوگ جس کو جلیؔل کہتے ہیں   تیرا شیدا نہیں تو پھر کیا ہے؟

(جلیؔل مانک پوری)

اُنس ہے خانۂ صیّاد سے گلشن کیسا   ناز پروردۂ قفس ہوں میں نشیمن کیسا؟

(تعشؔق)

حسرؔت کے یہاں بھی استفہامی اشعار کثرت سے موجود ہیں اور بعض غزلیں پوری

کی پوری اسی رنگ میں ہیں۔ طوالت کے خوف سے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

کبھی کی تھی جو اب دوا کیجئے گا مجھے پوچھ کر آپ کیا کیجئے گا؟

حال مجبوری دل کی نگراں ٹھہری ہے دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے؟

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا اے فریبِ نگاہِ ناز یہ کیا؟

حسرتؔ کے اس شعر میں نقل قول اور استفہام سے تاثیر کہاں سے کہاں پہنچ گئی ویسے کہنے کو معاملے کے شعر ہیں ۔

سرگرم ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا؟ باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا؟

نظر پھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا؟

جگرؔ کے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

محبت کیا ہے؟ تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں؟ ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہم اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق؟ وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

کیا غرض مجھ کو ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں میں پرستارِ محبت ہوں خبر ہے کہ نہیں؟

وہ کون ہے ایسا کہ تری شکل دکھا دے؟ احسان ہے اُس کا جو مجھے مجھ سے ملا دے

جگرؔ کی بعض پوری غزلیں استفہامیہ انداز میں ہیں ۔ مثلاً ۔

عشق کی یہ نمود پیہم کیا؟ ہو تمہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟

سُن تو اے دل یہ برہمی کیا ہے؟ آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟

یہ میکشی ہے تو پھر شانِ میکشی کیا ہے؟ بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے؟

نگاہِ شوق جگر وقتِ چارہ سو کیا ہے؟ جو دل حسیں ہو تو دنیائے رنگ و بو کیا ہے؟

دل بھلا یا برا ہے کیا کہئے؟ آپ کا نقشِ پا ہے کیا کہئے؟

اسی طرح فانی کے یہاں بھی استفہامیہ غزلیں ملتی ہیں اور متفرق اشعار تو بے شمار ہیں۔ مثلاً ؎

واہمے کی یہ مشق پیہم کیا؟ یاس و امید، شادی و غم کیا؟
اُن کے آگے غم اک فسانہ ہے اُن سے کہئے فسانۂ غم کیا؟

اس نورِ مجسم کے افسانے کو کیا کہئے؟ ہے شمع بھی پروانہ، پروانے کو کیا کہئے؟
آبادی کی آبادی، ویرانے کا ویرانہ ارمان بھرے دل کے کاشانے کو کیا کہئے؟

لفظوں کی تکرار بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقہ سے کی جائے اور وہ رمزی اور ایمائی اثر بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حُسن میں اضافہ ہوگا۔ غزل میں وزن اور بحر اور ردیف قافئے کی تکرار بھی اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ بعض وقت لفظوں کی تکرار اس واسطے پسند ہوتی ہے کہ دل جس چیز کو چاہتا اور پہچانتا ہے وہ بار بار سامنے آتی رہے۔ لفظوں کے خیالی پیکروں سے جذبہ اپنے آپ کو وابستہ کر لیتا ہے تو یہ صورت پیدا ہوتی ہے تکرار سے ان خیالی پیکروں کے نقوش میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۱

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
(میر)

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
(میر)

---

۱ نکاتِ سخن صفحہ ۱۲۱۔

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے　　پارہ پارہ دل ہے جس میں تو وہ حسرت ہے

(فوقؔ)

ہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے　　تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

(غالبؔ)

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

(غالبؔ)

کس تجاہل سے وہ کہتا ہے "کہاں رہتے ہو"　　تیرے کوچے میں ستمگار ترے کوچے میں

(شیفتہؔ)

ہوئے ہیں عاشق بھی کن گلوں کے کہ خود ہی شاکی ہیں جن گلوں کے
نہیں ہے وعدے میں ان گلوں کے وفا کی بو امتیاز کا رنگ

(جلالؔ لکھنوی)

بھلا بھلا کے جتایا ہے اُن کو رازِ نہاں　　چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا

(داغؔ)

اُن کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالۂ دل　　یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، یہ تو اثر کچھ بھی نہیں

(داغؔ)

فسانۂ شب غم اُن کو اک کہانی تھی　　کچھ اعتبار کیا، کچھ نہ اعتبار کیا

(داغؔ)

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا　　اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

(داغؔ)

لاتے لاتے کام میں الفت لائے گی زنجیروں کو　　بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوقِ کمر ہو جائیں گی

(ثاقبؔ لکھنوی)

اچھی پی لی خراب پی لی　　جیسی پائی شراب پی لی
پی لی ہم نے شراب پی لی　　آگ تھی مثلِ آب پی لی

(ریاض خیرآبادی)

دعا سے کچھ نہ ہوا التجا سے کچھ نہ ہوا　　بتوں کے عشق میں یادِ خدا سے کچھ نہ ہوا
پھری تو تھی مگر اپنے اثر کو لا نہ سکی　　گئی تو تھی مگر آہِ رسا سے کچھ نہ ہوا

(مضطر)

کہاں گلوں کے وہ تختے وہ لالہ زار کہاں　　بہار میں تو نظر لگ گئی بہار کہاں

(شاد عظیم آبادی)

اُن کی نگاہِ ناز عجب شعبدہ گر ہے　　ناوک ہے تو ناوک ہے نظر ہے تو نظر ہے

(ہجر شاہجہانپوری)

ہمیں وہ قتل کرتے ہیں زمانہ دیکھ لے آکر　　نصیحت کی نصیحت ہے تماشے کا تماشا ہے

(ہجر شاہجہانپوری)

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے　　وہ مری جبین نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی۔

(بے نظیر شاہ)

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

(فانی)

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو　　دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

(فانی)

نفس نفس پہ صفاتِ تازہ، حیاتِ تازہ ممات تازہ
انہیں میسّر ہے ذاتِ تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں　(جگر)

اُن سے پوچھے کوئی یہ ہوش کی باتیں میری لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہے دیوانہ ہے

(اصغر)

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں رگ رگ میں دوڑتی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

(اصغر)

کوئی اُن کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائیے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا

(حسرت)

جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت مجبوری دل خاک بسر لے کے گئی ہے

(حسرت)

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

(حسرت)

کہیں رک بھی اے چشم خوننابہ افشاں کہاں تک تری اشک باری کہاں تک

(حسرت)

بیان کی تازگی اور مضمون کی ندرت کا بعض دفعہ یہ اقتضا ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو غیر مذکور رکھا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کرے اور معہود ذہنی کو پالے۔ مثلاً ؎

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

(میر)

دور بیٹھا غبار میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

(میر)

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

(میر)

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے تو چراغ دیرِ خانہ بنا یا ہوتا

(ظفرؔ)

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

(مومنؔ)

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیّاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

(مومنؔ)

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا سو مرے خاک میں ملانے کو

(مومنؔ)

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

(غالبؔ)

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

(غالبؔ)

ہم بھی امیدِ وصل سے خوش ہیں ہے زمانے کو انقلاب بہت

(مجروحؔ)

کل تک یہی گلشن تھا صیّاد بھی، بجلی بھی دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

(فانیؔ)

بعض اوقات حذف کرنے کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے جو مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر حاصل ہوتا ہے اس لئے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً غالبؔ کو یہ کہنا ہے کہ فلک کے ظلم معشوق کے ستم سے کم نہیں۔ فلک کے ظلم دیکھ کر معاً معشوق یاد آتا ہے۔ اس مضمون کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں ؎

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ   جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

اسی مضمون کا صباؔ لکھنوی کا شعر ہے جو کسی طرح غالبؔ کے شعر سے کم نہیں ہے

چرخ کو کب سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مجروحؔ نے بھی اس مضمون کو سیدھے سادے طور پر ادا کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں ؎

ملتی ہے اس کی وضع زبس خوئے یار میں
آئے نہ کیوں مزا ستم روزگار میں

رشک کے مضمون کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اس کے لئے غالبؔ نے عجیب و غریب اسلوب اختیار کیا ہے۔ صاف صاف اور سیدھے طور پر اپنا مقصد بیان کرنے کے بجائے وہ اپنے دل کی بات کو بڑے ہیر پھیر سے کہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر کلام میں طوالت پیدا کر رہا ہے لیکن رمز و ایما نے نہ صرف اس طوالت کو اپنے دامن میں چھپا لیا بلکہ ایک ایک لفظ میں بلاغت سے اس کو رچا دیا۔ مضمون یہ باندھا ہے کہ محبوب بڑا ہی ستم ظریف ہے۔ اس کو اپنے حسن اور ناز و ادا کی تاثیر پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے ناوک ناز کا مارا پھر پانی نہیں پیتا۔ اپنی ذات پر یہ حسن ظن ہو تو پھر اس کو کیا پڑی ہے کہ کسی کا امتحان کرے۔ اس طرح رقیب بھی امتحان سے بچ گیا اور اس کی شرم رہ گئی ورنہ اگر کہیں اس کا امتحان ہو جاتا تو اس کی بوالہوسی کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ رشک کے جذبے کو ظاہر کرنے کے لئے شاعر نے

؎ فارسی میں اسی مضمون کو اور زیادہ لطیف انداز میں بیان کیا ہے ؎

دوش کز گردش بختم گلہ بر روئے تو بود
چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود   (غالبؔ)

یہ سب مضمون آفرینی کی اور حسن ادا کا حق ادا کر دیا۔ شعر ہے ؂

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں[1]

مومن خاں جذبۂ رشک کے تحت اپنے محبوب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر سے سرگوشیاں نہ کیجئے بلکہ میری طرف التفات فرمایئے لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ غیر کی طرف پہلے متوجہ ہو لیجئے۔ حالانکہ اُن کا مدعا اس کے بالکل خلاف ہے ؂

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزوہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

مقصود صرف اپنے گریبان کے چاک کی وسعت بتانا ہے لیکن اس ضمن میں دستِ جنوں کے صدقے جاتے ہیں اور یہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں ؂

---

[1] غالب نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے :
"حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کہ کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیر غمزہ کبھی خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے پر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے۔ اس حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ بوالہوس تھا۔ آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جاتی۔"

دستِ جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے

پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر بعض وقت ایسا اندازِ بیان اختیار کرتا ہے جس سے سامع کا ذہن کبھی تکلم سے غیبت کی طرف، کبھی غیبت سے تکلم کی طرف، کبھی خطاب سے تکلم کی طرف اور کبھی خطاب سے غیبت کی طرف خود بخود منتقل ہوتا ہے۔ کبھی مفرد اور جمع کے صیغے ایک ہی شعر میں برتے جاتے ہیں۔ دراصل یہ سب رمزی طلسم کے کرشمے ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ نثر میں یہ سب باتیں عیب ہیں غزل میں انہیں حسن ادا کی سند حاصل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اب کے جو تیرے کوچے سے جاؤں گا تو سنیئے	پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

(میرؔ)

میرؔ شاید لیں اس کی زلف سے کام	برسوں سے تو لٹک رہے ہیں ہم

(میرؔ)

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا	کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(ذوقؔ)

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے	تم نے کیوں سونپی ہے اپنے در کی دربانی مجھے

(غالبؔ)

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی	آخر زباں تو رکھتے ہو گر تم دہاں نہیں

(غالبؔ)

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے	کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

(انشاؔ)

کیا زور تھا کیا شور تھا اک قطرۂ خوں کا	اے حضرتِ دل دیکھیں کرامات تمہاری

(ماہ لکھنوی)

زاہدا وہ تو رگِ جاں سے کہیں ہے نزدیک — کیوں بھٹکتے ہو ادھر آؤ کہاں جاتے ہو

(برقؔ لکھنوی)

ترے در سے اب ہم سفر کر چلے — جیو تم کہ اب ہم گزر کر چلے

(امیرؔ سوز)

فصلِ بہار آئی پیو مومنو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّیٰ اٹھائیے

(آتشؔ)

پھنس گئے تم نہ سنی حضرتِ دل بات مری — بندگی آپ کو اے قبلۂ حاجات مری

(امیرؔ)

ادھر آؤ اس بات پر بوسہ لے لوں — مرے سر کی جھوٹی قسم کھانے والے

(داغؔ)

کبھی شاعر کے خطاب کا انداز ایسا ہوتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ گویا متکلم اور مخاطب دو علیحدہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔ اس طرح غزل گو شاعر اپنے آپ کو غیر تصور کرتا اور مضمون آفرینی کا ایک نیا پہلو پیدا کرتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے شاعروں نے تخلص سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ تخلص کے ذریعے رمز آفرینی کا کام لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تعین کا بھی۔ اگرچہ یہ تعین رمزی تعین ہوتا ہے جو ابہام میں اضافہ کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دوسروں کی باتیں کہتے کہتے جو عام انداز لئے ہوئے ہوتی ہیں شاعر نے ایک دم سے اپنے تخیل اور جذبے کو اپنی شخصیت کے گرد مرکوز کر دیا اس اندازِ سخن میں تحیر کا عنصر خاص طور پر قابل لحاظ ہے جو کسی تحت شعوری یاد کی غمازی کرتا ہے۔ اس طرح عام گفتگو کے تسلسل میں رمزی گرہ لگائی جاتی ہے تاکہ حسن ادا کا حق ادا ہو۔ مثالیں دینے میں طوالت ہوگی، صرف چند کافی ہوں گی ؎

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی — میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو   یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

در مے خانہ یہ رہا مجروح   آپ جاتے ہیں اے جناب کہاں

کیونکہ کاٹو گے شب غم مجروح   آپ تو شام سے گھبراتے ہیں

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے   بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس[۱]

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مرا کہنا نہ مانا داغ تم نے   انہوں نے کی دغا مجھ سے کہ تم سے

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل   اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

ہمارے شاعروں میں مومن نے جتنا تخلص سے فائدہ اٹھایا اتنا شاید کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ وہ اپنے تخلص کی لفظی رعایت سے رمز و ایماء کی ایک دنیا آباد کر

---

[۱] غالب صرف شعر ہی کی حد تک اپنے آپ کو اپنا غیر نہیں تصور کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ انداز ان کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا اپنے کو اپنا غیر سمجھنا وجود کی عجیب و غریب توجیہ ہے۔ غالب عمر بھر جن دنیاوی پریشانیوں میں مبتلا رہے غالباً انہی کی وجہ سے اُن کے یہاں یہ اندازِ فکر ملتا ہے مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:—

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے (بقیہ بر صفحہ ۲۵۸)

دیتا ہے۔ مثلاً ؎

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ　　مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے　　مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

بت کدہ جنت ہے چلئے بے ہراس　　لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کہہ

طواف کعبہ کا خوگر ہے صدقے ہونے دو　　بتو سمجھو ذرا مومن ہے مومن یوں تو ٹھہرے گا

چھوڑ بت خانے کو مومن سجدہ کعبے میں نہ کر　　خاک میں ظالم نہ یوں قدرِ جبیں سائی ملا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۵۷) کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرامگاہ اور عرش نشیں خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلمروِ سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر! ایک قرضدار کا گریباں میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اور خاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت! کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

مومن دیں دار نے کی بت پرستی اختیار	ایک شیخ وقت تھا وہ بھی برہمن ہو گیا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا	تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن	صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر	ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع	مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر	مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن	آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے	وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن	کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

رمز آفرینی کے علاوہ فارسی اور اردو غزل میں تخلص کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے خودی کا اظہار مقصود تھا چاہے وہ مبہم طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ خودی اور جذبے کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ بغیر خودی کے جذبے کی تخلیق ممکن نہیں اور بغیر جذبے کے خودی کا تحقق ادھورا رہے گا۔ اگرچہ خودی مبہم ہوتی ہے لیکن اس کا وجود جذبے کی طرح حقیقی ہے۔ اس کے تانے بانے کی رنگا رنگی سے زندگی کی رونق ہے یورپ کی جدید رمزی اور امیجسٹ شاعری میں چونکہ جذبہ موجود نہیں اس لئے خودی کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ بودلیر، مالارمے اور پال ویلیری کے یہاں احساس ذات نہیں ملتا تغزل میں چونکہ تخیل کے ساتھ جذبہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اظہار خودی ضروری سمجھا گیا۔ تخلص کی یہی توجیہ غزل کے بنیادی عناصر کے ساتھ کھپتی ہے لیکن اگر خودی کا

اظہار صاف صاف کیا جاتا تو نہ صرف یہ بد مذاقی ہوتی بلکہ اس ٹیکنیک کی بھی خلاف ورزی ہوتی جسے غزل میں بنیادی حیثیت میں برتا گیا ہے۔ تخلص میں شاعر کی خودی کا اظہار رمز و ایما کے انداز میں اس طور پر کیا جاتا ہے کہ گویا کسی دوسرے کا ذکر ہے۔ اس طرح تعین میں بے تعینی اور رمز کی کیفیت آجاتی ہے جس کے بغیر حسن ادا کا حق نہیں ادا ہو سکتا۔

تخلص کے علاوہ ویسے بھی غزل میں رمزی کیفیت کو بڑھانے کی خاطر فرضی مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی کے سامنے درد اشتیاق کی شرح بیان کر رہا ہے یا کسی کو اپنا ہم راز بنانا چاہتا ہے۔ یہ فرضی مخاطب مقطع میں کبھی خود اپنی ذات ہوتی ہے اور کبھی غیر ذات۔ لیکن غزل کے دوسرے شعروں میں فرضی مخاطب دوسرا ہوتا ہے جس کو خطاب کر کے کبھی اپنے دل کو ہلکا کیا جاتا ہے اور کبھی رمزی اور ایمائی فضا کی تخلیق مقصود ہوتی ہے۔ چند مثالوں سے یہ دونوں باتیں واضح ہو جائیں گی۔

اڑا دے صبا خاک میری اگر تو تو کوچے میں اس بے وفا کے ہی لے جا

(تاباںؔ)

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

(میرؔ)

گل سمجھ کر نہ کہیں بے کلی کرنے لگیو بلبل اس لالۂ خوش رنگ کی خوناک ہے

(میرؔ)

واعظ ناکس کی باتوں پہ کون جاتا ہے آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

(میرؔ)

اس کشمکش سے دام کی کیا کام تھا ہمیں اے الفت چمن تیرا خانہ خراب ہو

(سوداؔ)

مے کشاں! روح ہماری بھی کبھی شاد کرو — ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

(سوداؔ)

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

(مومنؔ)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

(غالبؔ)

دیکھ او قاتل بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم — چارہ گر سے رُو، نالاں درد سے، دل دل سے ہم

(نسیمؔ دہلوی)

تنگ زنداں سے ہے یہ صحنِ گلستاں مجھ کو — لے نکل وحشتِ دل سوئے بیاباں مجھ کو

(رندؔ لکھنوی)

دخلِ اغیار نہیں بزمِ گل و بلبل میں — پاؤں کچھ سوچ کے اے بادِ بہاری رکھنا

(اسیرؔ لکھنوی)

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل — کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

(امیرؔ مینائی)

لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا (داغؔ)

اسی مضمون کا داغؔ کا دوسرا شعر بھی ہے جس میں خطاب اور تشخص کی خوبیوں کو بڑی نزاکت سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

کہیں نہ حضرتِ دل ہم سے تم دغا کرنا — ہمارے دوست پرانے ہو ابتدا سے تم

تخیل کبھی معمول کے خلاف مستقبل کے معنی ماضی یا حال کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے تاکہ ابہام و رمز پیدا ہو۔ مثلاً۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

(غالبؔ)

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا　　تو جہنم کو دیا کیا تو نے

(داغؔ)

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا　　سو گیا ہے غریب سونے دے

(امیرؔ مینائی)

کبھی تلمیح جس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے اس طرح استعمال کی جاتی ہے کہ حال کا مفہوم اجاگر ہو۔ مثلاً ؎

گزار شہرِ وفا ہیں سمجھ کے کر مجنوں　　کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

ایک ہی شعر میں مفرد اور جمع کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے مولانا حسرتؔ موہانی نے "نکاتِ سخن" (صفحہ ۹۸) میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد منشی امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی کو ابتدائی مشق کے زمانے میں اپنی ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

ملتے ہیں اس طرح سے کہ گویا خفا نہیں　　کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

منشی صاحب مرحوم نے پہلا مصرع بدل کر یوں کر دیا ؎

ملتے ہو اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں

اور دوسرا مصرع جیسا تھا ویسا رہنے دیا۔ گویا ان کے نزدیک تم کے ساتھ آپ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اگرچہ حسرتؔ کا خیال ہے کہ تم اور آپ اور تو اور تم کا اجتماع قابلِ احتراز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں اُن کے استاد کا مسلک غزل کی تکنیک کے نقطۂ نظر سے بہتر اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مفرد اور جمع کے صیغوں کے اجتماع سے شعر کی رمزی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ اور کسی قسم کی تعقید نہیں پیدا

ہوتی۔ مطلب میں تعین کے بجائے ایک قسم کا ابہام اور پھیلاؤ آجاتا ہے جس سے شعری احساس لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن رمزی علامتوں کے برتنے میں اگر خاص سلیقے سے کام نہیں لیا گیا تو لطف اندوز ہونا تو کجا وہی بات ذوق پر گراں گزرے گی۔

رعایت لفظی سے بھی اگر شعر کی رمزی اور ایمائی کیفیت بلا کسی تکلف کے بڑھ جائے تو سامع اس سے لطف اندوز ہوگا۔ ورنہ اگر یہ احساس پیدا ہو کہ شاعر نے تکلف اور تصنع سے کام لیا ہے تو طبیعت اس کی طرف کبھی مائل نہ ہوگی۔ ایسی لفظی رعایتوں سے بجائے کوفت اور بے لطفی کے کچھ حاصل نہیں۔ یہ ضلع جگت اور لفظوں کی شعبدہ کاری رُوحِ تغزل کا خون کرتی ہے۔ لکھنؤ والوں نے اس کی جانب زیادہ توجہ کی جس کی وجہ سے ان کے کلام میں تصنع نے راہ پائی۔ بعض دہلی کے غزل گو شاعر بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں ؎

اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

(ناجی)

آہ کس پردہ نشیں سے دیدہ و دل لڑ گئے
شدتِ گریہ سے جو آنکھوں پہ پردے پڑ گئے

(جرأت)

آنے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بُری سنائی

(ذوقؔ)

عاشقِ حسنِ بتاں سنتی ہے برسوں سے مجھے
دق کرے گی خون تھکوا کر بنے گی سل قضا

(آتشؔ)

توڑ دل کا نہ مرے مار کے پتھر شیشہ
سنگ دل ہم نے بنایا ہے یہ مر مر شیشہ

(شاہ نصیر دہلوی)

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہے باغباں
لالا کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

(امانتؔ لکھنوی)

کیا ہے تازہ نخلِ غم کو آہِ سرد بھر بھر کر
بڑی محنت سے میں نے یہ ثمر جاڑے میں پالا ہے

(امانت لکھنوی)

دے دوپٹہ تو اپنے ململ کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

دردِ سر میں جو سر رگڑتا ہوں
نیز ادر روازہ کیا ہے صندل کا

(ناسخ لکھنوی)

شعلے اٹھے جو آتشِ رخسارِ یار کے
بالے کی مچھلیوں کو سمندر بنا دیا

(برق لکھنوی)

تیری آنکھوں کا تصور ہے علاجِ وحشت
دل کے بہلانے کو عاشق نے ہرن پالا ہے

(برق لکھنوی)

بھاتا ہے نہایت دل کو خطِ رخسار جاناں کا
گھسیٹے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا

(آتش لکھنوی)

اس رُخِ زرد پر پڑی وہ آنکھ
زعفرانِ زار میں ہرن آیا

ہم نے مانگا کبھی جو بوسۂ لب
تنگ کیا کیا وہ بے دہن آیا

(اسیر لکھنوی)

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی
آج ہم عنقا کو لائے دام میں

(مسیح لکھنوی)

سُرخ رو دیکھئے کس کس کو کرے گا قاتل
سر پہ باندھے ہوئے مقتل میں کفن لاکھوں ہیں

(داغ)

چلو گھر خاک ڈالو اب حنا کا خون ہوتا ہے
کفِ افسوس ملتے ہو کھڑے گنجِ شہیداں پر

(تسلیم لکھنوی)

ان مثالوں کے خلاف ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں رعایتِ لفظی جدتِ ادا میں جان

ڈال دیتی ہے اور شعر کا معنوی اور رمزی اثر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کے کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

(سوداؔ)

گریہ پہ رنگ آیا قیدِ قفس سے شاید
خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

(میرؔ)

زلفیں اُس کی ہوا کریں برہم
ہم کو بھی پیچ و تاب ہے سو ہے

(میرؔ)

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم

(میرؔ)

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

(غالبؔ)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(غالبؔ)

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

(غالبؔ)

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آنے ولائے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

(غالبؔ)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(غالبؔ)

اس قسم کی مثالوں سے غالبؔ کا دیوان بھرا پڑا ہے اور دوسرے شاعروں کے

ہاں بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں رعایتِ لفظی سے کلام کی شگفتگی، بلندی اور تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

جس طرح حُسن کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح شعر کے حسنِ ادا کو بھی محسوس کرنا ممکن ہے۔ خیال میں محسوسات کی جو صورتیں جمع ہوتی ہیں اُن کے اظہار پر جب تک پوری قدرت نہ ہو اس وقت تک طرزِ ادا میں جدّت اور دلکشی نہیں آسکتی۔ حسنِ ادا کے لئے لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں درکار ہیں۔ وہی معمولی باتیں ہیں جنہیں سب کہتے ہیں۔ ایک کے کہنے کا اثر ہوتا ہے دوسرے کے کہنے سے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

قطرۂ اشک کا مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ لیکن غالب نے اسی مضمون میں ندرت اور نزاکت کی رنگا رنگی سمو دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قطرۂ اشک کی قدر و قیمت گہر سے زیادہ ہے۔ اس مضمون کو صاف طور پر بیان کرنے کے بجائے پہلے یہ دعوے پیش کیا کہ جتنی ہمت ہوگی اتنی ہی توفیق ہوگی۔ یہ قطرے کی پست ہمتی ہے کہ گوہر ہونے پر قناعت کر گیا۔ اگر اس کا حوصلہ بلند ہوتا تو اس کو انسانی آنکھ میں جگہ مل سکتی تھی جو اس کے رتبے کی معراج ہوتی۔ شعر میں دعویٰ سے زیادہ اہمیت ثبوت کو حاصل ہے جس میں رمزیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ شعر ہے ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

اس میں شبہ نہیں کہ غزل میں حسنِ ادا کی خوبی کے لئے لازمی عنصر ایمائی اثر آفرینی ہے۔ چاہے لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں، خود لفظ خوشنما نہ ہوں لیکن اگر شاعر اپنی فطری اور جذباتی تاثرات کی صورتوں میں ذہنی تصرف پر قادر ہو گیا تو ضرور ہے کہ وہ ایمائی اثر پیدا کر سکے گا۔ تاثروں کی مختلف صورتوں میں ذہنی تصرف اس واسطے

ضروری ہے کہ وہ انہیں ثبوتی حقائق سے مجاز کی طرف اور تصریح سے کنائے کی طرف لے جانا چاہتا ہے کہ بغیر اس کے شعری لطف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی اہتمام ہونا چاہیئے کہ رمزی اور مجازی معنی ثبوتی حقائق سے بالکل منقطع تو نہیں ہوئے۔ مجاز اور رمز کی دنیا میں جس سے غزل عبارت ہے امر عقلی میں تصرف جائز ہی نہیں فرض ہے تاکہ حسن ادا جلوہ گر ہو۔ غزل کے لفظوں کے ظاہری معنی کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے۔ اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر ان سے رمزی اثر پیدا ہو جائے تو بس اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے۔ غزل میں لفظوں کا یہ کام ہے کہ جذبے کی تحت شعوری دنیا میں تخیل نے اپنے نازک موقلم سے جو تصویریں بنائی ہیں اُن میں رنگ آمیزی کریں تاکہ ہمارے لیئے وہ نہ صرف جاذب نظر بن جائیں بلکہ ان سے بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور جذبے کی بازآفرینی کا سلسلہ جاری رہے تاکہ ذہن اور فطرت کی توقعات پوری ہوں۔

طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اس کے شعر میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جذبہ خود فکر کر رہا ہو۔ وہ پست مضمون کو بھی ایمائی زور سے اُوپر اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ ایمائی زور کہاں سے آیا؟ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ معنوی اور رمزی اثر بہر حال لفظوں ہی کا رہین منت ہوتا ہے جو تخیلی پیکروں کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور جن میں جذباتی قدریں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اپنی اپنی جگہ سب لفظ بلند اور پست احوال کی طرف ذہن کو منتقل کر سکتے ہیں۔ در اصل لفظوں کی ترتیب و ترکیب ان کی فطرت کو بدل دیتی ہے اور معمولی باتیں سحر بن جاتی ہیں۔

غم کا مضمون بیان کرنا مقصود ہے۔ موت اور کفن کی شعری علامتیں پیش کی گئی ہیں اس فضا میں کیا بلا کی شوخی لفظوں کی مناسب ترتیب نے پیش کر دی۔ غالب کا

شعر ہے ؎ اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مرزا یگانہ اسی مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا شعر غالب کے شعر کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔ کہتے ہیں ؎

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا

سوال یہ ہے کہ مرزا یگانہ کے شعر میں کس چیز کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی تاثیر پھُسپھسی رہ گئی؟ سارا طلسم لفظوں کی صحیح ترتیب اور حسن استعمال میں پوشیدہ ہے لفظ جن خیالی پیکروں اور نقوش کی طرف ذہن کی رہبری کرتے ہیں۔ اُن میں بھی میل اور مناسبت ہونی چاہیئے۔ غالب نے کفن کی مناسبت سے شہیدوں اور حور کے علاقی لفظ استعمال کیئے ہیں۔ اُن کے اندر رمز و ایماء کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے مرزا یگانہ نے اپنے شعر کو غلط لفظ سے شروع کیا اور آخر تک غلطی میں مبتلا رہے۔ جامہ زیب اور جوبن کے لفظ اس رمزی فضا میں جو وہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کھٹکتے ہی نہیں بلکہ ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ کفن کے مضمون کے ساتھ اس قسم کے لفظوں کا تکلف اور چوچلاپن اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ لفظ بے میل ہیں اور مقتضائے حال کے مطابق نہیں اس لئے ان کا شعر بلاغت اور تاثیر کے دربار میں بار نہ پا سکا۔

داغ کے یہاں بھی اس مضمون کا شعر ملتا ہے جو مرزا یگانہ کے شعر سے بہتر لیکن غالب کے شعر کے مقابلے میں معمولی درجے کا ہے ؎

ہوا ہے خون کے چھینٹوں سے پیرہن گلزار
ترے شہید کا لاشہ بہار سے اٹھا

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مصحفیؔ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ۔

مصحفیؔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

مصحفیؔ کے دوسرے مصرعے میں رفو کا لفظ ایمائی اثر پیدا کرنے کے بجائے نفس واقعہ کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جس کے باعث شعر بے اثر اور کمزور ہوگیا برخلاف اس کے میرؔ کے شعر میں جدت ادا، بلاغت اور سادگی کی دل نشینی معمولی ذوق رکھنے والے کو بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

رفو کا مضمون غالبؔ نے بھی باندھا ہے اور اپنے انوکھے انداز میں باندھا ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زخم کو جو میں رفو کروا رہا ہوں تو اس کا مطلب چارہ جوئی یا پاس درد سے غفلت نہیں بلکہ زخم سوزن سے لذت گیر ہونا ہے۔ مرزا کے یہاں ایمائی اثر آفرینی نے مضمون کی خارجیت کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور وہ عیب جو مصحفیؔ کے شعر میں نظر آتا ہے مرزا کے شعر میں نہیں ۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

داغؔ نے رفو کرنے کے مضمون کو اس طرح باندھا اور حسن ادا کا حق ادا کیا ہے ۔

جگر کے ٹکڑے ملا دے تو بخیہ گر جانوں　　اگرچہ جیب کو ثابت ترے رفو نے کیا

رفو کے مضمون سے ملتا جلتا مضمون پیوند یا جوڑ لگانے کا ہے۔ امیرؔ مینائی نے اس مضمون کو عجیب وغریب ندرت سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

شب وصال بہت کم ہے، آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا

اس شعر میں ایک تو نقل قول کی خوبی ہے جس میں رمز و کنایہ مضمر ہے اور اس کے علاوہ یہ کہ شاعر نے ایک تیر میں دو نشانے اڑائے ہیں۔ وہ فلک سے شکایت کرتا ہے کہ شب وصال بہت کم ہے اور شب فراق اتنی طویل ہے کہ کاٹے نہیں کٹتی۔ شکایت کے ساتھ اپنے حسب مدعا فلکِ پیر کو ایک ترکیب بھی بتائی ہے کہ شب جدائی کی درازی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر شب وصال میں جوڑ دے تو کیا خوب ہو۔ اس طرح شب فراق کی درازی میں کمی ہو جائے گی اور شب وصال کی مدت کچھ بڑھ جائیگی جو عین مقصود ہے۔

شاعر نے یہ سب باتیں اتنے کم لفظوں میں اور سلیقے سے ادا کر دی ہیں کہ بلاغت ناز کرتی ہے۔ شعر سُن کر سامع کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شبِ وصال اور شبِ فراق زندگی کی دائمی کیفیتیں ہیں جن میں ایک لطیف اور مبہم سا تعلق ہے جسے شاعر نے محسوس کیا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کا شعر ہے ؎

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موج نسیمِ وزیدہ ہوں

بہت بلند شعر ہے۔ اس مضمون کو ذرا بدل کر رندؔ نے یوں ادا کیا ہے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

بلاشبہ رندؔ کے شعر کا ایمائی اور رمزی اثر جو لطافت جذبات کی ترجمانی کرتا

ہے خواجہ میر درد کے شعر سے بھی بڑھ گیا۔ لفظوں کی ترتیب نے مضمون کی دلآویزی میں اور اضافہ کر دیا۔ سیدھے سادے لفظ ہیں لیکن ان کا مجموعی اثر پر اسرار طور پر ذہن میں عجیب و غریب یادیں برانگیختہ کرتا ہے۔ میر تقی کا شعر ہے ؎

کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میرؔ حال تیرا

اگرچہ شعر میں تفصیل زیادہ آگئی ہے لیکن پھر بھی ہر لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ جس کی بدولت تفصیل کا عیب بڑی حد تک چھپ گیا ہے۔ حسرتؔ موہانی نے اسی مضمون میں اپنے اعجاز بیان سے اور زیادہ نزاکت پیدا کر دی۔ دوسرے مصرع میں استفہام کا لطف خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے ؎

حُسنِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے — حسرتؔ یہ تو نے اپنا کیا حال کر لیا ہے؟

داغؔ کے یہاں یہ مضمون اس طرح ملتا ہے ؎

اے داغؔ عشق آفتِ جاں ہے ذرا سنبھل
دو دن میں کیا سے کیا یہ تیرا حال ہو گیا؟

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی — میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

میرؔ صاحب نے مضمون کی مناسبت سے نرم اور ملائم لہجہ اختیار کیا ہے جو بجائے خود اپنے اندر ایمائی انداز رکھتا ہے۔ پھر انہوں نے خطاب کا جو طریقہ برتا ہے وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ اُن کا سوز و گداز صداقت اور اصلیت پر مبنی ہے۔ میرؔ صاحب نے اپنے ہمدم و رازداں کو اپنی پریشان گوئی سے ایک لمحے کے لئے بھی سونے نہ دیا۔ اب وہ غریب آپ سے کہتا ہے کہ آپ کچھ دیر آرام کر لیجئے تاکہ دوسروں کو بھی کچھ آنکھ جھپکانے کا موقع مل جائے۔ یہ ایمائی انداز مضمون کی مناسبت

سے نہایت بلیغ ہے۔

اس کے برخلاف سوداؔ کے اسی مضمون کے شعر میں ایمائی انداز کے بجائے زور وشور، کڑک اور گرج ملتی ہے جو ذوقِ شعری پر گراں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے خوابی کی جھنجھلاہٹ میں کوئی ڈانٹ ڈپٹ کر رہا ہے۔ اس طرزِ ادا سے شعری نزاکت مجروح ہوگئی اور لطفِ تغزل خاک میں مل گیا۔ اس کا شعر ہے ؎

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
ہونے کو سحر آئی ہے ظالم کہیں مر بھی

بے خوابی اور شب بیداری کے مضمون کے بالکل برعکس خوابِ استراحت کا مضمون ہے۔ ان دونوں استادوں نے اس پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سوداؔ نے غزل میں بھی وہی طرزِ ادا اختیار کیا جو اس کے قصیدوں کی خصوصیت ہے۔ اس کے یہاں لفظوں کی شوکت و رفعت مرعوب کن ضرور ہے لیکن سوز واثر سے خالی ہے جو تغزّل کی جان ہیں۔ میرؔ صاحب کے انداز کی نرمی، ملائمت اور دھیما پن شاعرانہ صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ برخلاف اس کے سوداؔ کے بے موقع جوش وخروش سے بلاغت اور تغزّل کو ٹھیس لگتی ہے۔ میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سوداؔ نے اسی مضمون کو ادا کرنے میں پھر قصیدے کے شاندار لفظ برتے ہیں جو غزل میں بے موقع ہیں ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت   خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

سعدیؔ شیرازی کا مشہور شعر ہے ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میر تقی میرؔ نے بالکل اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی سے ادا کیا اور پہلے مصرع میں گناہ کے لفظ کو لاکر لطف کو دوبالا کر دیا۔ شعر ہے ؎

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے

میر صاحب کا شعر ہے ؎

دین و مذہب عاشقوں کا قابل پرسش نہیں　　یہ اُدھر سجدہ کریں، ابرو جدھر اُس کی ہلے

خواجہ میر دردؔ نے بالکل اسی مضمون میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے مضمون کو اور زیادہ نکھار دیا۔ اُن کا شعر ہے ؎

ہم جانتے نہیں ہیں اے دردؔ کیا ہے کعبہ　　جیدھر کو ہے وہ ابرو، اُودھر نماز کرنا

غالبؔ کی جدّتِ ادا

اُردو غزل میں غالبؔ جدّتِ ادا کا امام ہے۔ میرؔ اور مومنؔ بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن غالبؔ انہیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ　　شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

باوجود میرؔ صاحب کی استادی کو ماننے کے غالبؔ کو خود بھی اپنی خوش ادائی کا احساس تھا اور وہ جانتا تھا کہ جو حسنِ ادا اس کے کلام میں ہے وہ اُردو کے کسی اور شاعر کے یہاں موجود نہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اردو میں مرزا کی غزل میں رمزی اور ایمائی انداز بیان اپنے کمال پر پہنچا۔ ذوق کی رسمی معاملہ نگاری اور صنعت گری کی داد دینے والوں کے لئے یقیناً غالب کا کلام سمجھنا دشوار ہوا ہوگا۔ جس نے اپنی ابتدائی شاعری میں بیدل کا تتبع کیا تھا۔ چنانچہ انہی لوگوں کی بدذوقی اور خیالی پستی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

سطحی علم ونظر رکھنے والے نکتہ چینیوں کے جواب میں اس کو کہنا پڑا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

شاعر کے تخیل میں اگر واقعی قوت اور جان ہے تو وہ نہ صرف اپنے زمانے کو بلکہ آنے والے زمانے کو بھی متاثر کرے گا بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ اپنے زمانے سے زیادہ آنے والے زمانے کو متاثر کرے۔ ممکن ہے کہ شاعر کے ہم عصر اپنی جذباتی اور تخیلی کم مائگی کے سبب سے اس کے کلام سے اتنے لطف اندوز نہ ہو سکیں جتنی کہ بعد میں آنے والی نسلیں جن میں علم و حکمت کی ترقی کے باعث تاثر پذیری کی صلاحیت زیادہ موجود ہو۔ چنانچہ غالب کے کلام پر یہ بات ہو بہو صادق آتی ہے اُس نے اپنی شاعرانہ بصیرت سے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ اس لئے کہ اُس کو یقین تھا کہ مغربی علوم و فنون کی بدولت آئندہ اس کے ہم زبانوں کی ذہنی اور تخیلی صلاحیتیں

بیدار ہوں گی۔ ایک فارسی غزل کے چند شعر ہیں ؎

تا ز دیوانم کہ سر مست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

بیدل کے تتبع کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مرزا نے اپنے بیان کی ندرت اور تخیل کی جدت کے لئے اپنا علیحدہ طرز ایجاد کیا جو انہی کے لئے مخصوص رہا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا۔ مرزا نے آخری زمانے میں اس طرز کے غریب اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوب بیان کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مرزا صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ حکیم نکتہ داں بھی تھے۔ انہوں نے تغزل میں حکمت و فلسفہ کو بڑی خوبی سے سمویا اور اس طرح زندگی کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔ مرزا کی ان غزلوں کو بھی جن میں کوئی مشکل لفظ نہیں آتا ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔ انہیں سمجھنے کے لئے ایک خاص ملوے ذوق و امتیاز اور علمی بصیرت درکار ہے۔ جس کی کاوش و کاہش کے بغیر رموز و معانی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا کا تغزل اردو زبان میں رمزنگاری کا آخری نقطہ ہے۔ اس کے سہل ممتنع کی ایمائی کارفرمائیوں میں بھی رموز و معانی کی گہرائی برقرار رہی۔ اس لئے کہ اس کے تخیل کی پرواز کا انداز ہی نرالا اور اچھوتا تھا۔ اس کی نواہائے راز کو محرم راز ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی رمزنگاری کی جانب کیا خوب اشارہ کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب نے عامیانہ خیالات اور مبتذل محاوروں سے ہمیشہ احتراز کیا۔ اگرچہ

اُس نے رعایت لفظی سے اپنے کلام کے حسن کو دوبالا کیا۔ لیکن اس باب میں بھی اُس کی راہ دوسروں سے الگ رہی۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ کسی نے اس شعر کی بہت تعریف کی اور اسد شاگرد سودا کا یہ شعر پڑھا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　مرے شیر، شاباش رحمت خدا کی

اسد کے تخلص کی وجہ سے دھوکا ہوا کہ یہ شعر شاید مرزا کا ہوگا۔ مرزا شعر کو سُن کر برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے،

"صاحب جس بزرگ کا یہ مقطع ہے اُس پر بقول اُس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر، بت اور خدا، جفا اور وفا میری طرزِ گفتار نہیں ہے۔" (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۸)

لیکن مرزا غالب نے حسن ادا کو چمکانے کے لئے جہاں لفظی رعایت برتی ہے وہاں شعر کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی　　پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی　　کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
(پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال　　دل گم گشتہ مگر یاد آیا)
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس غزل کے ہر شعر میں لفظی اور معنوی رعایت موجود ہے لیکن تصنع نام کو

نہیں۔ ہر لفظ اپنا مقام رکھتا ہے اور کس خوبی کے ساتھ رمز و کنایہ سے ہم آہنگ ہے۔ پوری غزل ایمائی تاثیر میں رچی ہوئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زبان خود تخیل کی تخلیق کی ہوئی ہے جو بلند اور دقیق تھا۔ اردو تغزل میں یہ بالکل نیا لب و لہجہ ہے جو مرزا سے پہلے کسی کے یہاں نہیں ملتا ۔۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے لفظ معانی کے لئے اور معانی لفظوں کے لئے بنے ہیں۔ یہ تغزل کا کمال ہے کہ لفظ اور معنی کی دوئی باقی نہ رہے۔

مندرجہ ذیل غزل میں کوئی لفظ مشکل نہیں لیکن مرزا کے اچھوتے طرزِ ادا نے معمولی لفظوں کو بے پناہ تاثیر، قوت اور وسعت عطا کردی ہے۔ ظاہر ہے اس غزل کا اشکال لفظی نہیں رمزی ہے ؎

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔۔۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل ۔۔۔ میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی ۔۔۔ ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد ۔۔۔ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

مرزا کے نغموں میں جمالیاتی صداقت کا انکشاف مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ اس کے کلام میں کہیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے سارے لوازمات ہیں۔ کہیں رندانہ جسارتوں کی بلند آہنگیاں اور شوخیاں ہیں۔ اور کہیں رموزِ حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجیہ۔ مرزا کے ہاں داخلیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُس نے اس باب میں انتہا پسندی سے پرہیز کیا۔ نہ ایسی دروں بینی ہے کہ غیر خود کا وجود ہی نہ رہے۔ اور نہ ایسی خارجیت ہے کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات

کے اندرونی تجربوں اور خیالی پیکروں کی دنیا بے رنگ اور بے کیف ہو جائے۔ خارجیت جب غزل میں برتی جاتی ہے۔ تو محبوب کے خد و خال، لب و دنداں، چال ڈھال، زلف و رخسار اور قد و قامت کے بیان میں شاعر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ داخلی زندگی کے احوال پیش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ مرزا غالب کی خارجیت جرأت اور ناسخ اور لکھنو کے دوسرے شاعروں کی خارجیت سے بالکل مختلف ہے۔ جذبے اور تخیل کی رمزی اثر آفرینی کی وجہ سے اس میں اندرونی تجربے کی جھلک ہمیشہ برقرار رہی۔ اس طرح مرزا کی درون بینی میں اگرچہ بعض جگہ ماورائیت پائی جاتی ہے لیکن بالعموم وہ اپنے مجازی رنگ کے باعث اسی دنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے یہاں جذبے نے حسی تجربے کی تہذیب کی ہے اور شعور نے تحت شعور کے خزانوں کو کھنگالا ہے تاکہ تضادوں کو دور کر کے صحیح جمالیاتی قدر کی تخلیق ہو۔ چاہے مضمون کچھ ہی ہو۔ مرزا کے لب و لہجے کی متانت اور سنجیدگی، لفظوں اور بندشوں کی موزونیت اور رمزی اثر آفرینیاں دلوں کو لبھاتی ہیں۔ بعض دفعہ انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ تاثیر کہاں سے آگئی؛ مرزا غالب کے ہاں جذبے اور فکر اور تخیل کا ایسا لطیف امتزاج ملتا ہے کہ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں اس کی نظیر نہیں۔ غزلوں میں سب ہی بحریں برتی گئی ہیں لیکن کہیں بھی موسیقیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا کہ شعر کا جادو اسی سے جگایا جاتا ہے۔

مرزا نے اپنے تخیلی اور جذباتی تجربوں کو ایک دوسرے میں تحلیل کر دیا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو بے عناں ہونے کا موقع نہ ملا جس سے کلام میں ناہمواری پیدا ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی زمانے میں مرزا کا تخیل بیدل کے تتبع میں بے قابو سا معلوم ہوتا ہے جو جذبے سے بڑی حد تک بے تعلق ہے۔ لیکن بھلا یہ بے اعتدالی جاتی رہی اور مرزا کا وہ خاص رنگ نمایاں ہوا جو اسی کے لئے مخصوص رہا اور آج تک کوئی اس کی ہمسری

نہ کر سکا۔ اس طرز میں فکر و تخیل دونوں جذبے سے ہم آہنگ ہیں۔ مرزا کے کلام میں شعر کے یہ تینوں عناصر اس خوبی سے ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ اُن کے علیحدہ وجود باقی نہیں رہے۔ ان کی ملاوٹ سے ایک مخصوص طلسمی کیفیت پیدا ہوگئی جو تغزل پر چھا جاتی ہے جس کو ہم محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن اس کا منطقی تجزیہ اور تعریف نہیں کر سکتے۔ یہ اس کی قادر الکلامی کا اعجاز ہے کہ اس نے ان شعری عناصر کو اپنے منشا کے مطابق جس طرح چاہا ڈھالا اور اُن سے جس طرح کے نقوش چاہے پیدا کیے۔ اسی واسطے اس کے ہر شعر میں اس کے طرز ادا کی جلوہ گری نظر آتی ہے، جو اُس کی شاعرانہ شخصیت کی آئینہ دار ہے اردو کے کسی شاعر نے شاعرانہ صداقت کی تخلیق اس بلند معیار سے نہیں کی جس طرح مرزا غالب نے۔ اس کے یہاں لفظ اور معنی کی دوئی باقی نہیں رہتی بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی رمزی اور طلسمی تاثیر ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مرزا کے کلام کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب اعلیٰ فکری صلاحیت اور اعلیٰ جذباتی صلاحیت ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو حقیقی جمالیاتی تخلیق ہوتی ہے۔ اعلیٰ آرٹ کی تخلیق نہ خالص فکری انسان کر سکتا ہے اور نہ خالص جذباتی انسان۔ اس جمالیاتی توازن میں زندگی کے توازن کا اشارہ ملتا ہے۔ اس توازن کے بغیر آرٹسٹ نہ تو اپنے ماحول کی پیچیدگیوں پر حاوی ہو سکتا ہے اور نہ اپنے شعوری اور تحت شعوری امکانات کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ جمالیاتی تخلیق حقیقت اور حسن میں وابستگی پیدا کرتی ہے تاکہ حسن کی اقدار کا تحفظ ممکن ہو اور اُس کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔

حسن و عشق کی داستان سرائی میں غالب نے تصنع سے احتراز کیا۔ صنائع و بدائع ویسے بھی اس کے کلام میں کم ملتے ہیں لیکن واقعہ گزاری میں اُن سے اور بھی بچنے کی کوشش کی ہے اگر کہیں کوئی صنعت یا رعایت آگئی ہے تو وہ بالکل فطری معلوم ہوتی ہے اور ذوق کہیں بھی انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ واقعہ گزاری کے ضمن میں دوسرے شاعروں کی اسی معاملہ

بندی کی توقع مرزا سے نہ کرنی چاہئے۔ اس باب میں بھی اس کا انوکھا پن اور اُپج نمایاں ہیں۔ تحسین حسن اور کیفیات محبّت کو بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عشق و حسن کے سارے نازک پہلوؤں پر مرزا کی نگاہ پڑی۔ چنانچہ کہیں عجز و نیاز کا اظہار ہے تو کہیں دامن محبوب کو حریفانہ کھینچنے کی دعوت ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو آج اُس کے حریفانہ کھینچئے

ایک اور جگہ محبوب کے دامن کو کھینچنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے گریبان کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر جاتے ہیں۔ خود بالکل معصوم بن کر اپنے ہاتھوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں کہ انہیں کسی طرح چین نہیں پڑتا۔ ان کی کھینچا تانی کی عادت نہیں جاتی۔ کبھی میرے گریبان کو چاک کرنے کے درپے ہیں تو کبھی جاناں کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ اس شعر میں روح تغزل اپنی ساری شوخیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

کبھی محبوب کے دامن کو حریفانہ کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ وہ خود بیباکی کی اجازت دے دیتا ہے۔ ایسی صورت میں جھجکنا یا پشیمان ہونا سب سے بڑا قصور ہے۔ فرماتے ہیں ؎

لہ جگر نے بھی ایک جگہ محبوب کی تغافل شعاری کو تنبیہ کیا ہے کہ عشق کی فطرت میں ایک حریفانہ نشان موجود ہے جس سے ہشیار رہنے کی ضرورت ہے

ہوشیار اے مستِ صہبائے تغافل ہوشیار
عشق کی فطرت میں اک شانِ حریفانہ بھی ہے

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے　　کوئی تقصیر بہ جز خجلتِ تقصیر نہیں

جذبۂ رشک کی عجیب و غریب توجیہ کرتے ہیں۔ یہ رشک دوسروں سے زیادہ خود اپنی ذات سے ہے ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں و لے اُن کی تمنا نہیں کرتے

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ایک طرف تو محبت میں خود اپنی ذات سے رشک پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف خود محبت کی یہ شان ہے کہ عاشق چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کو ساری کائنات محبوب سمجھے۔ اس سے خود اپنے جذبے کی عظمت کا احساس مقصود ہوتا ہے چنانچہ یوسف کو دیکھ کر زنانِ مصر کی محویت پر زلیخا کی خوشی کی یہی توجیہ کی ہے۔ شعر ہے ؎

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

باوجود محبت کی مایوسیوں کے مرزا پُر امید رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں محبت اور امید دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیئے

معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بعض اوقات جرأتِ رندانہ آہ و بکا کے مقابلہ میں حصولِ مدعا کے لئے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ فریاد کی بے اثری کے متعلق کہتے ہیں ؎

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دوسری جگہ اسی مطلب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز   کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

نالوں میں اثر ہو یا نہ ہو لیکن ایک لگاؤ ہمیشہ باقی رہنا چاہیئے۔ محبت نہیں تو عداوت ہی سہی۔ بغیر لگاؤ کے زندگی دوبھر ہو جائے گی ؎

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو   کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

پھر کس سادگی اور پُرکاری سے اس مطلب کو ادا کرتے ہیں ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کبھی آرزو اس لئے کی جاتی ہے کہ ناکامی کی حسرت سے دل لطف اندوز ہو ؎

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اسی بات کو دوسرے پیرائے میں یوں کہتے ہیں ؎

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

شاعر اپنی تمنا کا سفر کسی منزل پر ختم نہیں کرتا۔ جب ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے تو آگے کی منزل کی روشنی اسے دُور سے نظر آنے لگتی ہے۔ اور وہ اپنا قدم اس طرف بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس بلند اور حکیمانہ مضمون کو —— اس خوش اسلوبی اور سادگی سے ادا کیا ہے کہ حکمت و نغمہ ہم آہنگ ہو گئے ہیں ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب   ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

جس منزل پر پہنچ گئے وہ نقشِ پائے رہرو کے مماثل ہو گئی۔ جب نقش کی طرح اس میں جمود ہے تو دل اس پر کیسے رہ جھے۔ دل تو دائمی حرکت چاہتا ہے کس خوبی سے

سوال کرتے ہیں کہ دشت امکان جب نقش پا کی مثل ہے۔ تو اب تمنا دیکھو اپنا دوسرا قدم کدھر بڑھاتی ہے؟ تمنا کے لئے دشت امکان کے علاوہ اور دوسرے بہت سے جہان ہیں جن کی تسخیر اس کا مقصود و منتہا ہے اور جہاں اسباب و علل کی دنیا کی طرح مجبوریاں نہیں۔

غالب کے کلام کا بیشتر حصہ مجاز کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس مجاز سے حقیقت کا دامن ٹکا ہوا ہے۔ یہ بھی رمز نگاری کا کمال ہے کہ سامع حقیقت اور مجاز کے دونوں پہلو اپنے مزاج کی کیفیت کے مطابق کلام میں سے ڈھونڈھ نکالے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ کبھی خاص حالت میں ایک پہلو مزا دیتا ہے اور دوسری حالت میں اسی شعر کا دوسرا پہلو لذت بہم پہنچاتا ہے۔ سعدی، حافظ اور دوسرے غزل کے اساتذہ کے کلام میں بھی آپ یہ صفت پائیں گے جس کے باعث ان کے کلام کی ہمہ گیری آج تک مسلم چلی آتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عشق مجازی کی شورش اور مستی اور عشق حقیقی کا جذب و عرفان موجود ہے۔ دونوں صورتوں میں تخیل اور اصلیت ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ رہتے ہیں۔ اس کی دنیائے خیال میں تنوع ہے۔ اس لئے کہ اس کا اندرونی تجربہ نہایت وسیع اور گہرا تھا۔ حقیقت کے اس پہلو کو جو نامعلوم اور غیر مرئی ہے اور جس کا احساس صرف وجدان کر سکتا ہے۔ غالب نے رمز و کنائے کی زبان میں بیان کیا ہے؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کے اس شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر ہو سکتا ہے۔ جس طرح بھی اسے سمجھئے لطف میں کوئی کمی نہیں آتی؎

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب کی اس ہمہ گیری میں اس کی عظمت مضمر ہے لیکن بعض دفعہ نہایت واضح طور پہ مجاز ہی سے گفتگو کی ہے اور اس میں کھینچ تان کر کے حقیقت کے پہلو نکالنا ذوقِ سلیم کے لئے گراں ہے۔ مندرجہ ذیل شعر سوائے مجاز کے اور کوئی پہلو اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن ان میں آپ کہیں عریانی یا ابتذال کا نشان نہ پائیں گے۔ اگر کہیں خارجیت کا کوئی پہلو ہے تو وہ بھی تخیل اور جذبے کی لطافت میں سمویا ہوا ہے جو کبھی ذوقِ سلیم کو ناگوار نہیں ہو سکتا۔ جسے تجربے اور جذبے کو اس خوبی سے سمو دیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اس کے عاشقانہ اضطراب میں بھی توازن، رکھ رکھاؤ اور عالمگیریت ہے۔ اس کے اندرونی تجربے سارے عالم کے تجربے معلوم ہوتے ہیں ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اسی مضمون کا مومن خاں کا شعر بھی خوب ہے ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب کی واقعہ گزاری کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں جن کی خوش ادائی پر بلاغت جتنا ناز کرے کم ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یا رب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

غیر کو یا رب وہ کیونکر منع گستاخی کرے — گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

ہجر و انتظار کی کیفیات غزل گو شاعروں کا ایک عام اور پیش پا افتادہ مضمون ہے جسے غالب نے اپنی ندرت بیان اور حسن ادا سے بالکل دوسرے ہی پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

انتظار اور تمنا کو کس خوبی سے آغوش در آغوش کیا ہے ؎

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا — افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

محبت یکسر انتظار و تمنا ہے۔ آرزو جب تک پوری نہ ہو اس وقت تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا محبت کے آداب میں داخل ہے۔ محبت کی فطرت میں صبر و انتظار کے عناصر موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی تکمیل کر سکے۔

دوسری جگہ انتظار کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

محبوب کو کس خوبی سے سمجھاتے ہیں کہ میرا نالہ شکوۂ بیداد نہیں بلکہ تقاضائے ستم ہے۔ تو غلط مت سمجھ۔ یہ شعر رمز نگاری اور واقعہ گزاری دونوں کا اعجاز ہے

کہتے ہیں ؎

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اسی مضمون کو دوسرے طور پر یوں ادا کیا ہے ؎

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

شکوے شکایت کے مضمون کو مختلف انداز سے اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اسی خیال کو دوسری جگہ یوں بھی باندھا ہے ؎

ہوں سراپا سازِ آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

محبوب جب خصوصیت کے ساتھ پردہ کرتا ہے تو اُس کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا چھوڑ دو ورنہ لوگوں کو خواہ مخواہ اس طرف متوجہ ہونے کا موقع ملے گا

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

جب وہ پردہ نہیں کرتا اور سامنے آتا ہے تو نظارے کی تاب نہیں۔ کبھی خود نظارہ کرنے والی نگاہیں رُخِ جاناں پر بکھر کر پردہ بن جاتی ہیں۔ کبھی بہار کی رنگارنگی حجاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کبھی خود حسن برقِ نظارہ سوز بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

؎ کم و بیش اسی مضمون کو اصغرؔ نے بھی بڑے دلآویز (بقیہ بر صفحہ ۲۸۷)

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز   تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عرض کہ عجیب شاعرانہ کشمکش ہے۔ اگر محبوب پردہ کرتا ہے تو وہ ناگوار ہے۔ اور اگر وہ پردہ نہیں کرتا تو تابِ نظارہ نہیں۔ تغافل کا گلا کرنے گئے اور اس نے ذرا توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں فنا ہو گئے ؎

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلا   کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

کبھی عشق کی نگاہِ گرم نقابِ حسن کے سب بند ایک ایک کر کے کھول دیتی ہے سب پردے اٹھنے پر دل کو یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ نگاہ کا پردہ اب بھی باقی رہ گیا

وا کر دیئے ہیں عشق نے بندِ نقابِ حسن   غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا[1]

کبھی نظارے کی تاب لے آتے ہیں لیکن ادائے مطلب کیلئے زبان بند ہو جاتی ہے ؎

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں   غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا[2]

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۸۶) طریقے پر ادا کیا ہے ؎

تھیں خود نمود حسن میں شانیں حجاب کی   تجھ کو خبر رہی نہ رُخِ بے نقاب کی

---

[1] اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہے ہر طرف

ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں جسے   اصغر

اس بیخودی ہوش کی ہو کس سے شکایت   وہ سامنے ہیں پھر بھی تماشا نہیں ممکن

حیرانی نگاہ سے حُسنِ جمالِ یار   حسرت

تھا پردۂ حجاب میں گو بے حجاب تھا   حسرت

---

[2] اسی مضمون کے میرؔ کے متعدد شعر ہیں ؎   (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۸۸)

شوقِ وصل اور شکوہ ہجراں کا مفصل ذکر کرنے کی خواہش دل میں رہتی ہے اور اُس دن کا انتظار کرتے ہیں جب اُن کے اظہار کی نوبت آئے گی ؎

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوہ ہجراں
خدا وہ دن کرے اس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ایک جگہ غالبؔ نے حیا اور خواہشِ اظہار کی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے عجیب غریب مضمون پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شرم ایک ادائے ناز ہے اور ہر ادا کے لئے ضروری ہے کہ وہ ظہور میں آئے۔ اس طرح شرم و حجاب خود بے حجابی کا موجب بن جاتے ہیں۔ شعر ہے ؎

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب جو ہیں یوں حجاب میں

حسرتؔ کے یہاں بھی مضمون اس طرح ملتا ہے ؎

چھپے ہو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

غالبؔ کے طرزِ ادا میں بلا کی شوخ نگاری ملتی ہے جس کی نظیر اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ یہ شوخی عشقیہ مضامین تک محدود نہیں بلکہ دوسرے مسائل کے متعلق بھی ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ شوخی اور البیلاپن داغؔ کے

(بقیہ از صفحہ ۲۸۷) کہتے تھے کہ یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

کہتے تھے اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ — وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ
جب مل گیا تو رہ گئے لاچار دیکھ کر

دل میں کتنے مسودے تھے ولے — ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

یہاں بھی ہے۔ لیکن اس میں بعض جگہ خفیف سی ہوسناکی آگئی ہے جو جذبے سے زیادہ حسّی تجربے کو نغمے سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے۔ غالب کی شوخی کا معیار بہت بلند ہے اور اس کی طرزِ ادا نے اس بلندی میں خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی — سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا اُس کا پاسباں اپنا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں — ایسی جنّت کا کیا کرے کوئی

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو گر تم دہاں نہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ مضامین میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ متانت

اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے۔ اس طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور اجاگر ہو جاتی ہے اور ذوق لطف اندوز ہوتا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

غالبؔ نے اپنے حکیمانہ انداز کے شعروں میں بھی طرزِ ادا کی جدت سے تغزل کی خوبیوں کو قائم رکھا ورنہ یہی مضمون بالکل روکھے پھیکے ہو جاتے۔ اس کے کلام میں واعظانہ مقدمات نہیں ملتے۔ ہاں حکمت و اخلاق کے مسائل کو رمز و ایما کی زبان میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کی شاعری خالص تصورات کی شاعری بن گئی ہے۔ جس کو لطافت اور دل نشینی کی رنگ آمیزی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

قبلہ مقصود بالذات نہیں بلکہ محض قبلہ نما ہے۔ مقصود و منتہا کی طرف اس سے رہبری ہوتی ہے اور بس ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

حکیمانہ رموز و اسرار کا کس خوبی سے انکشاف کیا ہے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

تنگیٔ دل کا گلا کیا کہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھا کہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

مرزا غالب کے کلام کی اصلی خوبی ان کے طرزِ ادا کی جدّت اور انوکھا پن ہے انہیں معمولی بات بھی اگر کہنا ہے تو اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں جو جذبے کی تاثیر اور خیال

کی دل کشی میں رچا ہوا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور ضرورت کے وقت لفظی اور معنوی تصرفات سے بھی کام لیا ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان کے خود موجد ہیں۔ اُن کے مضامین اور استعاروں کا اچھوتا پن ان کی شاعرانہ بصیرت پر دلالت کرتا ہے بعض جگہ قدما کے مضمون میں تعجب انگیز نزاکتیں پیدا کر دی ہیں۔ دراصل کوئی مضمون کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ جو اس کو دل نشیں انداز میں باندھ دے وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ اپج اور انوکھا پن مطلق حیثیت سے کہیں نہیں پائے جاتے۔ ذہنی تخلیق پرانے نقوش اور تصورات کو امتزاج کی نئی صورت عطا کرتی ہے جس میں جدت ادا سے جان پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ غالب نے جب کبھی دوسرے استادوں کے مضمون مستعار لئے ہیں تو ان میں اپنے بیان کے پیرائے سے کوئی جدت ضرور پیدا کی ہے۔ یہاں چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں۔

سعدی کا شعر ہے ؎

یا وفا خود نبود در عالم   یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اسی مضمون کو مرزا نے اپنے حسن ادا سے اور بلند کر دیا ؎

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خسروؔ کا شعر ہے ؎

جاناں اگر شبیہت دہن بر دہن نہم   خود را بخواب سازد و گوید دہان کیست

غالبؔ اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن   ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

خسروؔ کا دوسرا شعر ہے ؎

نہ ہے عمر درازِ عاشقاں گر   شب ہجراں حساب عمر گیرند

غالبؔ کہتے ہیں ؎

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے شعر میں ایما و اجمال کی جو خوبی ہے وہ غالب کے شعر میں نہیں۔ اس لئے غیر ضروری تفصیل اور توضیح سے کام لیا جو خسرو کے یہاں نہیں۔

خسرو کا ایک اور شعر ہے ؎

اے گل چوں آمدی ز زمیں گو چگونہ ماند　　　آں رو ئیہا کہ در تہ گردِ فنا شد نہاں

میر تقی میر نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ہر قطعۂ چمن پہ ٹک گاڑ کر نظر کر　　　بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

غالب نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسرو کا شعر ہے ؎

جراحتِ جگرِ خستہ گاں چہ می پرسی　　　ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ شوخ کر دیا ؎

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو　　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

حافظ دنیائے غزل کا امام ہے۔ اس کا تغزل بے مثل ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کو نہیں لایا جا سکتا۔ تاہم یہاں چند ہم مضمون شعر پیش کئے جاتے ہیں جنہیں پہلے حافظ نے باندھا اور اس کے بعد غالب نے ان پر طبع آزمائی کی۔ حافظ کی تنقیص مقصود نہیں، صرف یہ دکھانا ہے کہ قدیم اساتذہ نے جو مضمون غزل میں باندھے ہیں، ان میں بعض اوقات ذرا سی تبدیلی کر کے بعد کے شاعروں نے لطف میں اضافہ کر دیا اور حسنِ ادا سے وہ مضمون گویا انہی کا ہو گیا۔ اس طرح بدلنے سے پرانے مضمون میں بھی اچھوتا پن پیدا ہو جاتا ہے اور جدتِ ادا سے اس پر نئی چھاپ پڑ جاتی ہے۔ اساتذہ غزل کے چند شعروں کا غالب کے شعروں سے اسی نقطۂ نظر سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ حافظ کا شعر ہے ؎

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غالب نے تھوڑے سے تصرف سے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ زود پشیماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ کر دیا ہے اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حافظ کا شعر ہے ؎

من کہ ملول گشتمے از نفس فرشتگاں　　قال و مقال عالمے میکشم از برائے تو

غالب کا شعر حسنِ ادا اور تاثیر میں حافظ کے شعر سے کم نہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

عرفی کا شعر ہے ؎

نالہ می کشم از دردِ تو گاہے لیکن　　تا بلب می رسد از ضعفِ نفس می گردد

غالب نے اسی مضمون میں کیا خوب نزاکت پیدا کر دی ؎

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے　　جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

فیضی کا شعر ہے ؎

نوش دار وئے محبت را مپرس اجزا کہ چیست　　سودۂ الماس و زہر ہلاہل می کنند

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا　　کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

نظیری کا شعر ہے ؎

نشاط رفتہ ز دوراں بہ صبر لبستانم　　کہ بد معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

غالب نے اسی مضمون میں ندرت پیدا کر دی اور اس کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

شرفؔ قزوینی کا شعر ہے ؎

ہست صد منت بجاں از غیبتِ بدگو مرا — چوں بایں تقریب می آرد بیادِ او مرا

غالبؔ نے اسی مضمون میں اور زیادہ نزاکت اور لطافت پیدا کر دی۔ وہ کہتا ہے ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

قنوتیؔ تبریزی کا شعر ہے ؎

باد چو می رسم آسودہ می شوم از دور — ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف

غالبؔ نے اسی مضمون کو اپنے لطفِ بیان سے اور زیادہ چمکا دیا۔ اُس کا شعر ہے ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

میر تقی میرؔ کا شعر ہے ؎

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

میرؔ صاحب کے شعر میں ذوقِ شعری کی کوئی کور کسر نہیں نکال سکتا لیکن غالبؔ نے اپنے اعجازِ بیان اور حسنِ ادا سے مضمون کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ وہ اسی بات کو یوں کہتا ہے ؎

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

اُڑے گی اک بلا تیرے سر سُن لے اے صبا — زلفِ سیہ کا اُس کے اگر تار جائے گا

مومنؔ نے اسی مضمون میں ذرا سی تبدیلی کر کے اس کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ کہتے ہیں ؎

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ صبا بل تیرا — اُس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

اس نازکی سے گزرے کس کے خیال میں شب　　مرجھائے پھول سے ہو جو کچھ ملے ولے تم

غالبؔ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں　　دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

سراہا اُن نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم　　شہید ہوں میں تری تیغ کے لگانے کا

میرؔ صاحب کے شعر میں کنائے کی رمزی کیفیت اتنی نمایاں نہیں ہوئی جتنی کہ نفسِ واقعہ کی نوعیت۔ اسی مضمون کو غالبؔ نے تھوڑی سی تبدیلی سے زیادہ بلیغ اور پُرلطف بنا دیا۔ شعر ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

میرؔ صاحب جس بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ غالبؔ نے اجمال سے وہی کام بڑی خوبی سے نکال لیا اور استفہام کے ذریعہ رمزی کیفیت اجاگر کر دی میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر
میں اُس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالبؔ کا شعر ہے ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

جب دردِ دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں　　کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

غالبؔ نے اسی مضمون میں اپنی خوش ادائی سے اور نزاکت پیدا کر دی اس کا شعر ہے ؎　زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

لفظ کرشمہ کی ایمائی اثر آفرینی ملاحظہ طلب ہے۔ شعر کا اطلاق حقیقت اور مجاز دونوں پر بلا تکلف ہو سکتا ہے اور دونوں صورتوں میں معنی کی دلآویزی میں کسی طرح کمی نہیں آسکتی۔

میر صاحب کا شعر ہے ؎

جی ہی جائے ہے میر جو اپنا دیر کی جانب کیا کریئے
یوں تو مزاج طرف کعبہ کے ہم تو بہتیرا لاتے ہیں

غالب نے اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میر صاحب کا شعر ہے ؎

بہر فردوس ہو آدم کو الم کاہے کو   وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کاہے کو

غالب نے فارسی میں اسی مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

ساقی بیار بادہ کہ از دودۂ جمم   زاں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

میر صاحب نے سیدھے سادے لفظوں میں ابتدائے محبت کا نقشہ یوں کھینچا ہے

(ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا) ؎

غالب نے اسی مضمون کو اپنی رمز نگاری کی بدولت اور زیادہ بلند کر دیا۔ ان دونوں شعروں میں میر اور مرزا کا بیان اپنے اصلی اسلوب اور نکھرے ہوئے رنگ میں نظر آتا ہے ؎

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

تلخی کام و دہن کی آزمائش کے بعد زہر غم رگ و پے میں اترتا ہے۔ اگر کوئی تلخی کام و دہن سے گھبرا اٹھے تو وہ منزل عشق کے اس مسافر کے مثل ہوگا جو سفر کے شروع ہی میں تھک کر بیٹھ جائے اور اپنا حوصلہ پست کرے۔

میرؔ صاحب رشک کے مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو — ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو

غالبؔ اسی مضمون میں جدتِ ادا سے نئی جان ڈال دیتا ہے۔ اس کا شعر ہے ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

میرؔ صاحب کا شعر ہے اور نہایت بلند شعر ہے ؎

میرے تغیرِ رنگ پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

مومنؔ نے اسی مضمون میں کنائے کے تیکھے پن سے ایک نئی بات پیدا کر دی۔ اس کا شعر ہے ؎

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

لطف پرائی کے ہم نشیں مت جا — کبھی ہم پر بھی مہربانی تھی

غالبؔ نے اپنے خاص انداز میں اس مضمون کے ساتھ رمز و کنایہ کی پیچیدگی دیدہ و دانستہ پیدا کی تاکہ زندگی کا الجھاؤ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ سامع کے دل میں پر اسرار کیفیت پیدا ہو۔ اس کا شعر ہے ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

میرؔ صاحب کا شعر ہے ؎

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — غم کے جانے کا نہایت غم رہا

غالبؔ اپنے خاص انداز میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے ؎

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

طرزِ ادا کی جدت اور انوکھے پن کی ایسی مثالیں اردو شاعروں میں سوائے

غالب کے کسی اور کے یہاں نہیں ملتیں۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

نہ لڑ ناصح سے ناداں کیا ہوا گر اس نے شدت کی　　ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

بس ہجوم نامرادی خاک میں مل جائے گی　　وہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

چند وصفی اور تزئینی کلمات

طرزِ ادا کی رمزی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے بعض وقت غزل گو شاعر ایسے لفظ استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے تاکہ ایمائی اثر نکھر سکے۔ مثلاً سا — سی — سہی اور تو کے لفظ۔ ان وصفی اور تزئینی کلموں کے استعمال سے رمزی اور ابہامی دونوں کیفیتیں بڑھ جاتی ہیں اور ایمائی اثر پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے میر صاحب کے دیوان میں خاص کر ان لفظوں کے استعمال کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اردو کے کسی دوسرے شاعر نے ان لفظوں کو اتنا استعمال نہیں کیا یہاں چند مثالیں ملاحظہ طلب ہیں ؎

کعبے کی یہ بزرگی شرف سب بجا ہے لیکن　　دل کش جو پوچھئے تو کب اس آستاں سا ہے

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی　　جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

دل دفعتہً جنوں کا مہیا سا ہو گیا　　دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا

جلوہ ترا تھا جب تیئں باغ و بہار تھا　　اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

لطف کہاں وہ بات کہئے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سُرخ کلی بھی گُل کی اگرچہ یار کے لعل لب سی ہے
پرسشِ حال کبھو کرتے ہیں ناز و چشم اشارت سے
ان کی عنایت حال پہ میرے کیا پوچھو ہو غضب سی ہے
تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میرؔ تو چُپ تصویر سے تھے یہ بات انہوں سے عجب سی ہے

زندگی اپنی خواب کی سی ہے | یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے | پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں | ساری مستی شراب کی سی ہے

واماندگی نے مارا اثنارِ رہ میں ہم کو | معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو
افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں | سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

کیا اس کے گئے ہے ذکر دل کا | ویران پڑا ہے یہ مکاں تو

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا | ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

میر حسن دہلوی کا شعر ہے ؎

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں | ہاں مگر ایک ترے ملنے کا ارماں تو ہے

مصحفی کے شعر ہیں ؎

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بیتاب سا | کر رہا ہے بےقراری پارۂ سیماب سا

جوں گُل تر کیا ہی اس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اس کے ہے اک آب سا

جرأت کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

بدشتِ غار اب اپنے قدم کی برکت سے — قدم قدم پہ بہاریں ہیں سو چمن کی سی
جتاؤں دردِ محبت تو کس ادا سے ہائے — کہو نہ مجھ سے یہ باتیں دوانہ پن کی سی

دل ہے یارو یا خدا جانے کہ کیا آفت ہے یہ — تلملاتا ہے پڑا پہلو میں جو سیماب سا

غالبؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہوں تو یہ بھی نہ سہی

ظفرؔ کا شعر ہے ؎

کوچے سے زلفِ یار کے گزری ہے گر کبھی — عنبر فشاں نسیمِ سحر ہو گئی تو ہے

مفتی صدر الدین آزردہؔ کا شعر ہے ؎

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں — کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

مومن خاں کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
یہ شوقِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت — دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس پہ بھی — نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

ذکی دہلوی کے شعر ہیں ؎

وہ نونہال خوبی نازک ہے دلربا ہے — عالم ہے اس کی بو میں گل کی شمیم کا سا
ہے یار کا تصور امیدوارِ دل — جھونکا ہے ہر نفس میں موجِ نسیم کا سا

خموش ہو گئے کیوں عرضِ شوقِ وصل سے آپ — نہ ہو قبول تمنا مگر جواب تو ہو

کدھر ہے جادۂ منزل رفیقو دیکھو تو — کہاں ہے قافلہ بانگِ درا سنو تو سہی
چمن میں ہے اثرِ غمِ چٹکنا غنچوں کا — شکستِ دل کی ہے گویا صدا سنو تو سہی

نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور — ہمیں تو خاک اڑانی ہے کاروان نہ سہی

جلالؔ کا شعر ملاحظہ ہو ؎

لیتا ہے دل میں کوئی تو پوشیدہ چٹکیاں — بیدرد تو نہیں سہی دردِ نہاں سہی

امیرؔ مینائی کا شعر ہے ؎

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے — پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

خواجہ مرتضیٰ بقاؔ کے شعر ہیں ؎

دور میں جامِ شرابِ خوش گوار آنے تو دو — قالب مینا میں جانِ بادہ خوار آنے تو دو
صید کر لے گا زمانے کو شباب اس شوخ کا — تا کمر وہ گیسوئے عالم شکار آنے تو دو

داغؔ کے شعر ہیں ؎

عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دلفریب — دل میں کچھ اعتبار سا آنکھوں میں کچھ ملال سا
پوچھتے کیا ہو کون تھا ہو نہ ہو وہی داغؔ تھا — در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

کیا جب وعدہ آنے کا نہ آئے — اس آسانی کی دشواری تو دیکھو
بنالیں شرم آلودہ نگاہیں — تغافل کی یہ ہشیاری تو دیکھو

سجدے ہی کرتے جائیں گے ہم تیری راہ میں — ہے نقشِ پا سے عار تو نقشِ جبیں سہی

فانیؔ کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

نالے وہ اب ہیں لب پہ جو کھوئے ہوئے سے ہیں — آغوشِ اضطراب میں سوئے ہوئے سے ہیں
غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز — یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

سُن تو لیا ہے حالِ دل دیکھئے سُن کے کیا کہیں
پھر میرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی

سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے
نغمۂ آرزو سُنا، نوحۂ یاس بھی سہی

اک برقِ سرِ طور ہے لہرائی ہوئی سی — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے — امید کی آواز ہے گھبرائی ہوئی سی

فراقؔ گورکھپوری کے شعر ہیں ؎

پس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر ابھر نہ آئیں — وہ نقشِ آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں
تقریبِ دید ہیں غمِ ہجراں کی شدتیں — محسوس ہو رہا ہے وہ آئے ہوئے سے ہیں

جگرؔ کے کلام میں بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ایک پوری غزل اسی انداز میں ہے ؎

جان ہے بیقرار سی جسم ہے پائمال سا — اب نہ وہ دل نہ وہ جگر صرف ہے اک خیال سا
یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ — کچھ انہیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

تصوّرات کا مقابلہ

بعض اوقات شیوۂ نازک خیالی طرزِ ادا کی ندرت کو ظاہر اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے دو تمثیلی تصوروں یا خیالی پیکروں کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ گویا کہ ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے۔ یہ مقابلہ استعارے ہی کی ایک لطیف صورت ہے۔ جو جان بوجھ کر منطق کی صحتِ بیان کے خلاف ہوتی ہے تاکہ ایک کے بجائے دوہرا مطلب پیدا ہو اور محض خیالوں کے تلازم سے حقیقت ہمارے

سامنے جلوہ گر ہو جائے۔ اس طرح نہ صرف ایک تاثر دوسرے تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اس کا ابھار، اس کی شدت بڑھ جاتی ہے۔ کبھی تشبیہ و استعارے کی ندرت سے اور کبھی مراعاتِ لفظی اور مجاز معنوی کے استعمال سے بظاہر معانی کا تعین مقصود ہوتا ہے لیکن دراصل اس طرح ایمائی اثر آفرینی کی طرف ذہن کو منتقل کیا جاتا ہے تاکہ زندگی کے تضادوں کو بہتر سمجھا جا سکے۔ یہ تضاد ہر بڑے آرٹسٹ کی اندرونی کشمکش کا نتیجہ ہوتے ہیں جس کا اثر تخیل پر پڑنا لازمی ہے۔ اس ضمن میں تلمیح و تمثیل سے ایمائی کیفیتوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سوداؔ نے پہلے مجنوں اور کوہکن کا مقابلہ کیا ہے اور پھر ان دونوں کا خود اپنی ذات سے ؎

سوداؔ قمارِ عشق میں مجنوں سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

میر صاحب بھی اپنا مقابلہ قیس و فرہاد سے کرتے ہیں اور بڑی آن بان سے کرتے ہیں ؎

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور ۔۔۔ اب مرے عہد میں فسانے ہیں

ایک جگہ اپنا مقابلہ مجنوں سے اس طرح کیا ہے ؎

گذار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں ۔۔۔ کہ اس دیار میں میرؔ شکستہ پا بھی ہے

سوداؔ نے بالکل یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے ؎

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں ۔۔۔ کہ اس دیار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

میر صاحب کے کلام میں مقابلے کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ کہیں جنت کا مقابلہ کوئے یار سے کیا ہے اور کہیں مسجد کا دیر سے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

خوبی کی اپنی جنت کیسی ہے ڈینگیں مارے ۔۔۔ اس کی گلی کا ساکن ہرگز ادھر نہ جھانکے

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر ۔۔۔ مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا

میر صاحب نے اپنے دیدۂ خونبار کا مقابلہ ابر بہار سے کیا ہے اور اس کے انفعال کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

برسا تو میرے دیدۂ خونبار کے حضور پر اب تک انفعال ہے ابر بہار کو

ایک جگہ میر صاحب دیدہ و دل کی حالت کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں ، جیسے دونوں میں مقابلہ مقصود ہو ؎

ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

گل کا مقابلہ محبوب کے رُخ سے کرتے ہیں ، اور حسن تقابل اور حسن توجیہ دونوں کا حق ادا کرتے ہیں ۔ شعر ہے ؎

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رُخ سے باغ میں سیلی لگی صبا کی تو منہ لال ہو گیا

اسی مضمون کا دوسرا شعر ہے ؎

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

دوسری جگہ محبوب کے دہن سے غنچے کا مقابلہ کرتے ہوئے غنچے کو طعنہ دے کر بتاتے ہیں کہ کہاں تو اور کہاں دہن یار ۔ اس لیے چپ چاپ بیٹھا رہ ، میرے محبوب کے سامنے منہ نہ کھول ۔ اس واسطے کہ تیرے منہ سے بو آتی ہے ۔ دہن محبوب کے مقابلے میں غنچے کا ہیٹا پن ثابت کرنے کے لیے یہ اندازِ سخن اختیار کرتے ہیں ؎

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کیجیے

تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے

میر صاحب کو یہ بات ناگوار ہے کہ دہن محبوب کو غنچے سے تشبیہ بھی دی جائے ۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی مماثلت اور مناسبت ہی نہیں اگر کوئی تشبیہ دے تو ایک طرح کی خواہ مخواہ کی سخن سازی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ۔ شعر ہے ؎

سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ   تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنائی ہے

ایک جگہ بلبل کو تنبیہ کرتے ہیں کہ ذرا دیکھ سمجھ کر نالے کرنا اس لئے کہ چمن کے ایک گوشے میں ہم بھی موجود ہیں۔ ہمارے نالوں کے سامنے تیرے نالے مصنوعی اور غیر حقیقی ہوں گے۔ حسن تقابل ملاحظہ طلب ہے ؎

نالے کریو سمجھ کے اے بلبل   باغ میں اک کنارہ ہم بھی ہیں

پھر بلبل کو عشق و محبت کے آداب سکھاتے ہیں کہ کہیں میرے محبوب کو دیکھ کر بیتاب نہ ہو جانا۔ ممکن ہے کہ اسے یہ بات ناگوار گزرے۔ بلبل کا محبوب گل ہے جو نازک سہی لیکن اس میں وہ نازک دماغی تو نہیں جو میرے محبوب میں ہے۔ تقابل و لطافت سے حسن ادا کا حق ادا کیا ہے۔ شعر ہے ؎

گل سمجھ کر نہ کہیں بے کلی کرنے لگیو   بلبل اس لالہ خوش رنگ کی خو نازک ہے

اپنی اسیری اور صبا کی آزادی کا مقابلہ کرتے ہوئے صبا کو کس خوبی سے خطاب کیا ہے۔ اس شعر میں مقابلہ اور نقل قول کے محاسن نے شعر کی تاثیر کو بڑھا دیا اور سادگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کہتے ہیں ؎

کس کی ہوا کہاں کا گل ہم تو قفس میں ہیں اسیر
سیر چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا

اگرچہ مقابلہ مقصود ہے لیکن تقریر کا انداز نرالا اختیار کیا ہے۔ محبوب کو خطاب کرتے ہیں کہ تو چمن میں امتحان کے لئے نہ جا۔ بھلا بے چارے گل میں اتنی سکت کہاں کہ تیرے آگے زبان کھولے ؎

مت جنہیں باغ ہو اے غیرت گلزار   گل گیا کہ جب آگے ترے بات کرآوے

غالب نے اسی مضمون کے ایک فارسی شعر میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی ہے۔ وہ محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تیرا گل لطف گویائی نہ رکھتا ہے اور

تیری نرگس لذت دید سے آشنا ہے۔ تیری بہار ایسی پر کیف ہے کہ فطرت کی بہار میں یہ طرفگی کہاں! شعر ہے ؎

گلشت را نوا ز نرگست را تماشا — تو داری بہارے کہ عالم ندارد

غالبؔ نے اپنے کلام میں مقابلے کے ذریعے تمثیل و استعارے کا جو انداز اختیار کیا ہے۔ اس کی مثال اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اس کے ہر تمثیل اور استعارے میں کنائے کے نازک پہلو موجود رہتے ہیں جن سے کلام کی زینت میں اضافہ ہوتا ہے۔

محبوب کی جلوہ گاہ اور بہشت کا مقابلہ غالبؔ نے اس طرح کیا ہے ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اپنا اور آدم کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمیں محبوب کے کوچے سے نکلنے میں جو رسوائی نصیب ہوئی وہ آدم کو بھی جنت سے نکلتے وقت نہ ہوئی ہوگی ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

غالبؔ کے اور شعر ملاحظہ ہوں جن میں حسن تقابل سے رمزی اثر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ؎

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد — جنونِ ساختہ و فصل گل قیامت ہے

ایک طرف محبوب کی وفاداری ہے اور دوسری طرف عشق و محبت کا جھوٹا دعویٰ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بناوٹی جنوں اپنے اوپر طاری کرے۔ جس طرح بہار کا یہ اقتضا ہے کہ جنوں سچا اور حقیقی ہو اسی طرح وفا کا یہ اقتضا ہے کہ عشق و شوق کا دعویٰ سچا اور بلا تصنع ہو۔ وفا اور عشق بے بنیاد اور جنون اور فصل گل کی لفظی رعایتوں اور معنوی مناسبتوں نے حسن ادا کے جوہر کو چمکا دیا۔ شعر میں ہر لفظ اپنی جگہ پر نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔

جام مے اور خاتم جمشید کا مقابلہ کیا ہے اور جام مے کی خاص انداز میں

فضیلت ثابت کی ہے مضمون یہ باندھا ہے کہ جامِ مے سلطنت کی مثل ہے، جو رندوں کو دست بدست پہنچا ہے۔ یہ کوئی جمشید کی انگوٹھی تھوڑی ہے کہ جس پر اس کا نام کندہ تھا اور جو اسی کے پاس رہی اور کسی دوسرے کو اس سے فیض نہ پہنچا شعر ہے

سلطنت دست بدست آئی ہے　　　جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ایک جگہ انسانی عمر کی تیز رفتاری اور برق کا مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اوّل الذکر کے سامنے برق کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی نے اس کے پاؤں پر مہندی باندھ دی ہو وہ چلنے سے قاصر ہو گئی ہو۔ مبالغے اور مقابلے کی خوبیاں ایک دوسرے میں بڑی خوبی سے سمو دی گئی ہیں۔ شعر ہے

تیزیٔ فرصت کے مقابل اے عمر　　　برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

شراب اور شہد کا مقابلہ کرتے ہیں اور شراب کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی فوقیت زاہد کو اس طرح جتاتے ہیں

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد　　　مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

انسان کے دل کے داغ اور لالہ کے داغ کا مقابلہ کرنا مقصود ہے لیکن اوّل الذکر کو محذوف رکھا ہے اور لطفِ کلام کی عجیب نزاکت پیدا کی ہے مضمون یہ باندھا ہے کہ لالے کے پھول پر شبنم بے وجہ نہیں بلکہ وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ بے حس اور بے درد دل کا داغ خود اپنے آپ سے محجوب ہوتا ہے اور شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ گویا لالہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے سینے میں جو داغ ہے، وہ درد سے محروم ہے جو شرمندہ ہونے کی بات ہے۔ اس کے برخلاف انسان کے دل کا داغ چونکہ درد و احساس سے آشنا ہے۔ اس لئے اس کی عظمت مسلّم ہے شعر ہے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

محبوب کی تصویر کا خود محبوب سے مقابلہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر حسن کا معیار بے حسی اور تغافل ہے تو یقیناً تصویر زیادہ حسین قرار پائے گی ؎

کمالِ حسن اگر موقوف اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے (نسخۂ نظامی)

حور اور پری تو محبوب کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔ ہاں اگر اس کے مقابل ہو سکتا ہے تو خود اس کا عکس ہو سکتا ہے۔ محبوب کی لاجوابی کا بیان اس سے بہتر پیرائے میں ممکن نہیں۔ مقابلے نے کنائے کی کیفیت کو اور نکھار دیا۔ شعر ہے ؎

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے (نسخۂ نظامی)

حور اور پری تو محبوب کے مقابلے میں نہیں لائے جا سکتے لیکن خیال تھا کہ شاید اس کا عکس اس کے مقابل آ سکے۔ یہ خیال بھی غلط نکلا۔ محبوب کا عکس بھی اس کے مقابل آ کر اس کے ناز و غمزہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ مضمون آفرینی اور حسن ادا کی عجیب و غریب صورت پیدا کی ہے۔ محبوب کا بے مثل ہونا ثابت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کا عکس بھی بوجوہ اس کے مقابل نہیں آ سکتا۔ مقابلے کی یہ کوشش ملاحظہ طلب ہے شعر ہے ؎

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں؟

ایک جگہ بڑی دقیقہ رسی سے انسانی نفس کی اندرونی کشمکش کے مختلف عناصر کا مقابلہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک طرف جنونِ شوق کی کیفیت صحرا کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور دوسری جانب عقل گلشن کی طرف بلاتی ہے۔ آدمی حیرانی میں پڑ جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس خیال کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دیوانگی میں بھی عیش و طرب کی حسرت باقی رہتی ہے جو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ شعر ہے ؎

دیوانگی اسدؔ کی حسرت کش طرب ہے — در سر ہوائے گلشن و در دل ہوائے صحرا

اپنا اور قیس کا مقابلہ اس طرح کرتے ہیں کہ پورا شعر ایک استعارہ بن گیا ہے ؎

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

زلف کی درازی کا مضمون بہت پرانا اور پامال مضمون ہے۔ غالبؔ نے اس میں عجیب و غریب ندرت پیدا کر دی۔ وہ محبوب کی زلف کا مقابلہ اس کی سرو قامتی سے کرتا ہے۔ اور محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر تیری زلف گرہ گیر کے بل کھل جائیں تو وہ تیرے قد سے بھی زیادہ دراز ہے۔ یہ جو تیری سرو قامتی کی دھوم ہے اس کی حقیقت زلف کی درازی کے سامنے آشکارا ہو جائے گی۔ محبوب کے قد اور اس کی زلف کے مقابلے نے شعر کی بلاغت کو کس قدر بڑھا دیا ہے۔ شعر ہے ؎

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

زلف کی درازی کا مضمون مومنؔ نے بھی باندھا ہے لیکن وہ غالبؔ کے شعر کی سی رمزی کیفیت نہ پیدا کر سکا۔ جو زلف و قامت کے مقابلے کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ مومنؔ کے شعر کو سن کر نفس واقعہ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جس کے باعث شعر کی دلآویزی اور بلاغت کم ہو گئی۔ شعر ہے ؎

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں — لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

کم و بیش یہی مضمون سوداؔ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ محبوب کی چال اور زلف کی آویزش کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

ٹھہرا ہے تری چال میں اور زلف میں جھگڑا — ہر ایک یہ کہتی ہے لٹک مجھ میں بڑی ہے

ایک جگہ غالب نے آنکھوں اور کانوں کے باہمی رشک کا مقابلہ کیا ہے۔ اگر کبھی آنکھوں کو محبوب کا نظارہ نصیب ہو جاتا تو کانوں کو رشک ہوتا کہ ہم مژدۂ وصال سے محروم ہیں۔ یا اگر کبھی کانوں کو مژدۂ وصال ملتا تو آنکھیں رشک کرتیں کہ ہم دیدار کی ہوس پوری نہ کر سکیں لیکن اب آنکھوں اور کانوں کا باہمی رشک باقی نہیں رہا۔ اس لئے کہ مدت سے نہ تو نظارۂ جمال ہی میسر ہوا اور نہ مژدۂ وصال۔ دونوں کی محرومی نے ان میں موافقت پیدا کر دی اور کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں رہا ؎

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

غالب نے ایک موقع پر رشک اور عقل کا تقابل اور شاعر کے کان میں دونوں کی سرگوشیاں بڑے بلیغ انداز میں بیان کی ہیں۔ اور نقل قول کی بدولت شعر کی تازگی میں اضافہ کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رشک اور عقل کی مجرد کیفیتیں ذی روح بن گئی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ یہ دونوں استعارے ہیں جن کے عمل اور رد عمل سے جذبے کی پیچیدگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ شعر ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

یعنی رشک کا یہ شبہ کہ وہ اغیار کے ساتھ اخلاص برت رہا ہے، بے بنیاد ہے اس لئے کہ عقل اس شبہ کے پیدا ہونے کے ساتھ چپکے سے کہہ دیتی ہے کہ بھلا وہ آج تک کس کا دوست ہوا ہے کہ اب کسی کا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عقل کی رائے کو رشک کے شبہ پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح اپنے لئے وجہ اطمینان پیدا کر لیتا ہے، اندرونی خلش کی یہ داستان کس خوبی سے ان دو مصرعوں میں آگئی۔

قامتِ یار اور فتنۂ قیامت کا مقابلہ ملاحظہ ہو ؎

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم		قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہنا یہ مقصود ہے کہ تیری سروقامتی کے آگے فتنہ قیامت بھی ہیچ ہے۔ اس کو غالب نے اپنے مخصوص طرز میں بیان کیا کہ چونکہ قامت یار بھی فتنۂ قیامت سے بنا ہے۔ اس لئے فتنۂ قیامت ایک قدِ آدم کی حد تک کم ہو گیا۔ جو حصہ کم ہو گیا اس میں فتنہ کی ساری خاصیتیں جمع ہو گئیں۔ محبوب کے قد و قامت کی یہ ایمائی تعبیر و توجیہ خاص لطف اور شعریت اپنے اندر رکھتی ہے۔

شبِ فراق اور قیامت کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میں قیامت کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن شبِ ہجر کے مصائب کے آگے اس کی پریشانیاں ہیچ ہیں۔ انکار اور اثبات نے شعر میں عجیب لطف پیدا کر دیا۔ پھر شب اور روز کا تقابل ملاحظہ طلب ہے ؎		نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

اپنے گھر اور بیابان کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنوں میں اگر گھر برباد ہوا تو کیا مضائقہ ہے۔ بیابان کی وسعتیں تو ہاتھ آ گئیں۔ اس طرح یہ سودا کسی طرح بھی گراں تو نہیں۔ اس شعر میں اپنے گھر اور بیابان کا صرف مقابلہ ہی نہیں بلکہ انتخاب بھی ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو گیا ؎

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

دوسری جگہ کہا ہے کہ اگرچہ گھر کی ویرانی بھی صحرا کی ویرانی سے کسی طرح کم نہیں لیکن صحرا میں جو آسودگی نصیب ہے وہ گھر میں کہاں! وسعت کی وجہ سے دشت کی ویرانی وحشت کی پرورش کے لئے زیادہ سازگار ہے ؎

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم		دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

کم وبیش یہی مضمون اس شعر میں بھی بیان کیا ہے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب نے صرف اپنے گھر اور دشت کا ہی مقابلہ نہیں کیا بلکہ محبوب کے گھر اور بہشت کا بھی اپنے خاص انداز میں مقابلہ کیا ہے اور اس ضمن میں بھی ترجیح و انتخاب کا حق ادا کیا ہے۔ شعر ہے ؎

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

دوسری جگہ اسی مضمون میں عجیب ندرت پیدا کی ہے۔ عام طور پر ہمارے شاعر محبوب کے کوچے کو بہشت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن غالب نے بہشت کو کوچۂ یار سے تشبیہ دی ہے اور اس طرح مشبہ بہ کو مشبہ قرار دیا ہے۔ محبوب کا کوچہ بہشت سے اس واسطے قابل ترجیح ہے کہ یہاں عاشقوں کے جھگھٹے کی وجہ سے ہر وقت رونق رہتی ہے۔ برخلاف اس کے بہشت آباد نظر نہیں آتی مقابلہ اور وجہ ترجیح نے شعر کی ایمائی تاثیر کو کس قدر بڑھا دیا۔ پھر طرز ادا کی طرفگی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ شعر ہے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

غالب کی ایک پوری غزل مقابلوں سے پُر ہے۔ جن سے معانی کی مناسبتیں بڑی خوبی سے واضح ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ رمزی اور ایمائی اثر کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ غزل کی ردیف آزمائش رکھی ہے۔ آزمائش میں ایک طرح کا معنوی مقابلہ تو خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز یا کسی شخص کی آزمائش کرتے ہیں؛ تو کوئی معیار ضرور سامنے رہتا ہے جس سے مقابلہ مقصود ہوتا ہے۔ قیس و فرہاد سے اپنا مقابلہ کس بلند آہنگی سے کیا ہے ؎

قدِ و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے　　　جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس و کوہکن کو قد و گیسوئے یار سے واسطہ پڑا اور ہم جس محفل میں ہیں، وہاں قد و گیسو کے امتیازات کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں دار و رسن سے کم پر آزمائش ممکن نہیں۔ پھر فرہاد کے حوصلے اور اس کے نیروئے تن کا مقابلہ کیا ہے ؎

کریں گے کوہکن کے عشق کا ہم امتحاں آخر
ابھی اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

یعنی نیروئے تن کی آزمائش میں تو اس کی کامیابی غیر مشتبہ ہے۔ اس لئے کہ اس نے جوئے شیر کھود ڈالی لیکن حوصلے کے امتحان میں وہ پورا نہ اترا اور شیریں کے مرنے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔

دوسری جگہ مرزا نے فرہاد پر چوٹ کی ہے کہ تیشہ مار کر مر جانا معمولی بات ہے۔ اس کو چاہئے تھا کہ عام رسم کے خلاف شیریں کے مر جانے کی خبر سن کر زندہ رہتا اور جب تک زندہ رہتا اسی وقت تک شیریں کے تصور کو اپنا سرمایۂ غم بناتا ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

پھر فرہاد کو طعنہ دیا ہے کہ اس نے رقیب کے لئے عشرت کدہ تعمیر کیا اور خود سر پھوڑ کر مر گیا۔ ہم اس کی نکونامی کے قائل نہیں ؎

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں

آزمائش والی غزل کے چند اور شعر ملاحظہ طلب ہیں ؎

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی　　　اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیم مصر اور یوسف کی بوئے پیرہن کا اس طرح پر ذکر کیا ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے سے الگ آمنے سامنے موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نسیم مصر کو پیر کنعاں سے

بھلا ہمدردی کیوں ہونے لگی؛ یہ تو محض ضمنی طور پر تھا کہ انہیں یوسف کی بوئے پیراہن پہنچ گئی۔ حقیقت میں نسیم مصر تو یوسف کی بوئے پیراہن کی آزمائش کرنا چاہتی تھی کہ اس کے تصرفات کی حد کہاں تک ہے

ایک طرف محبوب کی آمد ہے اور دوسری طرف اہل انجمن کے صبر و شکیب کی آزمائش۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شاعر نے صبر و شکیب کو آزمائش اور مقابلے کی خاطر اشخاص کی صورت دے دی ہے کہ دیکھیں ان پر کیا گزرتی ہے ؎

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبر اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

دل وابستہ کو محبوب کی زلف پُرشکن سے اس طرح دست و گریباں کیا ہے ؎

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بے تابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

مقطع میں ایک تو استفہام انکاری کی خوبی ہے اور دوسرے معشوق کی آمد اور چرخ کہن کے نئے فتنوں کا مقابلہ ہے ؎

وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے یعنی ہرگز نہ آئیں گے۔ وہ ایسے وعدے تو ہمیشہ کرتے رہتے ہیں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ محض ان کے وعدے کی وجہ سے ہم پر اور کون کون

۱؎ اسی مضمون کا مرزا کا دوسرا شعر بھی ہے ؎

تھا گریزاں نگہِ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ بلا کس قدر آساں سمجھا

سی نئی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک طرف اُن کے آنے کا وعدہ ہے —— اور دوسری طرف چرخِ کہن کے نئے نئے فتنوں کی آزمائش۔ استفہام انکاری اور تقابلہ دونوں کے باعث شعر کی ندرت اور حسن ادا کی خوبی نمایاں ہوگئی۔

اس قسم کے مقابلوں کی غالب کے یہاں بیسیوں مثالیں موجود ہیں اور محاسن کلام میں داخل ہیں۔ ایک جگہ فارسی میں اسی ضمن میں عجیب و غریب خیال ادا کیا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ نہ فارسی میں اور نہ اردو میں۔ مضمون یہ باندھا ہے کہ دعویٰ گہ رضا میں ہر شخص اپنے مقصود و منتہا کی جانب رواں دواں چلا جا رہا ہے گویا کہ اس منزل میں رشک وفا کا منظر آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ باپ اور بیٹا راہِ شوق میں مسابقت کے لئے کوشاں ہیں۔ اگر باپ آتش نمرود کی آزمائش میں اپنے آپ کو ڈالتا ہے تو بیٹا بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ وہ باپ کی چھری کے تلے اپنا گلا رکھ دیتا ہے۔ شاعر دو شعروں میں جو تمثیل کے رنگ میں ہیں رمز و ایما، بلاغت و ایجاز اور حسن ادا کا کمال دکھا دیتا ہے۔ شعر یہ ہیں ؎

رشک وفا نگر کہ بہ دعویٰ گہ رضا — ہر کس چہ گونہ در پئے مقصود میرود
فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو — گر خود پدر در آتش نمرود میرود

ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں نہ جلنے کی تلمیح پیش کرتے ہوئے اُن سے اپنا مقابلہ کیا ہے کہ ان کا تو یہ معجزہ تھا کہ وہ آگ میں نہ جلے لیکن میرا معجزہ یہ ہے کہ میں بغیر شعلہ و شرر کے جل رہا ہوں ؎

شنیدہ کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم — ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

شاعر نے یہ بات غیر مذکور رکھی ہے کہ آیا حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں نہ جلنا بڑا معجزہ تھا یا میرا بغیر آگ کے جلنا۔ اس تقابل کے علاوہ "شنیدہ" اور "بہ بیں"

کے لفظی تقابل نے بھی شعر میں لطف پیدا کر دیا۔

غالبؔ کے یہاں تقابل کی صنعت کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا راہگذر یاد آیا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور بازار سے لے آئیں گے گر ٹوٹ گیا　　جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام　　گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال　　یاں ہجومِ اشک سے یاں تارِ نگہ نایاب تھا
یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو　　واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

داغؔ نے ایک جگہ جفا اور وفا کی کیفیتوں کو محسوسات کا جامہ پہنایا ہے اور لفظوں کی تکرار اور اثبات و انکار سے مقابلہ کا پہلو نکالا ہے جس پر ذوق وجد کرتا ہے ؎

اک جفا تیری کہ کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے
اک وفا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

ایک جگہ مضمون باندھا ہے کہ محبوب اپنے رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر یہ آزمائش کرتا ہے کہ دیکھیں پروانہ اس کی طرف آتا ہے یا شمع کی طرف جاتا ہے تمثیل و کنایہ کا یہ انداز لاجواب ہے۔ اگرچہ محبوب کے رُخِ روشن اور شمع کا مقابلہ

مقصود ہے لیکن اسے صاف صاف کہنے کے بجائے رمزی اثر پیدا کیا ہے جو نقل قول کی بدولت اور زیادہ نمایاں ہوگیا۔ شعر ہے ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے"

بقول حالی ایک صحبت میں مرزا غالب نے داغ کا یہ شعر سنا تو پھڑک گئے۔ اس کو بار بار پڑھتے تھے اور وجد کرتے تھے (یادگارِ غالب صفحہ ۷۹)۔ داغ کا یہ شعر اُن چند شعروں میں سے ہے، جن کی تعریف غالب نے کی ہے۔ اس سے بڑھ کر اُس کی خوبی کی سند اور کیا ہو سکتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو مقابلے کی صنعت بھی استعارے کی ایک شان ہے۔ اگرچہ بظاہر اس میں مشابہت کی جگہ تضاد ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ شاعر معانی کی نزاکتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے جمالیاتی تخلیق میں مدد ملتی ہے۔ اور کلام کی یکسانیت اور سپاٹ پن دُور ہو جاتا ہے۔ جن سے جمالیاتی مسرت کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ اس کی بدولت ایسے خیالی اور جذباتی تلازمات جو ایک دوسرے سے دُور تھے نزدیک آجاتے ہیں اور اس طرح آرٹ کی ایچ اُبھرتی اور مسرت کا موجب بنتی ہے۔ مقابلے سے تخیل اور جذبے کے اس الجھاؤ کو دور کیا جاتا ہے جس سے شاعر کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔

اُردو کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی تمثیل اور استعارے کے انداز میں تصورات کے مقابلے کی مثالیں ملتی ہیں جن سے حسنِ کلام کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

داغ نے محبوب کے چلنے اور ٹھہر جانے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ آپ خود دونوں حالتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں اسلوب بیان کی

بڑی لطافت پنہاں ہے کہ خود مقابلہ کرنے کے بجائے آپ کے ذوق پر اس کو چھوڑ دیا۔ شعر ہے ؎

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا (داغ)

دوسری جگہ محشر کا مقابلہ محبوب کی ٹھوکر کے فتنہ سے کیا ہے ؎

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں (داغ)

روزِ جزا اور شبِ ہجراں کا مقابلہ ملاحظہ ہو ؎

آتا جو یہاں روزِ جزا اے شبِ ہجراں
بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا (داغ)

رسا نے محبوب کی گلی کے فتنوں کا قیامت سے اس طرح مقابلہ کیا ہے ؎

آئے اگر قیامت تو دھجیاں اڑا دیں پھرتے ہیں جستجو میں فتنے تری گلی کے

فانی نے قیامت کا مقابلہ معشوق کی جوانی سے کیا ہے۔ مشبہ بہ کو مشبہ قرار دے کر رمز آفرینی کا حق ادا کیا ہے۔ شعر ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک

ایک جگہ محبوب کی رعنائی اور اپنی نگاہ کی شوخی کا اس طرح مقابلہ کیا ہے ؎

نگاہِ شوق کی رعنائیوں کا کیا کہنا مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہیں

جگر نے عاشق کے دل کا مقابلہ محبوب کے جلوؤں سے کیا ہے ؎

ترے جلوؤں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

گنہ گاری اور رحمتِ خداوندی

ہمارے غزل گو شاعروں نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور رحمتِ خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے اور اس طرح حسنِ ادا کا ایک خاص پہلو نکالا ہے۔ گویا کہ یہ دو تصورات ہیں جو محفلِ خیال میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی ضمن میں زہد کی برائی اور رندی اور شراب و میکدے کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ سب موضوع ایسے ہیں جو غزل کی ساخت میں نہایت خوبی سے کھپتے ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ رمز و ایماء کی تیکنیک کو ان سے خاص مناسبت ہے اور دوسرے اس لیے کہ غزل گو شاعر کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے مملو ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچی عرفان شناسی، مذہبی حد بندیوں سے بالاتر ہے عارف کو ہر کہیں ذاتِ بے ہمتا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سب کو اسی کی تلاش ہے اور سب اسی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔ ممکن ہے رفتار میں فرق ہو اور راستے بظاہر الگ الگ ہوں۔ بقول حافظ ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر کا مزاج اور افتادِ طبع ادعا پسندی کی کبھی حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علمبردار زندگی کے پیچیدہ حقائق کو من مانے طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطۂ نظر سے انہیں سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نقطۂ نظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے سوائے احتسابِ نفس کے۔ کٹرپن اور ادعا پسندی کے جلو میں تعصب اور تنگ نظری کا قافلہ چلتا ہے جو ہر اس تصور کو اپنے پاؤں تلے روندتا جاتا ہے جس میں رواداری

اور انسانی محبت کی بو ہو۔ یہ ادعا پسندی ایک زمانے میں مذہبی رنگ لئے ہوئے تھی۔ اسی لئے ہمارے شاعروں نے زاہد پر چوٹیں کیں اور اس کی چوریاں ایک ایک کر کے دکھائیں۔ اور تجریدی یا مذہبی اصول سے زیادہ محبت اور انسانیت کو اہمیت دی۔ انہوں نے ہمارے ادب میں کم و بیش وہی کام کیا جو مغربی ادب کی تاریخ میں ہیومن ازم کی تحریک نے انجام دیا تھا۔ اس تحریک نے رواداری، وسیع مشربی اور توازن خیال کی روایات قائم کیں جن سے اہل مغرب کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ ادعا پسندی اپنے رنگ ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کا رنگ مذہبی تھا اور آج سیاسی ہے۔ غزل گو شاعروں کے اشاروں کا دونوں پر اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

گناہ کے تصور کا تعلق جبر و اختیار کے اصول سے ہے۔ جو نہ صرف علم کلام کا معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے بلکہ قدیم اور جدید ادب عالیہ میں کسی نہ کسی شکل میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہر ٹریجڈی میں جبر و اختیار اور خیر و شر کی کشمکش ضروری ہے۔ غزل گو شاعر کو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانی آزادی محدود اور مشروط ہے۔ انسان کو بعض دفعہ خود اپنی فطرت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس کے تحت شعور کی قوتیں رسمی اخلاق کی بندھنوں کو ایک جھٹکے میں توڑ پھینکتی ہیں اور وہ ان سب باتوں کو کر گزرتا ہے جو بظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ارادے کی آزادی کدھر گئی؟ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو ورثے میں خاص قسم کا مزاج ملتا ہے جو اس کی زندگی پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر اس کی قوت ارادی نہ ہوتی تب بھی وہی نتائج پیدا ہوتے جو ارادہ رکھنے کے باوجود وقوع پذیر ہوئے۔ خود ارادہ ان صلاحیتوں اور رجحانوں کا ممد و معاون بن جاتا ہے جو پہلے سے مقرر تھے اور جن کی

وجہ سے وہ کشاں کشاں گناہ اور شر کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ گناہ سے انسان متاسف اور پشیمان اس لئے ہوتا ہے کہ اس کا اندرونی اخلاقی احساس اس کو بتاتا ہے کہ تیرے ارادے میں آزادی کی صفت موجود تھی۔ لیکن پھر بھی تو نے اس کی روشنی میں قدم نہیں اٹھایا۔ اگر یہ تاسف کا احساس نہ ہو تو زندگی اپنی تکمیل کی کوشش نہ کر سکے۔ غزل گو شاعر گناہ گار سے ہمدردی ضرور رکھتا ہے لیکن خود گناہ یا شر کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن کبھی حافظؔ کی طرح جب وہ شوخ نگاری پر آتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے ؎

گناہ اگرچہ نبود در اختیار ما حافظؔ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہِ من است

اور کبھی غالبؔ کی طرح اپنی مجبوری کو ظاہر کرتا ہے کہ جب کسی کے مقدر ہی میں رہ ورسم ثواب نہ ہو تو بھلا وہ اس طرف کیسے مائل ہو سکتا ہے۔ شعر ہے ؎

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

انسانی زندگی میں دو بنیادی گناہ ہیں جن سے دوسرے گناہ پیدا ہوتے ہیں ایک غرور اور دوسرے جنسی ہوس۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون سا بڑا اور اپنے اثرات کے لحاظ سے زیادہ مہلک ہے۔ ہمارے غزل گو شاعروں نے من مانے طور پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور اتفاق یہ ہے کہ جدید نفسیاتی تحقیق انہی کی تائید میں ہے۔ گناہ کی جڑ یہ ہے کہ انسان محدود اور عارضی مقاصد کو غیر محدود اور ابدی اقدار تصور کرنے لگے۔ غرور انتہائی خود غرضی کو ظاہر کرتا ہے۔ غرور کرنے والا اپنی ذات کو کائنات کا مرکز اور محور تصور کرتا ہے۔ اور دوسروں کو اپنی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ ملک اور دین دونوں غرور کے اظہار کے لئے سازگار فضا پیدا

کرتے ہیں اور اقتدار کی ہوس چاہے وہ دنیاوی ہو یا دینی نفسیاتی طور پر ایک ہی محرک کا نتیجہ ہے۔ غرور اپنی بے توفیقی اور ناہمواری کو ریاکاری کے پردے میں چھپاتا ہے اور وہ اس طرح مزید نفسی الجھاؤ کا موجب بنتا ہے۔ غرور کرنے والا اپنے نفس سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کو کافی بالذات بنانا چاہتا ہے جو زندگی میں ممکن نہیں وہ اپنے وجود کے تابع اور محدود اور مشروط ہونے کو چھپانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کو غیر محدود اور اٹل تصور کرتا ہے اور اُسے خوف ہوتا ہے تو یہ کہ کہیں اپنی خواہشوں کو پورا نہ کر پائے۔ یہ تشویش اور خوف گناہ کا سبب بنتا ہے۔

جنسی ہوس پرستی رُوح کی نراجیت اور انتشار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ کہنا ایک حد تک درست ہے کہ معاشری رکاوٹوں اور قیدوں کی وجہ سے جنسی شدت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ چونکہ پہلے سے جنسی جذبے میں انتہائی شدت پائی جاتی تھی۔ اسی واسطے معاشری قیود لگائی گئیں تاکہ اس کی نراجیت کی روک تھام ہو سکے۔ غرضکہ یہ ایک چکر ہے جس کے دونوں پہلو ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں جنسی طلب کے جذبے کی شروع ہی سے محض جسمانی اور مادی نوعیت نہیں تھی بلکہ دوسرے ہیجانوں کی طرح وہ بھی انسانی خودی کی آزادی سے ہم آمیز تھا۔ جنسی طلب کو روکنے میں اس لئے دشواری ہوتی ہے کہ اس میں انسانی آزادی اور اختیار کو عملی صورت اختیار کرنے کا نہایت مؤثر موقع ملتا ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جنسی جذبہ خودی سے ماوراء جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح فطرت یہ اہتمام کرتی ہے کہ خودی اپنے کو کافی بالذات نہ سمجھے بلکہ نوع کی بقا کا سامان مہیا کرے۔ اسی واسطے فطرت نے اس میں لذت کا عنصر شامل کر دیا، جو ایک طرح کی ترغیب اور لبھاؤ ہے۔ جنسی جذبے میں خودی اور غیر خود دونوں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس طرح فطرت نے ایک تیر میں دو نشانے

اڑا دیئے۔ ایک طرف تو خودی کے ادعا اور تصرف کی تکمیل ہو گئی۔ اور دوسری طرف انتہائی بے خودی کا عالم پیدا کر دیا۔ جگرؔ نے اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خودی اور غیر خود کس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ شعر ہے ؂

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

جنسی جذبہ زندگی کا عجیب و غریب ڈراما ہے۔ اس میں متضاد کیفیتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف تو خودی کا ادعا اپنی تصرف کی خواہش پر نیازمندی کا غازہ چڑھاتا ہے اور دوسری طرف ایثار اور تحمل اور انفعال ناز و تمکنت کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ہوس کی یہ بھی ایک توجیہ ہے کہ جنسی ہیجان کا اضطراب اور بیتابی ذہنی انتشار کا موجب بنتی ہے اور خودی اس انتشار کی حالت میں اپنے آپ سے گریز کی کوشش کرتی ہے تاکہ فریب نظر کی کیفیت پیدا ہو۔ اپنی ذات میں تسکین نہ ملنے پر خودی دوسرے کی شخصیت سے وابستہ ہونا چاہتی ہے جو دلفریب خواہشوں کا مرقع بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اندرونی اضطراب و خلش کو بھولنے کے لئے جنسی فعل کے ذریعے بے خودی چاہتی ہے۔ ہوسناکی میں خودی اپنے آپ کو کائنات کا مرکز اور محور نہیں سمجھتی بلکہ غیر خود کو جس سے ہوس کی تسکین ہوتی ہے۔ میخواری اور رندی کی نفسیاتی کیفیت کے ڈانڈے بھی جنسی جذبے سے ملتے ہیں۔ مے خوار بھی اپنے آپ کو فریب اور خود فراموشی میں مبتلا کرتا ہے تاکہ شعور کی کشاکش سے گریز ممکن ہو۔ غالبؔ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؂

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

جنسی فعل میں، خودی کو اپنی نیستی اور صرف جذبے کی ہستی کا شعور باقی رہتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خودی ایک زبردست موج کی قوت اور کشاکش سے وابستہ ہو گئی جو اس کو اوپر کی طرف اٹھائے لئے جاتی ہے اور پھر نیچے لاکر ٹپک دیتی ہے۔ یہ خود فراموشی اور بے خودی کی معراج ہے کہ انسان اپنی ذات کو اس موج کے اٹھان میں خس کے تنکے کی طرح ڈال دے کہ وہ جدھر چاہے اٹھاکر اسے پھینک دے اور جدھر چاہے بہالے جائے۔ اسی لئے تو غالب کے شاعرانہ وجدان نے وصل کی کیفیت کو موج کے لطیف استعارے میں پیش کیا ہے ؎

گر تزے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

انسان گناہ کرنے کی آزادی رکھتا ہے لیکن اس علم کی بھی آزادی رکھتا ہے کہ اُس نے گناہ کیا ہے۔ حضرت آدمؑ نے اپنی شعوری زندگی میں جو پہلا کام کیا وہ گناہ تھا۔ چنانچہ گناہ انسانی تاریخ کا ایک علامتی رمز (سمبل) ہے۔ انسان کی مکمل بےگناہی اور ارتقا تاریخ کے دائرے سے باہر ہے لیکن تاریخ کے دائرے سے باہر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ حق بجانب ہے۔ گناہ گار کے ضمیر میں اکثر اوقات ایک خاص قسم کی رقت اور اخلاص کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو اپنی پشیمانی کو رحمت کے روبرو بطور نذرانہ پیش کرتی ہے۔ گناہ گار کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ زاہد کا غرور اسے ٹھوکریں کھلوائے گا، اور اس کا انفعال اس کی دار السلام تک رہبری کرجائے گا یہ یقین تغزل میں ایک محرک کا کام دیتا ہے جس کو ہمارے شاعروں نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ　　　رند از رہ نیاز بہ دار السلام رفت

ہمارے شاعروں نے عالم گناہ میں رحمتِ خداوندی کا دامن کبھی اپنے ہاتھ

سے نہیں چھوڑتا۔ گناہ کا احساس انسانی نفس کے تزکیہ کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے اور دل کی پاکیزگی اشک ندامت سے جلا پاتی ہے۔ ہر گناہ اپنے جلو میں درد و غم کی پرچھائیاں چھوڑ جاتا ہے۔ جو غزل گو شاعر کے دل کو عزیز ہوتی ہیں۔ اس لذتِ الم کے باعث اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اُس کے گناہ اس کی ذاتی ملکیت ہیں جنہیں کوئی بھی اُس سے نہیں چھین سکتا۔ وہ ان کی یاد کو سینت سینت کر رکھتا ہے کہ اس کے لئے یہی حاصلِ حیات ہے۔ وہ اس یاد کی بنیاد پر محبت کی عمارت بناتا ہے۔ عالمِ گناہ میں بھی ہمارے شاعر کو امید اور رحمت کی تجلّیاں دُور سے نظر آتی ہیں ؎

تر ے کرم سے کیا سماں ہے عالمِ گناہ کا
سیاہیاں امید کی تجلّیاں لئے ہوئے (فانیؔ)

عالمِ گناہ اور اس کے مقابل رحمتِ خداوندی کے ضمن میں نہایت لطیف شاعرانہ نکات و معانی ہمارے غزل گو شاعروں نے پیدا کئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہوئے ۔۔۔ در کارواں گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں
(میرؔ)

نہ یک شیخ اتنا بھی واہی تباہی ۔۔۔ کہاں رحمتِ حق کہاں بے گناہی[1]
(میرؔ)

رحمت اگر یقینی ہے تو کیا ہے زہدِ شیخ ۔۔۔ اے بے وقوف جائے عبادت گناہ کر
(میرؔ)

---

[1] حافظ کا شعر ہے ؎

بیار بادہ بخور زاں کہ پیرِ میکدہ دوش ۔۔۔ بسے حدیثِ عفو و رحیم و کریم گفت

ہمارا جُرم تو بچا ہا تری کریمی نے　　ابھی کے واسطے بخشش ہے جو گناہ کرے

(اقبال)

ہے حشر تو اک شانِ کریمی کا کرشمہ　　بخشے گا وہ کس کو جو گنہ گار نہ ہونگے

(مہیم)

رحمتِ حق ہے سبب میری گنہ گاری کا　　ابر کرتا ہے اشارہ مجھے مے خواری کا

(ناسخ)

مری نجات کچھ ان واعظوں کے ہاتھ نہیں　　بڑا کریم ہے جس کا گناہ گار ہوں میں

(صبا)

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت　　کریم تو ہی بتا دے حساب کرکے مجھے

(انیس)

مظہرِ شانِ کریمی ہیں یہ بندے یارب　　ہے سرِ عفو پہ احسان گنہ گاروں کا

(راسخ)

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے　　گناہ گار یہ کہہ دے گنہ گار ہوں میں

(امیر مینائی)

کرے غرور نہ طاعت پہ کچھ وزاہد سے　　"مرے کریم کو عذرِ گنہ پسند ہوا"

(وزیر لکھنوی)

بے کس رہیں گے حشر میں کب مجرمانِ عشق　　رحمت کہے گی "ہم ہیں گنہ گار کی طرف"

(داغ)

اس شانِ رحیمی نے بہت شور دکھایا　　جس وقت جھکی چشمِ گنہگار ذرا سی

(داغ)

صبر اے زاہدِ نافہم نہ مے خواروں کا　　بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہ گاروں کا

(داغ)

کہتا ہوں گنہ کر کے میں ناکردہ گناہ ہوں
اے شانِ کریمی عجب اسلوب ہے میرا

(جلالؔ)

بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر
"جرم اس نے کئے ہیں مجھے غفار سمجھ کر"

(امیرؔ)

اسی بہانے سے پوچھا تو جاؤں گا اے برقؔ
ہزار شکر کہ بندہ گنہ گار رہا

(برقؔ)

مائلؔ کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا
کام آپڑا ہے رحمتِ پروردگار سے

(مائلؔ)

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

(اقبالؔ)

کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معلوم
رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوئی

(اصغرؔ)

رحمتِ حق نے بہت دیکھ لی ایماں کی بہار
اب ذرا سامنے رعنائیٔ عصیاں کردیں

(اصغرؔ)

دی ابرِ کرم نے ترے دامن کی ہوائیں
جب غرقِ عرق اپنے گنہ گار کو دیکھا

(عزیزؔ لکھنوی)

مری ہر معصیت ہے مطلعِ انوارِ صد رحمت
فضائے دل گناہوں سے منوّر ہوتی جاتی ہے

(فانیؔ)

امیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے
شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

(فانیؔ)

یہ کیا جانے زاہد کہ اے ابرِ رحمت
مرے جام تیرے کھنگالے ہوئے ہیں

(حسرتؔ)

نہ ہوا اس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہ گاری　　نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری

(حسرتؔ)

غرقِ رحمت ہو کے دیکھا جوشِ دریائے کرم　　عفو نے وصبہ نہ چھوڑا دامنِ تقصیر میں

(ثاقبؔ لکھنوی)

مجھ سے گنہ گار پہ یہ بارشِ کرم　　منہ دیکھتا ہوں رحمتِ پروردگار کا

(جگرؔ)

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ　　کیا منہ دکھاؤں رحمتِ پروردگار کو

(جگرؔ)

مبارک ہو مبارک ساحلِ رحمت پہ دم لینا　　قدم مارا تو ڈر کیا پیر جا دریائے عصیاں کو

(یگانہؔ)

کرم پہ تیرے نظر کی تو ڈھے گیا وہ غرور　　بڑا اٹھا ناز کہ حد کا گنہگار رہوا، ہیں

(آرزوؔ لکھنوی)

بعض شاعروں نے لطف گناہ کو بڑھا چڑھا کر عینی یا مثالی شکل میں پیش کیا ہے
کبھی گناہ کی یاد دل میں ایسی چٹکیاں لیتی ہے کہ سزا کے خوف کے بجائے شاعر حشر
میں بھی، اسے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتا ہے ؎

سب اہلِ حشر جب اپنے کئے کو پائینگے　　بڑا مزا ہو جو مجھ کو مرا گناہ ملے

(داغؔ)

جگرؔ کا شعر ہے ؎

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت　　پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو

غالبؔ نے گناہ کے مضمون میں بھی اپنی شوخی کی الگ راہ نکالی ہے۔ وہ
باری تعالیٰ سے ناکردہ گناہوں کی داد چاہتا ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالبؔ کے نزدیک گناہ اور قصور سے جھجکنا اور اس پر پشیمان ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لئے کہ رحمتِ خداوندی خود اس کی اجازت دیتی ہے شعر ہے ؎

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں!

گناہ کرنے میں اپنے حوصلے کی وسعت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہتا ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی تنک آبی سے خشک ہو گیا لیکن میرے دامن کا سرا بھی تر نہ ہونے پایا ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

دوسری جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں اک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

ایک جگہ غالبؔ ذاتِ باری سے پوچھتا ہے کہ تیری رحمت کس پردے میں بیٹھ کر آرائش میں مصروف ہے۔ ذرا وہ سامنے تو آئے۔ وہ خود ہماری مجبوریوں کی عذر خواہی کرے گی۔ ہمیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ؎

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

غالبؔ نے رحمت کے عذر خواہی کے مضمون کو فارسی میں بھی اپنے انوکھے انداز میں ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رحمت کی اس ادا پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ بہار کا رنگین لباس زیبِ تن کر کے رندوں کی طرف سے عذر خواہی پیش

کرتی اور ان کی رندمشربی کو حق بجانب ٹھہراتی ہے۔ شاعر نے اپنا مطلب لطیف کنائے سے ادا کر دیا کہ بہار کا اقتضا ہی یہ تھا کہ مے نوشی کی جاتی۔ شعر ہے ؎

فدائے شیوۂ رحمت کہ در لباسِ بہار	بہ عذر خواہی رندانِ بادہ نوش آمد

ایک جگہ عذرِ گناہ اس خوبی سے کیا ہے کہ گناہ کی ذمہ داری خود اس پر نہیں بلکہ خالقِ حیات، پر پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تماشائے گلشن کا یہ لازمی اقتضا ہے کہ دل میں تمنائے چیدن پیدا ہو۔ اب اگر تمنائے چیدن گناہ ہے تو اے بہار کے پیدا کرنے والے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں ؎

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم	(نسخۂ حمیدیہ)

مسجد و بت خانہ یا کعبہ و میکدے کی رمزی علامات بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں کہ زہد و گناہ کے تصوّرات ان کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ مسجد و بت خانے سے مسجد و بت خانہ مراد نہیں اور نہ کعبہ و میکدے سے کعبہ و میکدہ مراد ہیں۔ یہ لفظ رمزی اور ایمائی اغراض کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے غزل گو شاعروں نے اپنے قلب و نظر کی وسعت کے اظہار کے لئے ان لفظوں کو شعری علامتوں کے طور پر برتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی

میر صاحب کا شعر ہے ؎

لبریز جس کے حسن سے مسجد ہے اور دیر	ایسا بتوں کے بیچ وہ اللہ کون ہے

غالب نے دیر و حرم کو واماندگی شوق کی منزلیں قرار دیا ہے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا	واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

دوسری جگہ اہلِ کنشت کو یقین دلایا ہے کہ اگر میں کعبے میں رہنے لگا ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنے پرانے رفیقوں یعنی اہلِ کنشت کے حقِ صحبت

کو بھول گیا۔ استفہام انکاری سے شعر کی خوبی دوبالا ہو گئی ؎

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہلِ کنشت کو

داغ نے زاہد کو اس طرح طعنہ دیا ہے ؎

چلا ہے کعبے کو تو خاک چھاننے زاہد   فقط خدا ہی خدا ہے حرم میں خاک نہیں

داغ نے ایک اور جگہ خرابات اور مسجد کا مقابلہ کیا ہے لیکن لطف یہ ہے کہ مسجد کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اسے سامع کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ غیر مذکور کے خلا کو پر کرے۔ شعر ہے ؎

ابرِ رحمت ہی برستا نظر آیا زاہد   خاک اڑتی ہوئی دیکھی نہ خراباتوں میں

پھر کعبے جانے کے لئے زاہد کی اس طرح سے رہبری کی ہے ؎

کعبے جانا بھی تو بت خانے سے ہو کر زاہد
دور اس راہ سے اللہ کا گھر کچھ بھی نہیں

کبھی کعبے کی راہ اس لئے مجبوراً اختیار کی جاتی ہے کہ دیر کی راہ نہ مل سکی ؎

دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی
کفر جب کفر نہ بنتا ہو تو ایماں کر دیں   (اصغر)

اگر تقویٰ کی طرف طبیعت مائل نہیں، تو پھر رندی ہی سہی ؎

دل گذرگاہِ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزل تقوےٰ نہ ہوا   (غالب)

عشق اور تقویٰ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں خصوصاً تقویٰ کا جو عمرانی پہلو ہے اس سے عشق کی اکثر جنگ ہو جاتی ہے۔ سعدی کا شعر ہے

ہر کجا سلطانِ عشق آمد نماند   قوتِ بازوئے تقویٰ را محل

میر صاحب نے ایک موقعے پر اہل مسجد کی غلط فہمی بڑے لطف سے رفع کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں دیدہ و دانستہ مسجد میں آیا ہوں بلکہ جا کہیں اور رہا تھا بہک کر مسجد میں پہنچ گیا۔ کہتے ہیں ؂

مستی میں لغزش ہو گئی معذور رکھا چاہیئے
اے اہل مسجد اس طرف آیا ہوں میں بہکا ہوا

چونکہ مے خانہ بند تھا اس لئے بمجبوری مسجد میں رات گزاری جاتی ہے ؂

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی مسجد میں جا پڑیں گے جو مے خانہ بند ہے

اسی مضمون کا رسا کا بھی شعر ہے ؂

جب دیر میں یہ دیکھا کہ اپنا گزر نہیں
کعبے کے جانے والوں میں مجبور جا ملے

محفل وعظ اور میخانے کی صحبت کا مقابلہ کیا ہے ؂

محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں (مائل)

بعض اوقات کعبے سے اکتا کر بت خانے کی طرف قدم اٹھنے لگتے ہیں۔ مومن کا شعر ہے ؂

کعبے سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

خواجہ میر درد نے جو اپنے زمانے کے بڑے صاحب باطن گزرے ہیں، طریق زہد کا پول اس طرح کھولا ہے ؂

لہ اسی مضمون کا سودا کا شعر ہے ؂

کعبے کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچوں گا مستی میں مجھے بھولی جس دن رہ میخانہ

غیر از ملال زاہدا کیا ہے طریقِ زہد میں
دل ہو شگفتہ جس جگہ کو چہ مے فروش ہے

غالب نے بھی زاہد پر چوٹیں کی ہیں۔ اس کو زاہد سے یہ شکایت ہے کہ وہ نیکی نیکی کی خاطر نہیں بلکہ صلے کی توقع میں کرتا ہے۔ عبادات و اعمال کا محرک دنیا کی فلاح یا اخروی نجات نہ ہونا چاہیئے بلکہ رضائے الٰہی۔ اجر کی طمع خلوص کے منافی ہے ؎

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　　پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

دوسری جگہ اسی مضمون کو اور زیادہ شوخی سے ادا کیا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ایک موقعے پر کہا ہے کہ جس باغِ رضواں کی تعریف میں زاہد کی رال ٹپکی پڑتی ہے اسے ہم مدتوں سے بھلا بیٹھے ہیں اور اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ اس کا خیال بھی دل میں لائیں ؎ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

چونکہ حور کی طمع زاہد کی عبادت کی محرک بنی ہے، اس لیے کیا لطف ہو اگر وہ جنت میں نہ جانے پائے اور اس کے ارمان دل ہی دل میں رہیں ؎

حور کے واسطے زاہد نے عبادت کی ہے
سیر تو جب ہے کہ جنت میں نہ جانے پائے　　　(داغ)

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے ؎

کیا فرض ہے ملے تو یہ زاہد ہی کو ملے
خواہانِ حورِ خلدِ بریں اور بھی تو ہیں　　　(داغ)

کبھی غزل گو شاعر اپنی رندی کو زاہد اور واعظ کی ریاکاری کے مقابل لے آتا ہے اس مقابلے سے دونوں کیریکٹر بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ زاہد جو حسن و عشق کے مزے سے ناآشنا اور مشاہدہ فطرت کے کیف سے یکسر بیگانہ ہے اپنے آپ کو وہ ظاہر کرتا ہے جو وہ حقیقت میں نہیں ہے۔ سوز و ساز حقیقت سے محروم ہونے کے باعث وہ اپنے عمل میں کبھی حقیقی ہم آہنگی نہیں قائم کر سکتا۔ محض عبادت روحانی تسکین کے لئے کافی نہیں، جب تک کہ عقیدت، محبت اور سچے عمل کی تڑپ دل میں پیدا نہ ہو۔ زندگی کو محدود نقطۂ خیال سے دیکھنے کے باعث زاہد کی روح نامکمل اور اس کی نظر تاریک رہتی ہے۔ اور وہ اپنے نفس کی توسیع اور تہذیب پوری طرح نہیں کر سکتا۔ اس کی بے توفیقیاں ریاکاری کے دامن میں پناہ لیتی ہیں۔ دنیا کی لذتیں اُس کے دل میں چھپ چھپ کر چٹکیاں لیتی اور معاصی کی لطافتیں اس کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ وہ بھی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن وہ اس پر اپنے زہد و اتقاد کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ سیرت کی اس ناہمواری کو حافظ نے یوں ظاہر کیا ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پُرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کم تر می کنند

اسی لئے اُس نے زاہد کے قول و فعل سے پناہ مانگی ہے ؎

از قولِ زاہد کردیم توبہ و ز فعل عابد استغفر اللہ

اور اگر کبھی زہد کسی نوجوان سے سرزد ہو تو غالب اس کو کبھی معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اُن کے نزدیک شباب اور زہد ایک دوسرے کی ضد ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہیں ہونے چاہئیں اور اگر ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر ہستی کی ناقدردانی

ممکن نہیں ۔ شعر ہے ؎

شباب و زہد چہ نا قدر دانیٔ ہستی است
بلا بجان جوانان پارسا ریزد

غالب نے ایک جگہ واعظ پر کیا خوب پھبتی کسی ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ میں حسب عادت مے خانے کے دروازے سے نکل رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرتِ واعظ وہاں داخل ہو رہے ہیں ۔ کسی کے کہنے پر یقین نہ آتا لیکن جب خود اپنی آنکھوں دیکھی بات ہو تو انکار کیسے کیا جائے ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغ نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں؟

ہمارے غزل گو شاعر صرف دوسروں ہی کی تنقید پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خود اپنا احتساب نفس کرتے ہیں اور ضرورت ہو تو اپنے آپ کو بھی نہیں چھوڑتے ۔ اپنی بات در حدیثِ دیگراں بیان کرنے میں یقیناً بڑی بلاغت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر بلاغت اس میں ہے کہ آپ دوسروں کی بات اپنے اوپر ڈال کر کہیں شیفتہ نے اپنے اس شعر میں یہی انداز اختیار کیا ہے ؎

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

داخلیت اور خارجیت

میر صاحب ہوں یا غالب ، مومن ہوں یا ذوق ، حسرت ہوں یا جگر ان

سبھوں کے یہاں تغزل کے بعض مشترک اجزاء ملتے ہیں۔ وہ سب اپنے دل کے اندرونی تجربوں کو بیان کرتے ہیں۔ تجربے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ طویل ہو۔ ایک لمحے کا تجربہ اس سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے جو عرصے تک محسوس کیا گیا ہو لیکن کیفیت اور جذب سے عاری ہو۔ غزل کا شعر ایک خاص تجربے کا اظہار ہے۔ تغزل کے لئے زیادہ تر وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی طلسمی دنیا میں پیش آئیں کہ اس کے لئے یہی اہم اور ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہیں کرنا چاہئے۔ تغزل کی اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے رمز و ایما کا اسلوب برتا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مبہم کیفیت اندرونی جذبے پر مبنی ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کا اخلاص غیر مشتبہ ہے۔ بعض غزل گو شاعروں کے یہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔ جیسے مصحفی اور جرأت وغیرہ۔ ان دونوں کا تغزل اعلیٰ پائے کا ہے لیکن ان کو وہ رتبہ کہیں نہیں ملا جو میر یا غالب کو نصیب ہوا۔ خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی، تفصیل اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے جو تغزل کے لئے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز وابہام سے ہوا ہے۔

غزل گو شاعر کے دل کو رمز و ابہام اس لئے بھی عزیز ہوتے ہیں کہ وہ جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہتا ہے وہ انہی سے ممکن ہے۔ دن کی روشنی کے مقابلے میں رات کی چاندنی جذبات پرستوں کو کیوں پسند ہے؟ بقول فرانسیسی مفکر گویو اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ ابہام چاہتا ہے نہ کہ وضاحت۔ خارجی عالم کی اشیا چھٹکی ہوئی چاندنی میں عجیب غریب پراسرار کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اُن کے خدوخال ہی بدل جاتے ہیں۔ وہ شخص جو مکان کی پیمائش کرنا چاہتا ہے یا درختوں کے نباتی خواص کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ دن کی روشنی میں انہیں دیکھے۔ لیکن وہ شخص جس کو یہ مطلوب نہیں، وہ چاندنی رات میں مکانوں اور درختوں کی مجموعی اثر آفرینی سے جتنا لذت اندوز ہوگا

آشنا دل کی روشنی میں نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ حقیقت اور خیال کی دھوپ چھاؤں میں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے۔ اور اس دھوپ چھاؤں میں حافظ اور تمام آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ دھوپ چھاؤں ہو یا فطرت کی کوئی دوسری مبہم صورت جو دل کے تاروں کو چھیڑ دے اہل نظر کو محبوب ہوتی ہے۔ پو پھٹنے سے قبل اور غروب کے شفقی دھندلکے میں جب تاریکی اور روشنی ہم آغوش ہوتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کی رفتار ایک ٹھہراؤ کی حالت میں ہے، دل کیوں پراسرار کیفیت محسوس کرتا ہے۔ صبح اور شام کی یہ مبہم کیفیت روحانی تزکیہ کے لئے موزوں خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ان اوقات کے لئے عبادتیں رکھی گئی ہیں۔ اس واسطے کہ ان لمحوں میں دل کو ابدیت کا جو احساس اور تجربہ ہوتا ہے وہ اور دوسرے اوقات میں نہیں ہوتا۔ فطرت کا پرسکون ابہام جذبات میں تحیّر کی آمیزش کرتا اور ان کی شدت کو بڑھاتا ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیوں اور کیفیتوں کی تکمیل کے لئے بھی سوائے اس فضا کے کوئی اور دوسری سازگار نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ جذبے میں دائمی طور پر مبہم سا تغیر ہوتا رہتا ہے اس لئے جذبے کی زبان کو بھی یہ زیب دیتا ہے کہ وہ مبہم ہی رہے۔ تعین جذبے کی فطرت کو مجروح کرتا ہے۔ تغزل کے ایمائی ابہام کی بھی یہی توجیہ ہے۔ رمز و ابہام اس کا عیب نہیں ہنر ہے۔ ان کے بغیر اس کے معانی میں وسعت نہیں آسکتی۔ چونکہ ذوقِ حسن اور جذبے کی لطافت کا اظہار رمز و کنائے ہی کے ذریعے اثر آفریں ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہمارے غزل گو شاعروں نے جو بیان کا اسلوب اختیار کیا وہی اس صنفِ سخن کے لئے موزوں تھا اور اس سے غنائی اور عشقیہ شاعری کی قدریں معین ہو سکتی تھیں۔ لیکن ان قدروں کا معین ہو جانا کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر زمانے کی تنقید اپنی نئی بصیرتوں سے ان کی بازآفرینی کرتی رہے۔ اس بازآفرینی کی بدولت روحِ تغزل کبھی فرسودہ یا مردہ نہیں ہوگی اور اس کے سدابہار پھول مشامِ جاں کو ہمیشہ معطر کرتے رہیں گے۔

غزل کے رموز و مطالب کی بازآفرینی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اردو شاعری زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ نہ لے اور انہیں اپنے اندر سمونے کی کوشش نہ کرے۔ تغیر جس طرح عالم کی شان ہے اسی طرح زندگی کی بھی شان ہے جسے جاننا اور ماننا چاہیئے۔ جذبے اور تخیل کی طلسمی دنیا میں بھی نت نئے محرک پیدا ہوتے ہیں جن سے جمالیاتی قدریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ جذبے کی طرح تصوّر بھی کچھ دنوں بعد عام ہو جاتے ہیں۔ وہ تصوّر یا خیال جو آج نیا معلوم ہوتا ہے کل اس میں تازگی باقی نہیں رہتی اس لئے ہر پیڑی اس ادب سے غیر مطمئن نظر آتی ہے جو اس سے پہلے کی پیڑی کے فن کاروں کی تخلیق تھا۔ وہ خود نیا ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنی اس خواہش میں بالکل حق بجانب ہوتی ہے۔ کسی زمانے کا ادب یا فن یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اب انسانوں کی خواہشوں اور خیالوں کی تکمیل ہو چکی اور آخری بات کہی جا چکی۔ جس طرح علم اور ادراک کی دنیا میں انسان نئے نئے تجربوں کی منزلوں سے گزر رہا ہے اور ہمیشہ گزرتا رہے گا۔ اسی طرح جذبے کی دنیا میں بھی اس کا سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں جب وہ ایک منزل پہ پہنچتا ہے تو آگے کی منزل اسے دُور سے نظر آنے لگتی ہے۔ اس طرح مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا لیکن قدروں کی بازآفرینی تخلیقی ہونی چاہیئے تاکہ ماضی کو نت نئے تجربوں اور آگاہیوں سے مالا مال کیا جا سکے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ آرٹ زندگی کے ان سرچشموں سے سیراب ہو، جو انسانی فطرت کی گہرائیوں سے ابلتے ہیں۔ اس طرح ماضی کو اپنے میں سمو کر جب فن کار اپنے زمانے سے خطاب کریگا تو اس کے لب و لہجہ میں ابدیت کا پرتو نظر آئے گا۔ اس ادلتی بدلتی اور الٹتی پلٹتی دنیا میں ادب اور فن کے بعض شہ پارے سدا بہار پھول بن جاتے ہیں جن پر زمانے کی گردش کا اثر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔ ان میں انسانی فطرت کی کبھی نہ بدلنے والی خواہشیں اور حقیقتیں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

تحلیلِ نفسی کی انقلابی فکر اور رومانیت

ابھی نفسیات کا علم بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ تحلیلِ نفسی کی انقلابی فکر نے اس علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس کا ادب پر بھی گہرا اثر پڑا ہے جس طرح طبیعات کے ماہروں نے ایٹم کے ٹکڑے کر کے قوت و توانائی کا خزانہ دریافت کیا ہے اسی طرح نفسیات کے ماہروں نے ذہن کے ٹکڑے کر کے تحت شعور اور لاشعور کو دریافت کیا ہے جس کے اثرات کا ابھی تک ہمیں پوری طرح اندازہ نہیں فکر اور احساس اور ارادے کے شعوری افعال کی تہہ میں تحت شعور اور لاشعوری دنیا میں جو قوتیں کارفرما ہیں انہیں ابھی تک نہ اچھی طرح سے سمجھا گیا ہے اور نہ برتا گیا ہے ضروری نہیں کہ تحلیلِ نفسی کے سب اصول کو مانا جائے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تحت شعور اور لاشعور کے نفسیاتی حقائق کو علمی طور پر جو مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اس سے انہیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے بعض مفکروں نے اس ضمن میں غلو سے کام لیا ہو لیکن اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جدید نفسیات کے نظریوں نے موجودہ ادب پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اور ان کی مدد سے پرانے ادب کے بعض تاریک گوشے بھی روشن ہو گئے ہیں۔ تحت شعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں کا حال ابھی ہمیں بہت تھوڑا معلوم ہوا ہے لیکن ان کی وسعتوں سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انسان کی جذباتی زندگی کے متعلق ہمارا علم ابھی ابجد سے آگے نہیں بڑھا۔ ہم نہیں جانتے کہ جذبے اور تخیل کی ہم آمیزی سے نفسی کیفیت وجود میں آتی ہے اس کے خواص کیا ہیں۔ پھر یہ خواص فکر کے چوکھٹے میں کس طرح بیٹھتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ جدت اور جذبے میں کیا باہمی تعلق ہے۔ یہ سب مسئلے آرٹ اور خاص طور پر غزل کے آرٹ کے لئے اس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر آئندہ ان کی نسبت ہماری

معلومات میں اضافہ ہوا تو ادب اور فن کی توجیہہ میں کس قسم کا انقلاب پیدا ہو گا لیکن ہمیں اس انقلاب کا سامنا کرنے کے لیئے تیار رہنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ادب میں غزل ہی ایسی صنف ہے جو اتنی سکت رکھتی ہے کہ اس آنے والے انقلاب کو جھیل جائے اور اس کے اثرات سے اپنے رنگ روپ میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے پھر اپنا مقام حاصل کر لے۔ تحت شعور اور لاشعور کی نئی نفسیات کے تقاضوں کو غزل اچھی طرح پورا کر سکتی ہے۔ شروع سے یہی نفسی محرک اس کی تخلیق کے ذمے دار رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔

غزل کی ادبی صنف ان قوموں کا ورثہ رہی ہے جن کے جذبات کی شدت کا دنیا کو علم ہے۔ ان کے جذبے اور تخیل کا غزل کی شکل میں لطیف ترین اظہار ہوا ہے غزل کی بنا پہلے عربی ادب میں پڑی۔ اور پھر عربی اثر سے فارسی میں اس کا رواج ہوا فارسی میں یہ اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔ غزل کی روایات فارسی سے ترکی اور اردو میں آئیں۔ اردو میں بھی غزل کمال کے اعلیٰ زینے پر پہنچی اور کسی طرح فارسی سے ہیٹی نہیں رہی۔ غرضکہ اسلامی دنیا کی چار سب سے بڑی اور اہم زبانوں میں غزل نے مقبولیت حاصل کی[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل اس روحانی اور جذباتی زندگی کی علامت بن گئی جس کی پرورش اسلامی تہذیب کے دامن میں ہوئی۔ غزل کے اس جذباتی ادب سے پہلے دنیا کے مہذب ملکوں میں عشق و محبت کی زمزمہ سنجی کا انداز اور لہجہ کچھ اور تھا۔ یونانی کلاسکی مفکر جس طرح عمل اور تاریخ کی توجیہہ میں اعادے کے اصول سے آگے نہ بڑھ سکے اسی طرح آرٹ میں نقالی سے آگے ان کی نظر نہ جا سکی۔ ان کے ادب میں سب کچھ ہے لیکن جذباتی تخلیق نہیں۔ افلاطون نے اپنی تصنیف لاز

---

[1] انڈونیشیں زبان میں تغزل کو "پنتول" کہتے ہیں۔ اس اسلامی (بقیہ بر صفحہ ۳۴۲)

ہیں مصری آرٹ کے قواعد وضوابط کی بڑی تعریف کی ہے جن کی خصوصیت یہ تھی کہ تخلیقی فکر اور جذبہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا تصرف نہیں کر سکتے تھے۔ نہ اسلوب اور موضوع میں تبدیلی کی جا سکتی تھی اور نہ ٹیکنیک میں۔ یہ آرٹ کا تجریدی اور سکونی نقطۂ نظر تھا جو زندگی کے انقلابوں کا حریف نہیں ہو سکتا تھا جن کی خصوصیت تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کے یہاں فنکار جن چیزوں کی نقل کرتا ہے وہ حقیقی نہیں بلکہ عکس ہیں۔ اس لئے اس کا آرٹ عکس کا عکس یا نقل کی نقل ہے اور زندگی کی حقیقت اور حرارت سے اس کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کلاسکی فکر کے خلاف اسلام تہذیب کے ہر شعبے میں ایک زبردست ردِ عمل تھا اور نقل و تکرار کے بجائے جذب و تخلیق کا علم بردار تھا۔ جس طرح عمل اور تاریخ کی دنیا میں اس نے کلاسکی تصور کو بدل دیا۔ اسی طرح آرٹ اور ادب میں اس نے رومانیت کی بنا ڈالی۔ روسو سے بہت پہلے فکر و احساس کا یہ طرز عالمِ وجود میں آچکا تھا۔ اس رومانیت کی بڑی خصوصیت اس کی حقیقت پسندی ہے۔ کلاسکی عہد کی محبت، یا تو بالکل حیوانی تھی یا خیالی۔ عیسائیت نے اس پر باطنی رنگ چڑھایا۔ افلاطونی محبت خواہش اور جذبے کی حریف نہ ہو سکی۔ اس کی بنیادیں خیالی تھیں جنہیں انسانی حقیقت سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ اگرچہ تحت شعور کی اصطلاح نئی ہے لیکن اصل میں رومانیت اس سے الگ چیز نہیں۔ اسلامی اثر سے جس رومانیت نے جنم لیا وہ ادب میں ایک زبردست انقلاب تھا۔ قوموں کی دبی ہوئی آرزوئیں اس محرک کی بدولت ابھر آئیں۔ عشق نے نیا مزاج پایا اور ادب میں گرمی اور سپردگی کا اظہار ممکن ہوا جو اس

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۴۲) زبان میں بھی اس صنفِ شعر کو بڑی مقبولیت حاصل ہے "پنتون" میں حسن و عشق کے معاملات رمزی انداز میں بیان کیے جاتے ہیں

سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا عربوں نے ادب میں جنسی جذبے کی کمال بینی پیدا کی جس کا اظہار غزل میں ہوا لیکن خواب و خیال کی اس دنیا کا دامن مجاز سے ٹکراتا رہا جس کے سبب سے اس کی تاثیر سدا بہار ہے۔

اگرچہ اسلام سے قبل جاہلی دور میں تشبیب کی شکل میں تغزل ابتدائی حالت میں ملتا ہے لیکن اموی عہد میں غزل اپنی نکھری ہوئی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ شعر کی یہ صنف عشق و محبت کے جذبات کے لئے مخصوص ہو گئی۔ اسلامی عہد کے ابتدائی عرب شاعروں کا تغزل مجاز ہی کی داستان سرائی ہے۔ مجاز ہی اُن کے لئے سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لئے اُن کے انداز میں جوش اور شدت پائی جاتی ہے۔ پہلی صدی ہجری میں عمرو ابن ابی ربیعہ نے غزل کی صنف کو کامیابی کے ساتھ برتا اور پھر اس کے بعد دوسروں نے اس کام کی تکمیل کی۔

تخیل اور جذبے کی ہم آمیزی کی ہزاروں مثالیں عربی شاعری سے پیش کی جا سکتی ہیں جن میں عاشقانہ تجربے کا اظہار کیا گیا ہے اور جن کی تاثیر غیر زبان والے بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہی عرب غزل نگاروں کے طفیل میں اہلِ مغرب کی ٹھنڈی مٹی بھی گرمائی۔ عرب جہاں جہاں گئے وہاں سب سے پہلے یورپ میں غنائی شاعری (لیرک) نے جنم لیا۔ اسپین، جنوبی فرانس (پرووانس) سسلی اور جنوبی اٹلی عشق و شوق کے نغموں سے گونج اٹھے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی آواز بازگشت یورپ کے ہر گوشے میں سنائی دینے لگی۔ جس طرح عربی میں عاشقانہ شاعری علامتی اور رمزی

لہ نشاۃ ثانیہ کے بعد جذباتی شاعری کو یورپ میں اور زیادہ فروغ ہوا
شیکسپیئر کے نزدیک شاعر وہ ہے جس کی آنکھ سے جذب و کیف ٹپکے
اس نے اس کی نسبت یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:-

The poets eye in a fine frenzy rolling

تھی۔ اسی طرح یورپ میں غنائی شاعری نے بھی یہی اندازِ اختیار کیا اور آج تک اس کا اثر پوری طرح سے زائل نہیں ہو سکا۔

غزل کی دیو مالا میں عاشق ہیرو ہوتا ہے۔ اس کے عشق کی خصوصیت دائمی غم ہے۔ اس کو عیش و نشاط کبھی نصیب نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس دیو مالا میں قیس و فرہاد کو بلند مرتبہ حاصل ہے جن کے نقشِ قدم پر وہ چلتا ہے۔ غزل کے ان دونوں سورماؤں کی سیرت کے لئے ریگستان اور کوہستان فطری پس منظر کا کام دیتے ہیں جو سخت کوشی، تنہائی اور جذباتی شدت کی علامتیں ہیں۔ اس پس منظر میں عشق جمالیاتی عین کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ریگستان کی وسعتیں اور کوہستان کی رفعتیں معمولی تمدنی زندگی سے کس قدر دُور ہیں۔ لیکن ان کی تنہائیوں میں غم کی پرورش کے لئے سازگار فضا موجود ہوتی ہے جو عاشق کے مزاج کو راس آتی ہے۔ اس فضا کی وسعتوں میں وہ اپنی اندرونی زندگی کا نغمہ صاف طور پر سنتا ہے اور اس کی رُوح کو فطرت کی پوری ہم آہنگی میسر ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بادِ صحراست کہ با فطرتِ ما در سازد
از نفس ہائے صبا غنچہ دل گیر شدیم

قیس و فرہاد کے لئے عیش و کامیابی باعثِ ننگ ہے۔ بامراد ہونا ان کی عاشقانہ شان کے خلاف ہے۔ ان کے کیریکٹر شہر میں رہنے والے بانکے چھبیلے عاشق کی ضد ہیں جو ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ وہ اپنے غم کے سرمائے میں مگن رہتے ہیں کامیابی اور عامیانہ مسرت کے بجائے اُن کے یہاں جذبے کی گرمی اور شدت، دائمی بیقراری اور آرزومندی کی کسک ملتی ہے۔ ان کا عمل پراسرار ضرور ہے لیکن آپ اس کو غیر انسانی نہیں کہہ سکتے۔ پراسرار ہونا ہی تو آرٹ کی جان ہے۔ غزل کی جمالیات اسی پر مبنی ہے۔ غزل کے ہیرو کا محبوب بھی پراسرار ہوتا ہے۔ اگر آپ لیلیٰ اور شیریں کی سیرتوں

کا جائزہ لیں تو ان میں پُر اسرار سنجیدگی اور وقار دکھائی دیں گے۔ لیکن اس وقار میں بھی غمگینی کی آمیزش ہے۔ لیلیٰ اور شیریں میں ہمیں حسین تتلیوں کا چھچھورا پن نہیں نظر آتا۔ اُن کی غمگینی نے اُن کے حسن اور اُن کی نسوانی دلکشی کو دوبالا کر دیا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر غم کے حُسن کا تصور ادھورا رہتا ہے۔ غم نہ صرف عشق کی ایک قدر ہے بلکہ جمال کی بھی ایک قدر ہے۔ خفیف سے ملال اور غمگینی کے بغیر جو محرومی کا پہلو لئے ہو نسوانی حسن بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ غزل کی جمالیات میں ہمیں اس کی قدم قدم پر جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ غزل کی یہ جمالیات کلاسکی ادب کے رجحان کی ضد ہے۔ اس سے آرٹ اور شعر کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس کی بدولت فن کار کے لئے یہ ممکن ہوا کہ وہ ہمیں حقیقت کا براہِ راست جلوہ دکھا دے۔ جس میں اس کی انفرادیت اور اُس کی اندرونی کیفیتوں کا عکس موجود ہو۔

غزل میں محبت کرنے والے کے اندرونی تجربے بیان ہوتے ہیں۔ اس کو محبوب کی طرح ساری کائنات حسین و جمیل نظر آتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ محبت کی جذباتی کیفیت غیر متوازن ہوتی ہے اور ساری زندگی پر یہ انداز چھا جاتا ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ محبت کا جذبہ کہاں شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم۔ چونکہ یہ جذبہ تمام جبلتوں میں سب سے زیادہ شدید اور قوی ہے، اس لئے فکر اس کی برابر روک تھام کرتی رہتی ہے۔ تخیل اس کے اثر سے نئی نئی جمالیاتی صورتیں تخلیق کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ حسن جذبے کو محسوس ہوتا ہے نہ کہ عقل کو۔ اس کی مسرت بھی جذبے کی مسرت ہے نہ کہ عقل و فکر کی۔ تخیل اس مسرت میں رنگ آمیزی کرتا ہے اور اسے ایسا اپناتا ہے کہ گویا وہ اسی کی تخلیق ہے۔ تخیل کی حرکت اندر سے باہر کی جانب ہوتی ہے اور اس کے ڈانڈے تحت شعور سے ملے ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف عقل و فکر کی حرکت باہر سے اندر کی جانب ہوتی ہے اور تحت شعور کے سرے پر

پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عقل دم بخود کھڑی ہو گئی ہو۔ وہ اسے ایک تاریک غار نظر آتا ہے جس میں عجیب و غریب مخلوق ناچتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتی۔ ہاں دور سے ناچ دیکھتی ہے۔ کبھی کبھی اس کے سرے پر پر تکلف پردہ ڈال دیتی ہے جس پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں لیکن جب اس غار کے اندر سے طوفانی آندھی اٹھتی ہے تو اس پر تکلف پردے کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔ غار کے دھندلکے میں رقص کا منظر پھر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے عقل یہ دیکھ کر دبے پاؤں واپس آ جاتی ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی رسائی شعور کی اوپری سطح سے آگے نہیں۔ اس کی دنیا خارجی ہے اور جذبے کی دنیا اندرونی ہے۔ محبت خارجی جلوؤں کے سحر سے مسحور نہیں ہوتی بلکہ خود اس سحر کی تخلیق کرتی ہے۔ محبت کا سارا کھیل تخیل کا کھیل ہے جس پر تحت شعور کے نقاب پڑے ہوتے ہیں۔ جگر نے محبت کی نفسیات کی اس طرح نقاب کشائی کی ہے ؎

نہ دیکھا رُخ بے نقابِ محبت محبت ہے شاید حجابِ محبت

نہ ہے خواب تعبیر خوابِ محبت محبت ہی نکلی جوابِ محبت

سبھی اٹھ گئے دیدہ و دل سے پردے

نہ اٹھا مگر اک نقابِ محبت

تحت شعوری نفسیات کہتی ہے کہ تخیل کی تہ میں بھی جذبے کی کارفرمائیاں چپکے چپکے جاری رہتی ہیں جن کی بدولت اس میں تخلیق کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور وہ حسی تجربوں اور تصوروں کو ہم آمیز کر کے ان کی نئی نئی صورتیں اور ترکیبیں بناتا ہے۔ فکری تخیل چاہے کتنا جوڑ توڑ اور کرید کرے جذبے کے اثر سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ وہ بھی کسی نہ کسی ایسی بے نام آرزو کو پورا کرنا چاہتا ہے جس کی تکمیل شعوری زندگی میں نہیں ہو سکی اور اس کی یادوں نے تحتِ شعور میں پناہ حاصل

کرلی۔ اب جب موقع آیا تو یہ دبی اور گھٹی ہوئی یادیں ابھرنے لگیں۔ اگر کبھی ایسا ہے کہ فکری تخیل جذبے سے محروم ہے تو یاد رکھئے وہ تخلیق سے بھی محروم رہے گا بلکہ کہنا چاہیئے کہ وہ زیادہ عرصہ تک اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکے گا۔ پرانی نفسیات میں تصورات ذہن کے بنیادی اجزا ہیں۔ جس طرح طبیعی عالم میں ذرّے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یا ایک دوسرے کو اپنے سے دور پھینکتے ہیں۔ اسی طرح ذہن کے یہ تصوّرات بھی ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے یا پھینکتے ہیں۔ ان تصوّروں کے عمل اور ردعمل سے ہمارے فیصلے اور عقیدے بنتے ہیں لیکن نئی نفسیات کہتی ہے کہ ذہن کے حرکی اجزا تصورات نہیں بلکہ جذبات ہیں۔ یہ تصوّرات جذبات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں بلکہ انہی کی وجہ سے معنی خیز بنتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی ایک دائمی بہاؤ کی حالت میں ہے۔ اس کے ظاہری روپ بدلتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں بنیادی طور پر اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی۔ زندگی کی گہرائیوں پر نظر ڈالی جائے تو شعور اور تصوّر کی دنیا کے ماورا جذبات کا کارخانہ بالکل الگ سمٹا نظر آتا ہے۔ غالب نے شاید اسی جذباتی حقیقت کو "میکدہ" اور "طلسم مستیٔ دل" کہا ہے جس کو آنسوؤں کا ہجوم ایک دیوار بن کر دوسروں سے چھپا لیتا ہے ؎

طلسم مستیٔ دل آں سوئے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

میر صاحب نے بھی آنسوؤں کا رشتہ جذبے اور تمنّا سے ملایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں ہوتا

دل جذبے کا معنوی رمز ہے۔ یہ آرزوؤں کی تخلیق کا سرچشمہ بھی ہے اور حسرتوں اور ارمانوں کا مرکز بھی۔ یہ شعوری اور تحت شعوری دونوں قسم کی کیفیتوں

پر حاوی ہے جو جذبے میں شامل رہتی ہیں۔ ہمارے شاعروں نے اس مبہم لفظ سے بڑا کام لیا ہے۔ فانی نے "کارگاہِ حسرت" کی خوشنما ترکیب سے اس کی نسبت ذکر کیا ہے ؎

کارگاہِ حسرت کا حشر کیا ہوا یا رب
داغِ دل پہ کیا گزری نقشِ مدعا ہو کر

کبھی ہمارے غزل گو شاعروں کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے اُسے تشخص کا جامہ زیب تن کرا دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

دل بھی تیرے ہی رنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
(میر دردؔ)

او مارِ سیاہ زلف سچ کہہ — تبلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے — کاٹا نہ ہفی ترا بُرا ہو
(میر سوزؔ)

لئے تو چلتے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا (داغؔ)

تحت شعوری دنیا کے متعلق جذبات ہی سے ہمیں تھوڑی بہت اطلاعیں ملتی ہیں یہاں جو زبردست دھارے بہتے ہیں۔ وہ چاہے کتنے ہی گدلے اور بہاؤ کے راستوں کو بدلنے والے کیوں نہ ہوں لیکن ان کی سطح پر کبھی نہ بدلنے والی آرزوئیں اور تمنائیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ظاہر میں دیکھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ دریا کی سطح پر بہ رہی ہیں لیکن حقیقت میں اُن کی جڑیں اُن دھاروں کی تہ میں چھپی ہوتی ہیں۔ یہ آرزوئیں اور خواہشیں کبھی تصوروں کی شکل اختیار کرتی ہیں اور کبھی جذبوں کی۔ چاہے کوئی روپ اختیار کریں نامکمل ہونے کا احساس اُن سے ہمیشہ وابستہ رہتا ہے۔ غالبؔ نے اسی حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میر صاحب نے خواہشوں کا ترانا اس طرح گایا ہے ؎

کیا کہیئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا اک دل ہزار خواہش
نے کچھ گناہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جا وہ غیرتِ گل
عاشق کی ایک پاوے کیونکر قرار خواہش
وہ شوخ دشمنِ جاں اے دل تو اس کا خواہاں
کرتا ہے کوئی ظالم ایسی بلا کی خواہش؛
کرتے ہیں سب تمنا پر میر جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایانِ کار خواہش

دیکھنے میں یہ خواہشیں اور حسرتیں چاہے کتنی ہی سادہ نظر آئیں لیکن ان میں بڑے ہی الجھاؤ ہوتے ہیں۔ بقول میر صاحب ؎

دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

ہم اپنے حافظے کو کتنا ہی کھنگالیں اور کوشش کریں کہ ان خواہشوں کی تہ میں کوئی وحدت پیدا ہو لیکن اس میں ہمیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ عزت، قوت، جنسی تکمیل سب اپنی اپنی جگہ اٹل نظر آتی ہیں۔ بعض وقت ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی یہ ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کسی سماجی مقصد یا خیر کے آگے عارضی طور پر اُن کا سر جھک جائے لیکن اگر آپ چاہیں کہ سماجی مقصد انہیں بالکل فنا

کر دے تو یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ جھکنے اور دبنے کے بعد پھر وہ چپکے چپکے سر اٹھانے کے منصوبے باندھتی ہیں۔ بعض اعلیٰ افراد کی زندگی میں ان کی گھٹن اور کھچاؤ عینی قدروں کی شکل میں کمال بینی کے نقش و نگار بناتا ہے۔ مذہب اور اخلاق اور آرٹ سب کا سرچشمہ تحت شعور کی انہی خواہشوں میں ملتا ہے اور ان کی نئی گہرائیاں یہیں سے قوت اور تاثیر پاتی ہیں۔ جگر نے اسی لئے شاہدِ مطلق کو مجاز کا پر تو لطیف قرار دیا ہے۔

صوفی نے جس کو شاہدِ مطلق سمجھ لیا
اک پر تو لطیف تھا حسنِ مجاز کا

زندگی عقل اور عشق، فکر اور جذبے دونوں پر حاوی ہے۔ اس میں خرد کی بخیہ گری اور جنوں کی پردہ دری دونوں کے جلوے نظر آتے ہیں جو اپنے اندر دلکشی کا سامان رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ زیست کا نظم و ضبط عقل کا رہینِ منت ہے لیکن زیست کا مزہ تو عشق کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس لئے شاعر کو یہ مشورہ دینا کہ وہ صرف عقل خداداد کی پیروی کرے یک طرفہ بات ہوگی۔ عشق خداداد کے حقوق پھر کس کے سر جائیں گے؟ اگر وہ صرف عقل خداداد کے اشاروں پر چلے گا تو اس کا نتیجہ سوائے بے کیفی کے کچھ نہ ہوگا۔ زندگی کی ہمہ گیری فکر اور جذبے دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ جگر نے اس جانب بڑا ہی بلیغ اشارہ کیا ہے۔

الٰہی کس طرح عقل و جنوں کو ایک جا کر لوں
کہ منشائے نگاہِ عشوہ زا یوں بھی ہے اور یوں بھی

جذبہ اندرونی ہوتا ہے۔ فکر کی طرح اس میں اشیا کے الگ الگ وجود نہیں پائے جاتے بلکہ زندہ کیفیتیں ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جذبہ اپنی تکمیل اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے سے ماورا نہ ہو جائے اس میں چاہے کتنی ہی دروں بینی پائی جائے لیکن وہ غیر خود سے کبھی بے نیاز نہیں

ہو سکتا۔ محبت تجرید نہیں ہو سکتی۔ محبت کسی کی محبت ہوتی ہے بالکل اس طرح جیسے نفرت کسی کی نفرت ہوتی ہے۔ فکر کو تجرید پسند ہے لیکن جذبے کو تجرید پسند نہیں۔ اگر غیر خود سے وابستگی نہ ہو تو جذبہ دیر تک باقی نہیں رہے گا۔ محبت کا مطلب صرف محبت کا شعور نہیں، بلکہ محبوب کی دلربائی کا شعور ہے جس کی تخلیق تخیل کرتا ہے ممکن ہے شروع شروع میں محبوب مثالی طور پر ذہن میں آئے لیکن بہت جلد کسی معین وجود کے ساتھ جذباتی اور تخیلی شعور وابستہ ہو جاتا ہے جس کی بدولت پوری کیفیت میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جذبہ خواہش اور تمنا کی پرورش کرتا ہے۔ ہم جب کسی کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتے ہیں تو لازمی طور پر دل اس کی تمنا کرتا ہے۔ آرزو کے جذباتی شعور میں تخیلی شعور موجود رہتا ہے۔ ہر جذباتی لہر جو شعور میں پیدا ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی خواہش کے وجود کو ذہن میں ابھارتی ہے۔ اگرچہ نفسیاتی طور پر تخیل ایسی ذہنی صورت پذیری ہے جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے لیکن جذباتی کیفیتوں میں تخیل کی کارفرمائی موجود رہتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے تخیلی تجربوں میں جذبہ شامل رہتا ہے خیالی پیکر جذبے کے لئے عین کا حکم رکھتے ہیں۔ اور جذباتی شعور کے لئے اُن سے ایک طرح کی تجدید عمل میں آتی ہے۔

جذباتی شعور میں جذبہ علم اور علم جذبہ بن جاتا ہے جو کسی ارادی، منطقی اور باقاعدہ فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ فطری ہوتا ہے اور خود شعور کی ترکیب میں مضمر ہوتا ہے۔ ہمارے شعور کے ساتھ ہمیشہ ایسی تصوری علامتیں موجود رہتی ہیں جو ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ علم و ادراک کی علامتیں ہیں یا تخیل کی۔ تخیلی شعور میں علم کی حیثیت سے خارجی اشیاء الگ الگ ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہیں۔ لیکن جذبے کی حیثیت سے انہیں دیکھا جائے تو وہ خود الگ الگ نہیں رہتیں بلکہ گھل مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ علم اور ادراک میں خارجی اشیاء زمان و مکان

میں علیحدہ علیحدہ اور معین وجود رکھتی ہیں اور ان کے خواص میں بھی علیحدگی اور تفرد پایا جاتا ہے جسے عقل کا کرشمہ کہنا چاہیئے جو انہیں تحلیل کر کے سمجھنا چاہتی ہے۔ علم میں جب کسی شے کا ادراک کیا جاتا ہے تو دوسری اشیا سے اس کی تجرید کر لی جاتی ہے تاکہ وہ ہر چیز سے بے تعلق سا نظر آنے لگے۔ لیکن تخیل میں جذبہ مختلف اشیا کا امتزاج کرتا ہے اور انہیں معنوی وجود بخشتا ہے۔ دراصل اگر غور سے دیکھا جائے تو تخیّل اور جذبے کا فعل علامتی نوعیت رکھتا ہے۔ اسی لیئے ان دونوں کی رُوح اشاریت میں پوشیدہ ہے جو منطق کی ضد ہے۔ تخیّل اور جذبے کی علامتی ساخت میں اگر کسی وجہ سے ضعف آجائے تو اُن کی تاثیر باقی نہیں رہ سکتی۔

تخلیقی شعور بھی ایک قسم کی فکر ہے لیکن یہ علامتی فکر ہے۔ اس میں خیال خود شے بن جاتا ہے۔ حسن تجریدی نہیں رہتا بلکہ کسی نہ کسی حسین کی صورت میں جلوہ فرما ہوتا ہے۔ تخیل کے لیئے لازمی ہے کہ باوجود صورت پذیری کے وہ مبہم رہے جس کا تعیّن زمان و مکان میں نہ ہو سکے۔ بغیر اس کے اس کی آزادی قائم نہیں رہ سکتی۔ تخیل کی بنیاد ٹھوس حقیقت سہی لیکن وہ جذبے کی مدد سے اس سے ماورا ہو جانا چاہتا ہے۔ خارجی حقیقت کبھی مکمل طور پر حسین نہیں ہو سکتی۔ حُسن ایسی قدر ہے جو صرف تخیل ہی میں مکمل حالت میں مل سکتی ہے۔ عشق اسی لطیفۂ نہانی پر فدا ہوتا ہے۔ بقول حافظ:— لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد

کہ نامِ آں نہ لبِ لعل و خطِ زنگاریست

خالص مجاز سے گفتگو کرتے ہوئے غالبؔ نے محبوب کی رعنائی سے تخیّل ہی میں لطف اندوز ہونے کی کوشش کی ہے ؎

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

جگر بھی عشق و حسن کو تخیلی دنیا سے باہر نہیں لانا چاہتا ؎

عشق کیا چیز ہے اک حشر در آغوش خیال
حسن کیا خواب ہے اک چشم تماشائی کا

لیکن حسن کے خارجی مادی وجود کی تاثیر سے وہ انکار نہیں کرتا۔ اُن کے نزدیک بغیر لیلیٰ کے قیس کا جنوں شرمندۂ اظہار نہیں ہو سکتا ؎

میں گنہ گار جنوں میں نے یہ مانا لیکن
کچھ اُدھر سے بھی تقاضائے نظر ہوتا ہے

یہ درست ہے کہ محبت میں انتہائی دروں بینی اور داخلیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ آرٹ کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس میں خارجی حقیقت کی جلوہ گری نہ ہو۔ نفسیاتی طور پر بھی دیکھا جائے تو جو اخلاص مجازی شاعری میں ممکن ہے کسی دوسری شاعری میں ممکن نہیں۔ زندہ حقیقت نہ تو پوری طرح داخلیت کے تابع ہوتی ہے اور نہ خارجیت کے۔ تخیل کا اندرونی عمل اس تضاد میں موافقت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے اعلیٰ آرٹ میں داخلی اور خارجی امکانوں کی قوت پوشیدہ ہوتی ہے اور اس وجہ سے اس میں ہمیں غیر معمولی وسعت اور گہرائی محسوس ہوتی ہے۔ بعض دفعہ تحت شعور میں داخلی عناصر کی سخت کشمکش ہوتی ہے جس سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ بقول ییٹس :—

"جب ہم دوسروں سے تکرار کرتے ہیں تو خطابت وجود میں آتی ہے
لیکن جب ہم اپنے آپ سے جھگڑتے ہیں تو شعر جنم لیتا ہے۔"

تحت شعور کی جبلتوں سے جو جوش و ہیجان پیدا ہوتا ہے اس پر آرٹ کے ضبط و نظم سے شاعرانہ تخلیق عمل میں آتی ہے۔ لیکن تحت شعور سے بھی اسی وقت کوئی بات پیدا ہو گی جب کہ وہ پہلے شعور میں رہ چکی ہو۔ شعوری زندگی میں جو

خواہشیں اور تمنائیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ یا مبہم حالت میں رہ کر دب گئیں۔ وہ بالکل فنا نہیں ہوتیں بلکہ تحت شعور میں جا کر دبک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جب موقع ملا ابھر آئیں تخیل انہیں اکساتا ہے۔ جو شخص تخیل سے عاری ہے وہ اس عمل و مرور کی کیفیت پر نظر نہیں رکھتا جس میں سے گزر کر حقیقت حقیقت بنتی ہے۔ فن کار کا تخیل دبی ہوئی خواہشوں کو ابھار کر انہیں حقیقی زندگی میں پیوست کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس کے ہاں جذبے کا داخلی اور خارجی فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا۔

غزل کے آرٹ میں بھی داخلی اور خارجی عنصر پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ کبھی پہلو بہ پہلو اور الگ الگ دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے میں ایسے گھل جاتے ہیں کہ ان کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ یہ غزل کے آرٹ کا کمال ہے۔ میرؔ صاحب تجریدی حسن کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ان کا تخیل خارجی پیکر حسن کا متلاشی رہتا ہے ؎

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا　　جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

غالبؔ نے بھی تصورِ جاناں کے ساتھ خارجی اور محسوس حقیقت کو جذبے کی تسکین اور تشفی کے لئے ضروری خیال کیا۔ اُن کی اس غزل کا یہی مضمون اور انداز ہے ؎

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب　　عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال　　صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　جاں نذرِ دل فریبیٔ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو　　سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اب تک تو تخیل محبوب کے خارجی وجود کا محتاج تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود اپنے اندرونی جذب کا آسرا لیتا ہے جس سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں اور جس کے ٹھہراؤ میں بھی تھرتھراہٹ نہیں جاتی ؎

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

مجازی عشق سے گفتگو کرتے ہوئے غالب نے نفسیاتی حکمت کے عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس منزل کی ہر راہ اس کے جذبے اور تخیل کی روندی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی خارجیت اتنی نمایاں ہو گئی ہے کہ مجازی عشق کی لطافتیں چھپائے سے نہیں چھپتیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تم ہی کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

نیچے کی غزل میں خواب کی سی کیفیت اور تلازمات ملتے ہیں جن کی تحت شعوری اہمیت ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ محبوب اور شراب اس خواب کے تمنائی محرک ہیں۔ ان میں منطقی ربط نہ سہی جذباتی ربط تو ہے ؎

وہ اُ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغ نگاہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو — نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

لیکن غالبؔ نے مجاز اور ہوس میں بجا بجا فرق و امتیاز کیا ہے اور اپنے عشق کو شیوہ اہلِ نظر قرار دیا ہے ۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی [1]

غالبؔ کے یہاں محبت کوئی مطلق حیثیت نہیں رکھتی اور نہ اس کا محبوب اس لئے ہے کہ اس کی پرستش کی جائے ۔ اس نقطۂ نظر کی سچائی اور حقیقت پسندی قابلِ ا

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ مجاز کے ڈانڈے اکثر اوقات ہوس سے جا کر مل جاتے ہیں لیکن ہمارے غزل نگاروں نے اس میں فرق کیا ہے اور اس باب میں انہیں بڑا اصرار اور اہتمام منظور رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں فرق صرف نقطۂ نظر کا ہے ۔ وہی چیز جو ایک کے یہاں مجاز ہے دوسرے کے یہاں لذت پرستی کا روپ دھار سکتی ہے ۔ ذوق ہی اس کا صحیح فیصلہ کر سکتا ہے کہ ہوس کیا ہے اور مجاز کیا ہے ۔ فارسی اور اردو کے غزل نگار چونکہ زیادہ تر مجاز سے گفتگو کرتے ہیں اس لئے ان کی باتیں اسی دنیا کی باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ جہاں یہ باتیں ڈھکوسلا بن گئی ہیں وہاں اخلاص عنقا ہے ۔ جہاں ایسا (بقیہ برصفحہ ۲۵)

ہے۔ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہوگا کہ غالب کا عشق امیرانہ ہے۔ اسی طرح جیسے میر صاحب کا عشق فقیرانہ اور داغ کا رندانہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

یادوں کی اہمیت

ہر قسم کی شاعری میں اور خاص طور پر عاشقانہ شاعری میں "یاد" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ عجیب عجیب انداز سے جذبے کا جادو جگاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "یاد" تحت شعور کے دھندلکے میں خواہشوں اور تمناؤں کا لبادہ اوڑھے سکڑی سمٹی بیٹھی رہتی ہے۔ جہاں اسے موقع ملا اور اس نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ یادوں میں جمالیاتی خزانہ پوشیدہ رہتا ہے۔ یہ تخیل کا بے لوث عمل ہے جو خود اپنا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵٦) نہیں ہے وہاں وہ نشتر ہیں جو دل کے پار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اپیل دائمی ہے۔ انسان چاہے کسی قسم کی معیشت و معاشرت کے ادارے قائم کرے وہ اپنی فطرت کے جذباتی پہلو سے کبھی بھی ناآشنا نہیں رہ سکے گا۔

غالب کے بعض خطوں سے اس کی طبیعت کی افتاد اور آزاد روی کا پتہ چلتا ہے جو رسمی اخلاق سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے۔ عشق و محبت کے متعلق اس نے اپنے ان دو خطوں میں اظہار خیال کیا ہے جو مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہیں۔ ان اشاروں سے اس کے عشق مجازی کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔ دونوں خط یہاں نقل کئے جاتے ہیں :- (بقیہ بر صفحہ ۳۵۸)

مقصد ہوتا ہے۔ آرٹ کا بڑا کام یہ ہے کہ وہ سوئی ہوئی یادوں کو جگائے۔ ہم اس وقت کسی چیز میں حسن محسوس کرتے ہیں جب کہ وہ ہمیں کسی دوسری حسین چیز کی یاد دلائے جس کو ہمارا دل چاہتا ہو۔ یاد بیتے ہوئے جذبوں کو ابھارتی ہے لیکن اس طور پر کہ ہم اُن کے اور اپنے درمیان ایک طرح کا فاصلہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے یاد آنے پر بھی وہ مبہم رہتے ہیں۔ یادیں ایک لطیف رشتہ ہوتی ہیں جو ہماری گزری ہوئی خودی کو موجودہ خودی سے مربوط کرتی ہیں۔ شاعر کو یہ اس لئے عزیز ہوتی ہیں کہ وہ ان سے مستقبل کے فریب نظر کا تانا بانا بناتا ہے۔ یاد تحت شعور کا کرشمہ ہے آرٹ میں اُس کی اہمیت مسلم ہے۔ ہمارے غزل نگاروں نے ہر زمانے میں اس نفسیاتی حقیقت کو محسوس کیا۔ اُردو کے ہر بڑے شاعر کے دیوان میں اس کی بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس جگہ میں صرف غالب اور حسرت کے کلام سے چند نمونے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵۷) "جناب مرزا صاحب ـــــ! آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ انہوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اُس سے محبت۔ سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب! شعراء میں فردوسی، فقراء میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور (بقیہ برصفحہ ۳۵۹)

پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ غالب کی ایک پوری غزل یادوں پر مشتمل ہے جس میں تمنائیں بھی ہیں اور دل کو مسوسنے والی حسرتیں بھی۔ ان یادوں میں نہایت لطیف تحت شعوری تعلق ملتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان یادوں میں مختلف کیفیتوں کا مقابلہ کیا جا رہا ہے جو گزر چکی ہیں۔ پوری غزل میں خواب کا سا دھیما پن پایا جاتا ہے:-

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنّا یعنی　　پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی　　کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۳۵۸) تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہے خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانہ ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا"

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۔ لاہور ایڈیشن)

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

"مرزا صاحب —— ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ (بقیہ بر صفحہ ۳۶۰)

آہ وہ جرأت فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ایک اور غزل ہے جس میں ان یادوں کو دوسرے پیرائے میں پیش کیا ہے
انداز یہ اختیار کیا ہے جیسے بڑھاپے میں کوئی جوانی اور اس کی امنگوں کو یاد کرے۔

(بقیہ از صفحہ ۳۵۹) برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی، میں جب بہشت کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمرّدیں کاخ اور طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

(اُردوئے معلّیٰ صفحہ ۱۹۰)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ حسرتؔ نے اپنے کلام میں خوشبو اور اُس کی طلسمی خاصیت کو شعری محرک کے طور پر بڑی خوبی اور کامیابی سے برتا ہے۔ اُن کی غزل میں خوشبو ایک رمزی علامت بن جاتی ہے جس میں بلا کی ایمائی قوت ہے۔ وہ بھولی ہوئی یادوں کو ابھارتی اور سوئے ہوئے جذبے کو چونکاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو خوشبو کے جذباتی اور شعری محرک اور یادوں میں لطیف تعلق ہوتا ہے۔ بدھ مت کے مہایانا مسلک میں چونکہ خودی اور احساسِ ذات ایک لعنت ہے۔ جس سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے حافظہ اور یادیں بھی لعنت ہیں، جو ہماری گزری ہوئی خودی کو موجودہ خودی سے وابستہ کرتی اور اسے بامعنی بناتی ہیں اس مسلک میں یادیں اس خالق کے مثل ہیں جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو ایذا پہنچائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مہایانا مسلک کی ایک مشہور کتاب ——— "لنکاواترا استترا" میں یاد کے لئے وہی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو خوشبو کے معنوں میں آتا ہے۔ اس میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ زندگی اپنی ماضی کی یاد یا خوشبو کو قائم رکھتی

ہے اور اس کا برابر اعادہ کرتی رہتی ہے۔ جب تک یہ یاد نہیں مٹے گی اس وقت تک احساس ذات باقی رہے گا اور جب تک احساس ذات باقی ہے اس وقت تک نجات ممکن نہیں۔ بر خلاف اس کے زندگی کے وہ فلسفے جو احساس ذات کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کو فطری امانت تصوّر کر کے اس کی تربیت کرتے ہیں یادوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں کہ بغیر ان کے شخصیت کی تعمیر ممکن نہیں۔ ان سے زندگی کے دائمی بہاؤ میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے اور شعور اور جذبہ دونوں ان سے قوت اور تاثیر حاصل کرتے ہیں۔

اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ حسرتؔ نے جس طرح خوشبو کے طلسمی اور جذباتی محرک کو اپنی عاشقانہ شاعری میں برتا ہے۔ اسی طرح یادوں کا سرمایہ بھی اس کے کلام میں عجیب عجیب گل کھلاتا ہے۔ اگر حسرتؔ کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ اردو زبان میں یادوں کا شاعر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُس کی ان یادوں کے ذریعہ اس کے تخیل اور جذبے کی کارفرمائیاں ظہور میں آئیں۔ حسرتؔ کی عشقیہ شاعری کی جمالیات میں ان یادوں کو بڑا دخل حاصل ہے جن کی تہ میں تحت شعور کے زبردست دھارے موجیں مارتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اپنی یادوں کو سینت سینت کر رکھتا ہے اور وہ اسے بے حد عزیز ہے۔

حسرتؔ نے اپنی ایک مشہور نظم یا غزل میں اپنی عاشقانہ زندگی کی ابتدا کا حال اور اس کی جو یادیں اس کے حافظے میں محفوظ تھیں انہیں مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ یہ پوری غزل جو باوجود اپنی طوالت اور تفصیل کے لطف سے خالی نہیں اوپر کہیں نقل کی جا چکی ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

آغازِ محبت کی چند اور یادیں ملاحظہ ہوں ؎

وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغازِ محبت میں — نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری
عجب نیرنگیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی — ہوئی ہے جن سے دامانِ محبت پر گلکاری

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا — اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں — یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

یاد کا طلسمی اور شعری محرک حسرت کے ان شعروں میں ملاحظہ ہو ؎

پھر تری یاد ہوئی موجبِ آرائشِ دل — للہ الحمد پھر آباد یہ ویرانہ ہوا

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور — دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

آہ وہ ماجرائے راز و نیاز — جس کا باقی ہے اک فسانہ ہنوز

تجھ سے ہے حسن و جمالِ دو جہاں کی رونق — اے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق
یاد ہیں اس گلِ رعنا کے جو نکلے آنسو — بن گئے دیدۂ خونابہ فشاں کی رونق

محرومِ طرب ہے دلِ دلگیر ابھی تک — باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک
اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود — اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
کہنے کو تو میں بھول گیا ہوں مگر اے یار — ہے خانۂ دل میں تری تصویر ابھی تک

بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی   پہلو میں ہے کچھ کچھ خلش تیر ابھی تک

حیرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز   باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

یہ پوری کی پوری غزل یادوں کی آئینہ دار ہے ؎

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا   حسرتؔ کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ   باقی ہے فقط عہدِ تمنّا کا فسانا

آتی ہے تری یاد سو حسرتؔ کو شبِ غم   ہر بار اُسے افسانۂ دل کہہ کے سنانا

حسرتؔ ہر چند ارادہ کرتے ہیں کہ روزگارِ عاشقی کی یاد دل سے بھلا دیں لیکن وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس واسطے کہ بقول غالبؔ ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ   کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

حسرتؔ نے اپنی اس غزل میں اپنی ناکامی کو اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بے گانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جائیے

لیکن کبھی کبھی عاشق کے تیور بدل جاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے ؎

نہ ملیں گے دل بیتاب کرے لاکھ اصرار
ہم بھی جا اب تجھے اے عہد شکن بھول گئے

کوئی تصور جو محض تصور ہو علم و ادراک کی ایک تجرید ہے اور بس۔ وہ کوئی نتیجہ اس وقت تک نہیں پیدا کر سکتا جب تک وہ جذبے میں سمویا ہوا نہ ہو۔ جذبہ تصوروں کو اس طرح وحدت عطا کرتا ہے جس طرح گرمی سے کیمیاوی اجزا ایک خاص صورت

اختیار کر لیتے ہیں۔ غالب کے اس فارسی شعر میں اسی جانب اشارہ ہے ؎

گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بہ جوش آور

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

بہا تو خوں ہوا آنکھوں کی راہ بہہ نکلا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا

تخیلی فعل بھی جذبے ہی کا علامتی اظہار ہے۔ جذبہ ہماری جبلتوں سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ یہ شے جو جبلت کو ابھارتی ہے جذبے کو بھی ابھارتی ہے۔ جذبہ جبلت کا نفسیاتی پہلو ہے جس سے ہمارے طبعی رجحان وجود میں آتے ہیں۔ یہ خودی کی طرف بھی جھکتے ہیں اور غیر خود کی طرف بھی۔ انہی سے ہماری ذہنی اور مادی زندگی کے تانے بانے بنائے جاتے ہیں۔ تخیل اور فکر دونوں جذبے کے رہین منت ہیں۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ تخیل جذبے کے زیر اثر فکر کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ توجہ کی ساری صلاحیتیں مرتکز ہو کر شعور سے مختلف اشارے پاتی ہیں تاکہ کسی مسئلے کا حل تلاش کریں۔ اس طرح جذبہ اور علم دونوں ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے ہیں۔ جب شوق و آرزو کے سوتے سوکھ جائیں تو علم میں اتنی سکت نہیں کہ تنہا کسی کو عمل پر اکسا سکے۔ علم اور جذبے کا مقصد ایک ہی ہے یعنی عمل لیکن اس کے اظہار کی صورتیں الگ الگ ہیں۔ علم کو عملی جامہ پہنانے میں جذباتی شعور بڑا کام کرتا ہے۔ ہر جذبے میں خارجی صورت پذیری کی تحریک ملتی ہے جو علم میں بجائے خود موجود نہیں ہوتی۔ جذبے کا سہارا لے کر وہ خارجی طور پر موثر بنتا ہے۔ جذبے اور تخیل اور جذبے اور علم کا تعلق ایسے مسائل ہیں جن کی نفسیاتی توجیہ ابھی تک پورے طور پر نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں آئندہ جو تحقیقات ہوں گی وہ ادب اور آرٹ کے لئے خاص اہمیت رکھے گی۔

زبان جذبے کو اکسانے کا زبردست ذریعہ ہے۔ ہر لفظ یا خیالی تصویر میں یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہمارے جذبات کو برانگیختہ کر سکے۔ ایک زمانہ تھا جب لفظ اور جادو مترادف سمجھے جاتے تھے اور آج بھی لفظوں میں پرانی جادو کی قوت و تاثیر ابھر سکتی ہے۔ اگر کوئی اُن کے استعمال کا ڈھب جانتا ہو۔ ہر دفعہ جب ہم کسی لفظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس کی جذباتی قوت ظہور میں نہیں آتی۔ اسی طرح کسی لفظ کی تصوری صلاحیت بھی ہر موقع پر ظاہر نہیں ہوتی۔ لفظوں کی جذباتی اور تصوری صلاحیتیں اس وقت ظہور میں آتی ہیں جب انہیں ٹھیک برتا جائے۔ بغیر اس کے اُن کی چھپی ہوئی قوتیں نمایاں نہیں ہوتیں۔ کسی لفظ کے تصوری اظہار میں اس وقت تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ اس کی جذباتی اہمیت نکھر گئی ہو۔ دراصل لفظ حقیقت کی علامتیں ہیں۔ یہ صرف خارجی حقیقت کی علامتیں نہیں ہیں بلکہ ان اندرونی تجربوں کو بھی اُن کے ذریعے سے ظاہر کیا جاتا ہے جو جذبات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شاعر چونکہ لفظوں اور خیالی تصویروں کی بازآفرینی کرتا ہے۔ اس لیے ان میں نئے نئے معنی اور تاثیر کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پرانے اور فرسودہ لفظ زندگی کے نئے تقاضوں سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ لفظ مجسمے کی مانند بے جان، بے حس اور بے جذبہ نہیں ہوتے۔ اُن کی تہ میں جاذب و حرکت کی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کی تلازمی ترتیب جادو کا اثر رکھتی ہیں۔ منطقی ترتیب تو اوپری چیز ہے اور اُس کی پہنچ بھی اوپری ہے۔ خاص طور پر شعر میں تو تلازمی ترتیب ہی جذبے کے اظہار کا وسیلہ ہوتی ہے۔

زبان یادوں کو دو طرح سے برانگیختہ کرتی ہے ایک تو براہ راست جذباتی تلازم (ایسوسی ایشن) کے ذریعے اور دوسرے خارجی احوال کی علامتی تصویر کھینچ کر۔ دوسری حالت میں تخیل کا عمل بڑی وسعت رکھتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ اگر کسی کا تخیل زندہ اور قوی ہے تو لازمی طور پر وہ شخص جذباتی ہوگا۔ بالکل اس طرح جیسے یہ کہنا صحیح ہے

کہ قوی جذبے کے انسان میں تخیل کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ خودی اور غیر خود کے جذباتی ردِ عمل سے شعر اور نغمہ جنم لیتے ہیں۔ اس جذباتی ردِ عمل میں صداقت اور افادیت پہلو بہ پہلو موجود رہتی ہیں۔ خود صداقت میں جذبے کا عنصر موجود رہتا ہے۔ صداقت کو بالکل تجریدی بنانے کی کوشش کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چونکہ جذبے میں تصوری اہمیت شامل ہوتی ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجے کا فن کار صرف جذبے ہی کو نہیں ابھارتا بلکہ فکر کو بھی اکساتا ہے۔ اس کا فن انفرادی نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی مقاصد کی بھی اس سے تکمیل ہوتی ہے۔ لفظوں کے امرس میں گھل کر جذبے اور فکر کی الگ الگ حیثیتیں باقی نہیں رہتیں بلکہ دونوں تحلیل ہو کر ایک بن جاتے ہیں۔

شاعر لفظوں کے موزوں استعمال سے سماجی مقاصد کی خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ موزوں استعمال شعر میں رمزی یا علامتی نوعیت بھی رکھ سکتا ہے۔ علامت یا رمز تخیل یا جذباتی عمل کی روح ہے جس کا سرچشمہ شعور میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ شاعر کو بعض وقت اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ علامتی طور پر فکر کر رہا ہے اس واسطے کہ یہ علامتیں تحت شعور سے آتی ہیں۔ رمز و استعارہ کی یہ بڑی خوبی ہے کہ ان میں مختلف معنی ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے خیال کا بھی اظہار ہوتا ہے، اور جذبے کا بھی۔ وہ تصویر بھی ہوتے ہیں اور تصوّر بھی۔ بعض اوقات شاعر کو اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس چیز کو علامتی یا رمزی انداز میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح موسیقی کے ماہر کو اپنے دل میں ایک لے سنائی دیتی ہے جس کی نسبت وہ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس لے کا سُروں کی ترتیب سے کیا تعلق ہے۔ اسی طرح شاعر اپنے علامتی لفظوں کے منطقی معنوں پر غور نہیں کرتا لیکن اس کے لفظوں میں معنی ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں ورنہ شعر کا اجتماعی مقصد فوت ہو جائے گا۔ بعض سمبولسٹ اور سرریلسٹ شاعروں کی اس ضمن میں بے توجہی نے ان کے آرٹ کو ناقابلِ تلافی

نقصان پہنچایا ہے۔ لفظوں کا جوہر دوسرے لفظوں کے ساتھ ملنے ہی سے کھلتا ہے جس طرح فرد کی صلاحیتیں جماعت میں نکھرتی ہیں۔ لفظوں کے ملنے سے ان میں معنی آفرینی کے علاوہ طلسمی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جذبے کی دروں بینی اور انفرادیت زبان کے ذریعے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے سماجی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔

غزل کے سماجی محرّک

اب تک ہمارے غزل نگاروں نے تخیّل اور جذباتی حقیقت پر زیادہ زور دیا اور یہ صنفِ سخن حسن و عشق کے معاملوں کے لئے مخصوص ہو گئی۔ لیکن اب ضرورت ہے کہ ادراک اور علم کے حقائق بھی غزل کے مضمون میں سموئے جائیں تاکہ خارجی عالم کی بصیرتیں شاعرانہ طور پر ہماری زندگی سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ اس طرح غزل کے ذریعے پوری تہذیب کی لطیف یادوں اور ان کی معنویت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کیا جا سکے گا۔ اب اس زمانے کے شاعر کو چاہئے کہ وہ ہر سمت سے تاثرات قبول کرے زمین اور آسمان سے، تہذیب اور معاشرت سے، علم و حکمت سے اور شعور و لاشعور سے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ ان سب تاثروں کو اپنے جذبے میں سمو کر پیش کرے گا تو اس کی بات صرف ایک خیال پرست کی بات نہ ہوگی بلکہ ایسے شخص کی بات ہوگی جسے زندگی اور عالم کی بصیرت حاصل ہو۔ جس طرح زمین کی تہ میں کیمیاوی عمل سے ہیرے بنتے ہیں۔ اسی طرح شاعر کے تخیل اور جذبے کی گرمی اس کی ہر بات میں تاثیر کی چمک پیدا کر دے گی۔ اور اس کا انفرادی تجربہ عالمگیر تجربہ بن جائے گا۔

اب آنے والے زمانے میں ہمارا غزل گو شاعر دروں بینی کی آڑ لے کر دنیا سے الگ تھلگ اور بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اس بے تعلقی کی وجہ سے اس کے اندرونی

جوہر نمایاں نہیں ہو پائیں گے۔ جو وجود نہ کسی پر اثر انداز ہو اور نہ کوئی دوسرا اس پر اثر ڈالے وہ بانجھ اور بے نتیجہ ہے۔ وہ تخلیق کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو باوجود انتہائی دروں بینی اور داخلیت کے ہمارے غزل گو شاعروں نے زمانے کی چنوتی (چیلنج) قبول کی ہے اور بدلتے ہوئے حالات سے جذباتی اور ذہنی مطابقت کی ہے لیکن یہ مطابقت اوپری رہی ہے۔ غزل کی صنف کو اگر ہمارے ادب میں زندہ رکھنا ہے تو جدید زمانے کی زندگی سے اسے اور زیادہ قریب لانا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لئے اسلوب اور ٹیکنیک دونوں کے لئے نیا نہ رہنا چاہیے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلیاں سلیقے سے کی جائیں تاکہ غزل اپنے آپ کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ نسل کی ذہنی الجھنوں، خواہشوں اور مقصدوں کی آئینہ دار بن سکے۔ ان تبدیلیوں کا یہ بھی مطلب نہیں کہ حسی تجربوں کی حقیقت پسندی کے آگے غزل کوئی اور قدم نہ اٹھائے۔ فکر، تخیل اور جذبے کی ہم آمیزی رمز و ایماء کا ایسا اسلوب پیدا کر سکتی ہے جس میں اندرونی تجربے کی گہرائی بھی ہو اور خارجی جماعتی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل بھی۔ اگر غزل گو شاعر میں جدید تمدن کے فکر و فن کی بصیرت موجود ہے تو وہ زندگی کے الجھاؤ سے گھبرائے گا نہیں بلکہ اس کے چیلنج کو قبول کرے گا۔ اس لئے کہ اس کو اپنے اوپر پورا اعتماد ہوگا۔ وہ زندگی کے الجھاؤ کو رمز و استعارہ کی پیچیدگی میں سمو دے گا۔ استعارے اور رمز کے بغیر دیومالا کی تخلیق ممکن نہیں جو شعر اور خاص طور پر غزل کے شعر کی جان ہے۔ غزل میں فسانہ خوانی خاص انداز سے کی جاتی ہے۔ یہاں بیان سے زیادہ اشارے ملتے ہیں جن کی مدھم اور جھلملاتی روشنی میں حقیقت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اصل اہمیت خود داستان کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس بات کو کہ خود شاعر نے اس سے کیا جذباتی اثر قبول کیا، داستان اس کا تخیلی تجربہ بن جاتی ہے وہ اس میں اپنی قدریں اور آرزوئیں پیوست کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی داستان

ایک بالکل اچھوتا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اور زندگی کے تجربوں سے اس کا نیا تعلق قائم ہو جاتا ہے جس میں ایک طرح کا اچانک پن ہوتا ہے۔

شاعری کی فسانہ خوانی جب اُس کے تخیل اور جذبے کا جز بن جاتی ہے تو اس کے گرد اس کے تمدنی تجربے، خیالی تلازمات اور خارجی تاثر جمع ہو جاتے ہیں جن کی بدولت اس کی فکر میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور درون و برون کا فرق و امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس تنوع میں ایک طرح کی وحدت ملتی ہے جو زندگی کے پورے تجربے پر حاوی ہوتی ہے۔ یہ مکمل تجربہ ایسی یادوں پر مشتمل ہوتا ہے جو الگ ہونے پر بھی ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہوتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایرانی قالین کے مختلف حصوں کی بوقلمونی اپنے اندر وحدت اور ہم آہنگی رکھتی ہے۔

جذباتی حقیقت خارجی حقیقت کے ساتھ ہم کیفی پیدا کرے تو اُس کی وحدت اجتماعی زندگی کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ جبلت اور لاشعور کے عالم میں انسانی فکر و ارادہ بے بس سہی لیکن جماعتی زندگی میں فکر و ارادے کے بغیر گتھیاں نہیں سلجھ سکتیں۔ پھر ادب میں ارادے کو بڑی احتیاط سے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ادب کبھی بھی یہ بات گوارا نہیں کرے گا کہ اس کو صحافت اور اشتہار کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا جائے نہ وہ کبھی اپنے مقصدوں کو پست کرنے پر آمادہ ہوگا۔ ہاں وہ اپنے زمانے کی زندگی سے ربط و تعلق رکھے گا۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کا سچا اظہار کر سکے لیکن اس اظہار میں بھی وہ اپنی اصلیت کو مسخ نہیں کرے گا۔ اگر ادب کسی ایسی حقیقت کی ترجمانی کرے جو زندگی سے بے تعلق ہے تو وہ خود باطل اور بے اثر ہو جائے گا۔

جو شاعر تجریدی حسن کا متلاشی ہے اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کبھی بھی اس کے ہاتھ نہ آئے گا۔ زندگی میں گھل مل جانے سے ممکن ہے اس کی جھلک اُسے نظر آجائے۔ حسن اور عشق دونوں زندگی کے جھمیلوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔ غم عشق اور غم روزگار

کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر علیحدہ کیا جائے گا تو بے لطفی اور سپاٹ پن کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آرٹسٹ زندگی کے رقص اور موسیقی کو اپنے آرٹ میں جلوہ افروز کرتا ہے جو اس کے نزدیک اصل حقیقت اور مسرت اور آزادی کی علامتیں ہیں۔ لیکن اسے اختیار ہے کہ اگر وہ چاہے تو زندگی کے بھونڈے اور مکروہ پہلوؤں کو بھی ظاہر کرے تاکہ حقیقت کی کوتاہی نظروں کے سامنے آجائے اور کمال کی طرف بڑھنے کی امنگ پیدا ہو۔ یہاں بھی اس کا ذوق اس کی رہبری کرے گا۔ اس ضمن میں بھی کوئی بندھے ٹکے اصول مقرر نہیں کئے جا سکتے۔

آرٹ اور شاعری کے محرک ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ فکر و فن اور صورت و معنی کے سانچے بھی دائمی نہیں۔ خود محبت کا تصور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے تاثر اور جذبے کی ماہیت چاہے نہ بدلے لیکن اُس کے انداز بدلتے رہتے ہیں جس پر جماعتی زندگی اپنی مہریں ثبت کر دیتی ہے تاکہ اپنے تقاضوں کی تکمیل کا سامان مہیا کرے۔ ہر زمانہ ایک لحاظ سے عبوری زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا زمانہ خاص طور پر عبوری نوعیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی ایک موڑ پر پہنچ گئی ہے جہاں آگے بڑھنے کے لئے اُسے اپنے راستے کا انتخاب کرنا ہے موجودہ زمانے کی زندگی کا تنوع، اس کی تیز رفتاری اور اس کے انقلاب ہماری نظروں کو خیرہ کئے ہوئے ہیں۔ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے پاؤں اکھڑ گئے ہوں اور ہم اپنا توازن کھو چکے ہوں اور گرنے ہی کو ہوں۔ نئی زندگی ہم سے نئے نئے مطالبے کر رہی ہے۔ زندگی کی دیکھا دیکھی آرٹ میں بھی نئی قدروں کی تلاش ہو رہی ہے۔ ممکن ہے ابھی ان قدروں کا تعین نہ ہوا ہو لیکن ہو جائے گا۔ زندگی کے خدوخال جتنے نمایاں ہوتے جائیں گے یہ قدریں بھی ہماری نظروں کے سامنے بالکل واضح ہو جائیں گی۔ ہماری زبان کا ادب اور ہماری شاعری بھی زندگی

کے نئے تجربوں کو زیادہ دنوں تک بے نیازی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ نئی زندگی کے سوز و ساز میں اسے بھی شریک ہونا پڑے گا۔ وہ تماشائی کب تک بنی رہے گی۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ نمو پذیر زندگی کے تغیرات کے باعث غزل کے بندھے ٹکے اصول اور اس کے آہنگ میں تھوڑی بہت تبدیلی تو لازمی طور پر کرنی ہی پڑے گی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے ادب اور اپنی شاعری کو بدلتے ہوئے احوال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھیں۔ اگر اس میں قوتِ حیات ہے تو وہ زندہ رہیگی چاہے اپنے میں کچھ تبدیلیاں کر کے زندہ رہے۔ جمہوری اور صنعتی احوال کے اثر سے ہمارا ادب یقینی طور پر بدلے گا۔ اس لئے اچھا ہے کہ شعوری طور پر بدلے اور ہم خود اس کے پھیلاؤ کو بڑھانے میں مدد دیں تاکہ اس کی جذب و حرکت کی قابلیت میں اضافہ ہو۔ اب تک ذاتی محبت ادبی تخلیق کی محرک رہی ہے۔ ممکن ہے اس محرک کے ساتھ آئندہ اور دوسرے محرک بھی پیدا ہو جائیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ ادبی تخلیق کیلئے سماجی خیر کا محرک زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوگا۔ اس محرک کے امکانوں کا تجربہ ابھی دنیا کیلئے باقی ہے۔ اس اخلاقی بلندی میں تو کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ خاص طور پر جب کہ وہ انفرادی آزادی کو بھی فروغ دینے والا ہو۔

جدید تمدن میں انفرادی جذبے کی جگہ اب آہستہ آہستہ اجتماعی جذبہ لے رہا ہے۔ جس طرح انفرادی زندگی میں شعور کے علاوہ تحت شعور اور لاشعور کی قوتیں ہیں، اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی ہیں۔ اجتماعی زندگی کی صدیوں کی دبی ہوئی خواہشوں اور حسرتوں کو شعر و نغمہ کا جامہ پہنانا ہوگا۔ لیکن یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ غزل کی صنف کو انفرادی جذبے کے لئے اور نظم یا اس کی کسی خاص صورت کو اجتماعی جذبے کے اظہار کے لئے مخصوص کر دیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غزل اور نظم دونوں میں دونوں قسم کے جذبوں کا اظہار بلا کسی فرق و امتیاز کے روا رکھا جائے اور آہستہ

آہستہ یہ دونوں اصناف سخن ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ جدید تمدن کی خارجیت اور اجتماعیت آئندہ چاہے کوئی صورت بھی اختیار کرے لیکن انفرادی تجربے کی اہمیت ہر حالت میں برقرار رہے گی اور شعر کی جذباتی اور تخیلی حقیقت بھی اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ رمزی اور علامتی اسلوب اب تک انفرادی تجربوں کے اظہار کا ذریعہ رہا ہے۔ آئندہ اس میں نفس اجتماعی کی جذباتی کیفیتیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ چونکہ فرد کی طرح جماعت بھی جذبہ اور تخیل رکھتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا اظہار شعر میں نہ ہو۔ غزل میں بھی اور نظم میں بھی۔ یہ غزل کا نیا روپ ہوگا جس کی ترقی کے امکانوں کی کوئی حد نہیں۔ اس نئے رُوپ میں بھی غزل اپنی پرانی تاثیر اور جادو برقرار رکھ سکے گی۔ بشرطیکہ اسے برتنے والے اسے سلیقہ سے برتیں۔ لیکن ہر حالت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ غزل کی ٹیکنیک میں تبدیلی کرنے سے لفظوں کے وہ تعلقات تو متاثر نہیں ہوتے جو شعر میں لازمی طور پر موجود ہونے چاہیئں۔ اور جن سے اُن کی ایمائی اور جذباتی قدریں معیّن ہوتی ہیں۔ اسلوب اور موضوع کی تبدیلی کے باوجود تغزّل کی بنیادی حیثیت برقرار رکھی جا سکتی ہے جس کا انحصار حسن ادا پر ہے۔

آج ہماری شاعری اس جوکھم میں سے گزر رہی ہے۔ جس میں سے گوئٹے کا فاؤسٹ گزرا تھا۔ فاؤسٹ نے اپنی انتہائی دروں بینی کے مرض کا یہ علاج تجویز کیا تھا کہ اپنی آنکھوں کو خارجی عالم کی آب و تاب اور رعنائیوں کے لئے کھول دے بقول غالبؔ۔ ع

کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

جس طرح نظارہ نظر کی شوخیوں کو چھیڑتا ہے اسی طرح تماشا سوئی ہوئی تمناؤں کو جگاتا ہے۔ حسرتؔ نے اس نکتہ کو پا لیا کہ تماشے کا دامن تمنا سے اٹکا ہوا ہے۔ گویا کہ خارجیت اپنے اندر داخلیت کا سامان پوشیدہ رکھتی ہے اور

وہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق نہیں ہو سکتیں۔اس کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؂

تری محفل سے ہم آئے مگر با حال زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنّا بے قرار آئی

دراصل انتہائی دروں بینی اور انتہائی بروں بینی دونوں اعصاب کے خلل کی نشانیاں ہیں۔ اُن سے مفر کی صورت بس ایک ہے اور وہ یہ کہ فرد اپنی حقیقت اور اہمیت پر ایمان رکھتے ہوئے جماعت میں اپنی تکمیل کا سامان مہیا کرے اور اس طرح فرد اور جماعت دونوں کے تقاضوں کی تکمیل ہو اور اُن میں دوئی اور تضاد باقی نہ رہے۔ مغربی تہذیب خارجیت میں ایسی پھنس گئی ہے کہ من کی دنیا کی طرف توجہ نہ رہی مشرقی ادب داخلیت میں ایسا ڈوبا کہ فطرت اور جماعت کے خارجی محرک اس کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ ان محرکوں کو اُبھاگر کرنا ضروری ہے۔ مشرقی ادیب اور شاعر کو عالم کے نظارے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ اس کے نظام عالم میں خود اس کی کیا حیثیت ہے۔ اس وقت زندگی اور آرٹ کا اس سے بڑھ کر نصب العین نہیں ہو سکتا کہ اندرونی اور خارجی زندگی کے تقاضوں اور مطالبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ لیکن یہ نہ ہو کہ ہم آہنگی اور توازن کی شعوری کوشش ادب کو جوشِ حیات سے محروم کر دے اور اُسے بالکل سکونی بنا دے۔ مکمل توازن تو سکون ہی میں ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے فن کار کو چاہئے کہ زندگی کی حرکت اور ہماہمی میں اس توازن کو تلاش کرے تاکہ اس کا آرٹ غیر تخلیقی نہ ہو جائے۔

اگر اُردو غزل کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں بعض ایسے شاعر ملتے ہیں، جنہوں نے غزل کے اسلوب کی مناسبت سے علامتی طور پر ایسے نکات بیان کئے ہیں۔ جن سے اجتماعی زندگی کے احوال اور انقلابوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے سماجی اصلاح و تنظیم کا کوئی باقاعدہ پروگرام یا واضح نقطۂ نظر کیوں نہیں پیش

کیا اُن سے بے جا توقع کرنا ہے۔ مغربی طرزِ حکومت اور تمدن اہلِ ہند کے لئے بالکل نئے تھے۔ انہیں اب بالکل نئی قوتوں سے واسطہ پڑا۔ جن کی بدولت اجتماعی زندگی میں ہر قسم کے انتشاری رجحان پیدا ہوئے۔ پرانی قدریں کس مپرسی میں پڑ گئیں نئی قدروں میں ابھی اتنی جان اور توانائی نہیں تھی کہ وہ اجتماعی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھال سکیں۔ اسی لئے حساس طبائع کے لئے یہ زمانہ سخت اُلجھن اور کوفت کا تھا۔ انہیں ہر طرف سے شکست اور مایوسی دکھائی دے رہی تھی۔ راجا رام نرائن موزوںؔ صوبہ دار عظیم آباد نے جو شیخ علی حزیںؔ کے شاگردوں میں سے تھے، نواب سراج الدولہ والی بنگال کے شہید ہونے پر یہ شعر فی البدیہہ کہا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس شعر میں اخلاص، وفاداری اور دردمندی کے علاوہ ایک اہم تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ میر حسنؔ دہلوی نے جو راجہ رام نرائن موزوںؔ کے ہم عصروں میں سے تھے اپنی کتاب "تذکرہ شعرائے اُردو" میں (صفحہ ۱۵۰) اس شعر کی شانِ نزول کا ذکر کیا ہے۔ میر حسنؔ نے جو خود اعلیٰ درجے کے شاعر اور تذکرہ نویس تھے۔ اس ضمن میں غیر دانستہ طور پر ہمارے لئے یہ انکشاف کیا ہے کہ ہمارے شاعر رمز و ایما کی زبان میں اجتماعی اور تاریخی نوعیت کے حقائق کو بیان کرتے تھے اور سمجھنے والے اُن کا مطلب سمجھتے تھے۔ غزل کے شعر کی یہ خوبی ہے کہ اس کے خاص مطلب کے علاوہ اس کا عام مطلب بھی اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ چنانچہ موزوںؔ کے اس شعر میں خاص اور عام دونوں مطلب موجود ہیں۔ غزل کے شعر کا یہ وصف آئندہ بھی موجود رہا اور برتنے والوں نے اُسے برتا۔

میر صاحب کی ذاتی زندگی کی ناکامیوں اور مصیبتوں کے علاوہ ملک

کی عام ابتری اور تباہ حالی نے انہیں ایسا پژمردہ اور مایوس کر دیا کہ یہ مایوسی اُن کی رُوح کی گہرائیوں میں سرایت کر گئی جس کا اظہار ان کے کلام سے ہوا ہے۔

فرماتے ہیں ؎ مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

ناامرادانہ زیست کرتا تھا میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

میرؔ صاحب اپنے زمانے کی ابتری کی نسبت اس طرح اشارہ کرتے ہیں؎
ہاتھ لئے آئینہ تجھ کو حیرت ہے رعنائی کی
ہے بھی زمانہ ہی ایسا ہر کوئی گرفتاری میں ہے

اُن کی تنگ دستی نے انہیں ایسے تجربوں سے آگاہ کیا جن سے کھاتے پیتے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہوتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض جگہ اپنے کلام میں ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن میں "مفلس کا خیال" اور "مفلس کا چراغ" اپنی معنویت کو اجاگر کئے بغیر نہیں رہتے ؎

ترے خیال میں جیسے خیال مفلس کا گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میرؔ صاحب سے پہلے ولیؔ دکنی نے بھی مفلسی کو عالم میں رسوائی کا موجب قرار دیا ہے ؎

باعثِ رسوائی عالم ولیؔ مفلسی ہے، مفلسی ہے مفلسی

اسی مضمون کا ولیؔ کا دوسرا شعر بھی ہے ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

شاہ حاتمؔ کا شعر بھی ملاحظہ ہو جس میں اشارہ ہے کہ باوجود مفلسی کے شاعر کی

خودداری میں کمی نہیں آتی ؎

مفلسی اور دماغ اے حاتم کیا قیامت کرے جو دولت ہو

ظفر کی دردمندی تمام تر واقعیت پر مبنی ہے جو اُن کے کلام میں ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے عیش کو سیہ پوش ہوتے دیکھا اور وہ سب کچھ دیکھا جو انقلاب کے جلو میں رونما ہوتا ہے اور سیاسی انقلاب سے پہلے بھی زوال کے اثرات اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہے ہوں گے۔ ان کے کلام میں زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کی تصویریں ہیں مثلاً ؎

سب کارِ جہاں ہیچ ہے سب کارِ جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچمداں ہیچ

اس باغ میں تھوڑی سی بہار اور پھر اس پر
اے نوگلِ خنداں تجھے تشویشِ خزاں ہیچ

ہو جنس تنک مایۂ ہستی کے نہ خواہاں
یہ جنس، یہ بازار، یہ گوہر، یہ دکاں ہیچ

پایا نہ بجز داغ سیہ کاری یک عمر
نقشِ قدمِ قافلۂ عمرِ رواں ہیچ

نے شمع انجمن ہوں نہ میں لالۂ چمن پھر کیوں جہاں میں داغ بدل آفریدہ ہوں

گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہِ غربت میں ہم آوازِ جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا کہ پہنچی اڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بو

چاکِ قفس سے دیکھ رہا ہوں رخِ چمن	صیاد سے نہیں ہوس بال و پر مجھے

قفس کے ٹکڑے اڑا دوں تڑپ تڑپ کے آج	ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے	لٹ جائے کہیں راہ میں سامان کسی کا

نہیں ہے طاقتِ پرواز آہ اے صیاد	خدا کرے کہ تو اب وا درِ قفس نہ کرے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی	جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

غالب نے اپنے خاص انداز میں اس اندرونی کشمکش کی نسبت اشارے کئے ہیں جس سے ہر بڑے فن کار کو سابقہ پڑتا ہے۔ یہ اندرونی الجھاؤ اور گتھی آرٹ کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے۔ غالب نے اس کو تجریدی طور پر بیان کرنے کے بجائے محسوس صورت میں پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آرٹسٹ کو ایک طاقت آگے کی طرف کھینچ رہی ہے اور دوسری طاقت پیچھے کی طرف۔ اس کشاکش سے اہلِ ہند کی فکری اور جذباتی زندگی کے اس تضاد کا پتہ چلتا ہے، جو ہندوستان میں مغربی تہذیب کے پھیلنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس شعر میں کلیسا اور کعبے کے علامتی لفظ خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

غالب ۱۸۲۸ء میں اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتے گئے اور وہاں تقریباً دو سال ان کا قیام رہا۔ اُن کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔ جوانی کا خون رگوں میں موجزن تھا۔ اور دل میں حوصلوں اور امنگوں کی کمی نہ تھی۔ کلکتے کے دورانِ قیام میں غالب نے ایک نئی دنیا دیکھی جو دہلی کی دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ کلکتے کی ترقی پسندی دہلی

کی جاگیردارانہ فضا سے بالکل الگ تھی۔ یہ دونوں شہر جدید اور قدیم تہذیبوں کے علامتی مرکز تھے۔ مغربی تہذیب کی ہماہمی اور رونق نے غالبؔ کے دل کو موہ لیا۔ بعد میں بھی جب کبھی کلکتے کا ذکر آتا تو "نازنین بتانِ خود آرا" اور "بادہ ہائے ناب گوارا" کی یاد اُن کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ کلکتے کا سفر غالبؔ کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے جس کی بدولت اُن کے فکر و احساس میں زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ جدید تمدن کی برکتوں کا انہیں احساس ہوا جو اپنے ساتھ نیا علم اور نئے آئین لایا۔ انہی اثرات سے اُن کی شخصیت میں اندرونی کشمکش پیدا ہوئی جو شاعرانہ تخلیق کی محرک ہوتی ہے کلکتہ غالبؔ کو اس لئے بھی پسند آیا کہ یہاں آزاد زندگی کے لوازم آسانی سے بلا روک ٹوک مہیا ہو سکتے تھے۔ یہ سماجی بے قیدی جدید تہذیب کی خصوصیت تھی جو اُن لوگوں کے لئے بالکل نئی چیز تھی جنہوں نے جاگیردارانہ فضا کی پابندیوں میں آنکھیں کھولی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی واپسی پر انہوں نے اپنے دوست مولوی سراج الدین احمد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر تاہل کی پابندیاں نہ ہوتیں تو میں مستقل طور پر کلکتے میں سکونت اختیار کر لیتا۔

اپنی ایک فارسی غزل میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ زندگی میں جو کہنگی اور دقیانوسیت آگئی ہے، اسے وہ دور کریں گے اور بزمِ رنگ و بو میں نئے انداز کی طرح ڈالیں گے ؎

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

کلکتے سے واپسی کے بعد اگرچہ غالبؔ کو اپنی زندگی دہلی کی قدامت پسندی کی فضا میں گزارنی پڑی۔ لیکن جدید تمدن کی برکتوں کا احساس انہیں برابر رہا جو انگریزوں کے توسط سے ہندوستان پہنچا تھا۔ سید احمد خاں نے آئینِ اکبری کی تصحیح کے بعد غالبؔ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس پر تقریظ لکھ دیں۔ اس پر غالبؔ نے ایک نظم سید احمد خاں

کے پاس لکھ بھیجی جس میں انگریزی حکومت کے آئین اور مغربی تمدن کے مادّی وسائل اور اس کے اصول کو صاف صاف سراہا ہے جو انسانوں کو بقائے نفس اور حصولِ راحت میں مدد دیتے ہیں۔

صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ اینان را نگر
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
داد و دانش را بہم پیوستہ اند — ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند — ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بآب — دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں مے برد — گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
نغمہ ہا بے زخم از ساز آورند — حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئینِ دگر تقویم پار

سید احمد خاں کو غالب کے یہ خیالات پسند نہ آئے اور انھوں نے اس نظم کو کتاب میں شامل نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصے کے لئے دونوں کے شخصی تعلقات

---

[1] اپنی ایک فارسی غزل میں غالب نے اس ذہنی انقلاب کا استقبال کیا ہے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر ہندوستان میں آئندہ پیدا ہونے والا تھا۔ رمز و ایما کی زبان میں یہ بات بھی بتلائی ہے کہ اہل ہند کے پاس بچا ہے گوہر و تاج نہ رہا ہو لیکن ذہنی ترقی کا سامان مہیا ہو گیا ہے جیسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سیاست کے میدان میں جو (بقیہ بر صفحہ ۳۸۲)

بھی پہلے کی طرح خوشگوار نہ رہے۔ لیکن رامپور کے سفر سے واپسی پر غالب سید احمد خاں کے ساتھ مراد آباد میں ٹھہرے۔ جہاں وہ ان دنوں صدر الصدور تھے اور دونوں میں صفائی ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید احمد خاں نے غالب کے خیالات کا جو مغربی تہذیب و تمدن کے متعلق اُن کے تھے گہرا اثر قبول کیا۔ بعد میں غالب کے یہاں جو چیز ایک مبہم احساس کی صورت میں تھی وہ سید احمد خاں کے یہاں ایک واضح اصلاحی پروگرام بن گئی یہ پروگرام تعلیم اور سیاست اور معاشرت سب پر حاوی تھا۔ اس کے ذریعے سے سید احمد خاں ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن کو عہد وسطیٰ سے نکال کر عہد جدید میں لے آئے جو اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔

غالب کی متعدد تحریروں اور شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس زبردست انقلاب کے اثر کو محسوس کیا تھا جس نے بالآخر مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔ اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

چند اور شعر اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں ؎

(بقیہ از صفحہ ۳۸۱) نقصان اٹھانا پڑا اس کی تلافی علم و حکمت کے میدان میں ہو گئی۔ اس غزل کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رُخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند　　دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند　　بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند　　بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند　　ہر چہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالبؔ گردشِ افلاک باقی ہے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز
جوں جادہ سر بکوئے تمنائے بے دلی
زنجیرِ پا ہے رشتۂ حب الوطن ہنوز

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ——— الخ میں بھی اہلِ وطن کو زمانے کے تیور پہچاننے کی دعوت دی ہے۔ اور اپنے آپ کو اس جلی ہوئی شمع سے تشبیہ دی ہے جو شب کی صحبتوں کے داغِ فراق کی یاد تازہ کرتی ہو۔ یہ سب کلام ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کا ہی لیکن غالبؔ کی اندرونی کشمکش تو اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اور وہ پرانے نظامِ حیات کو درہم برہم ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغلیہ سلطنت جس تمدن کی علامت ہے وہ تیزی سے زوال کیطرف جا رہا ہے۔

غالبؔ کی بصیرت نے یہ بات پالی تھی کہ جدید مغربی تہذیب کے سامنے

مشرقی تہذیب کو ہار ماننا پڑے گی۔ اور مشرقی علم و ادب کو بھی جن میں حقیقت کی روح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہو گیا تھا اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھالنا پڑے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند

اگرچہ غالبؔ مشرقی تہذیب سے بڑی حد تک مایوس تھے جو خارِ خشک کی طرح بے لوچ اور غیر تخلیقی ہو گئی تھی لیکن ایک جگہ انہوں نے اشارہ کیا ہے کہ ممکن ہے آئندہ محکومی اور ذلّت کی آگ میں تپ کر یہ اپنا آب و رنگ پھر نکالے یہ اشارہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے پیشین گوئی کا حکم رکھتا ہے۔ شعر ہے ؎

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ مثلِ خارِ خشک مردودِ گلستاں ہیں

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو غالبؔ کی طبیعت کا ردِّ عمل اس زمانے کے بعض دوسرے اہلِ فکر و نظر کے ردِّ عمل سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ غالبؔ نے مغربی تہذیب و تمدّن کو قدر کی نظر سے دیکھا۔ اُن کے شاعرانہ وجدان نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس تہذیب کی تہ میں جو زبردست قوتیں کام کر رہی ہیں وہ عالمگیر نوعیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں۔ اس سے ایک طرح کی نامرادی کا احساس ضرور پیدا ہوا۔

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

لیکن نامرادی کے احساس کے باوجود غالبؔ مشرقی تہذیب کے ذہنی اور اخلاقی انحطاط سے بخوبی واقف تھے اور مغربی تہذیب کی فضیلت اور ترقی پسندی اُن کے نزدیک مسلّم تھی۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں ایک جماعت

ایسے لوگوں کی تھی جو مغربی تہذیب کو ایک لعنت خیال کرتے تھے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جب کہ مغلیہ سلطنت کا انتشار مکمل ہو چکا تھا، وہابی جماعت نے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے اصولوں کو پھر سے زندہ کرنے کا تہیہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ۲۷ سال قبل سید احمد بریلوی شہید ہوئے جو اس جماعت کے قائد تھے ان کے بعد بھی وہابی تحریک اپنا کام کرتی رہی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی اس کا بڑا ہاتھ رہا۔ خاص طور پر بنگال اور بہار میں اس تحریک نے مسلمانوں میں ایک عوامی رنگ اختیار کر لیا جس کا مقصد انگریزی حکومت کا تختہ الٹنا تھا لیکن زیادہ دن تک یہ رنگ قائم نہ رہ سکا اور یہ متوسط طبقے کی مذہبی تحریک بن گئی۔ چنانچہ مومن خاں کا بھی اس سے تعلق تھا جیسا کہ ان کی مثنوی بہ مضمون جہاد سے ظاہر ہے۔ کہیں کہیں غزلوں میں بھی ان کے اس رجحان کی نسبت اشارے ملتے ہیں۔ ایک جگہ انقلاب کی خواہش کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو　　یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک اس میں گو ہوں خاک
پر اب تو زمیں بوسِ کلیسا نہ کریں گے

حسن و عشق کے راز و نیاز کے متعلق مومن رمز و کنایے کو جس خوبی سے برتتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے لیکن اوپر کے شعر میں جب اجتماعی زندگی کے ایک تجربے کو بتانا چاہتے ہیں تو وہ اپنے اسلوب بیان کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ شعر کا مضمون جہادی نقطۂ نظر سے چاہے کتنا اعلیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن غزل کے شعر کی حیثیت سے دیکھا جائے تو بہت ہی معمولی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعر کا اخلاص اور غیر ملکی حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ غیر مشتبہ ہے لیکن یہ تغزل کے لئے کافی نہیں ہے

حقیقت نگاری کے لحاظ سے دیکھئے تو ماننا پڑے گا کہ مومن کے شعر میں ایک واقعی تجربے کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ جس تاثر کو ظاہر کرتا ہے اس کی نسبت سامع کو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غزل میں اسی مطلب کو زیادہ لطیف اور زیادہ موثر طور پر نہیں ادا کیا جا سکتا تھا؟ غالبؔ نے اپنے شعر میں کعبہ و کلیسا کے علامتی اور سماجی محرکوں کو جس خوبی سے برتا ہے اس کے مقابلے میں مومنؔ کا شعر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ غالبؔ کے جو دوسرے شعر اوپر درج کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدنی اور سماجی نوعیت کے مضمونوں کو غزل کے علامتی اور رمزی انداز میں خوبی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے جس سے غزل کے امکانوں کا پتہ چلتا ہے۔

یہ قدرتی بات ہے کہ ہر زمانے کی شاعری اس زمانے کے رسم و رواج معاشرتی اور سماجی حالات اور تمدنی اور حکمیاتی وسائل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ شاعرانہ تخلیق کے لئے کوئی ایک اسلوب یا موضوع ہمیشہ کے لئے مقرر نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر بس اس کے باہر قدم ہی نہ رکھے۔ ہر اسلوب اور ہر موضوع شاعرانہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کی اہمیت حسن ادا کے ذریعے نمایاں کی جا سکے۔ یہ کام بغیر تخیل کے نہیں انجام پا سکتا۔ ہر تخیلی تجربہ مکمل ہوتا ہے چاہے اس کا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ بعض حقائق اور اشیا ایسی ہیں جن سے انسان کو لاکھوں برس سے ایک قسم کا جذباتی تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ جیسے سورج، چاند، ستارے، صبح و شام، سبزہ و چمن، پھول، عورت، محبت اور موت۔ یہ دنیا کی ہر زبان میں شعر کا موضوع رہے ہیں اور غالباً آئندہ بھی رہیں گے۔ اس لئے کہ ان میں غیر معمولی طور پر نسلی یادوں کو برانگیختہ کرنے کی قوت ہے۔ جدید تمدن کے تاثرات میں مشین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی حرکت دل کی دھڑکن کی یاد دلاتی ہے۔ ہم میں سے اکثر کے لئے وہ پراسرار ہے۔

جو شعریت کے لئے ضروری ہے۔ زمانے کا انداز کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشین کی نئی دیومالا لکھی جائے گی اور شعر میں اسے برتا جائے گا۔ مشین جدید تمدن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اب کہیں مفر نہیں۔ اس کی افادیت اس سے محبت پیدا کرائے گی۔ آنے والے شاعر اس کو جذبے اور تخیل سے ہم آہنگ کریں گے۔ مغربی شاعری میں یہ کام شروع ہو چکا ہے! در صنعتی اور سائنٹیفک ترقی کے ساتھ ہمارے یہاں بھی جلد شروع ہو گا۔ خاص طور پر ہمارے نظم لکھنے والے شاعر اس نئے موضوع کو بڑی خوبی سے حکیمانہ انداز میں پیش کر سکتے ہیں جس سے زندگی اور اس کے احوال کی نسبت ہماری بصیرتوں میں اضافہ ہو گا۔ غزل میں تو یہ مضمون صرف علامتی انداز میں کھپ سکے گا جس کے لئے بڑی قادر کلامی کی ضرورت ہے۔ غزل میں خارجی اور سماجی موضوع جب برتے جائیں گے تو لازمی طور پر اُن میں داخلی رنگ نمایاں ہو گا جو خارجیت کے جامے پر ہو گا۔ اس طرح وجدان اور زندگی کا عملی اور افادی پہلو ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مشین کا عمل زندگی کے عمل کی ضد ہے۔ زندگی اگر بالکل مشین کے مماثل ہو جائے تو اس کی اُپج اور تخلیق و ایجاد کی صلاحیت باقی نہیں رہ سکتی۔ جدید زمانے کی تمدنی زندگی کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ وہ شخصیت کے جوہر کو اتنی اہمیت نہیں دیتی جتنا کہ اجتماعی عمل کی میکانیت کو۔ مشین کے ساتھ جذبے کی وابستگی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ انسان کی مالک بننے کے بجائے اس کی دوست بنے لیکن جدید تمدن میں مشین چونکہ آقا ہونے کی دعویدار ہے اس لئے آرٹ سے اس کی چپقلش پیدا ہونا لازمی ہے۔ میکانیت اور آرٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ آرٹ رُوح کو میکانیت کی پابندی اور قید سے آزاد کرتا ہے تاکہ وہ اپنی فطری وسعتوں کی سیر کر سکے۔ وہ اسے اس واسطے آزاد نہیں کرتا کہ وہ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرے

بلکہ وہ اس کی نئی منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور پُرانی گزری ہوئی منزلوں کے نئے راستے بتاتا ہے تاکہ ان کی دلکشی قائم رہ سکے۔ اگر شعور میکانیت کا تابع ہو جائے تو وہ مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ زندگی کا منصب یہ ہے کہ وہ مشین کو اپنے مقصدوں کے لئے برتے۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کو اپنے اوپر قابو پانے کا موقع دے جیسا کہ جدید صنعتی تہذیب میں نظر آتا ہے۔ میکانکی حالت چونکہ تخلیق و ایجاد کے خلاف ہے، اس لئے زندگی کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر مشین زندگی کی خادم اور اس کے تخلیقی مقصدوں کے حصول کا ذریعہ بنے تو اس سے انسان کو جذباتی تعلق پیدا ہو جائے گا اور اس کی دھڑکن میں وہ معنی تلاش کرنے لگے گا۔ جب وہ اسے اپنا دوست سمجھے گا تو اس سے محبت بھی کرے گا۔

میکانیت مادّی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ ہر صورت میں آرٹ اس کو اپنا حریف خیال کرتا ہے جس طرح جدید صنعتی عہد کی مادی میکانیت زندگی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ اسی طرح مذہبی اور سیاسی عقائد کی بے کیفی اپنی میکانیت کے باعث دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ جب یہ عقائد زندگی کے ہر عقدے کا حل بلند آہنگی سے پیش کرتے ہیں تو در اصل وہ اپنے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی یہ بلند آہنگی اُن کی میکانیت کا عکس ہوتی ہے۔ غالبؔ نے اسی قسم کی بے کیف میکانیت کے لئے "تکرار تمنا" کی دلفریب ترکیب استعمال کی ہے، میکانیت کی ناخوشگواری اصل میں اس کی بے توفیق اور بے مزہ تکرار ہی کے سبب سے ہوتی ہے جو ایجاد اور تخلیق سے بیگانہ ہوتی ہے۔ شوق کی واماندگی جب پناہوں کی تلاش میں ہو تو دیر و حرم وجود میں آتے ہیں جو میکانیت کی رمزی علامتیں ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ "تکرار تمنّا" واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

یہ دیر و حرم تمناؤں کی تخلیق سہی لیکن ایک وقت آتا ہے جب اُن کی

میکانیت ایجاد و تخلیق کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ اہلِ نظر ان کی قدروں کو بامعنی بنانے کے لئے ان کی بازآفرینی کریں جو جذب و شوق کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح جذبے کی پرانی وحدت سے نئی وحدت جنم لیتی ہے انسان کے ذہنی اور جذباتی تجربوں کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ ذہن نظم چاہتا ہے لیکن جب اسے قائم کر لیتا ہے تو تنقید کے حربے سے اس میں توڑ پھوڑ شروع کر دیتا ہے تاکہ میکانیت کی بے کیفی دور ہو۔ اس طرح جذبہ اور تخیل اپنے تجربوں کو برابر نئے نئے معنی پہناتے رہتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو دل کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور زندگی کی حقیقت کے نئے نئے پہلو اس کی میکانیت کو دور کرتے رہتے ہیں۔ غرض کہ آرٹ مشین سے خاص حالتوں میں جذباتی تعلق قائم کر سکتا ہے لیکن میکانیت سے اس کی کبھی نہیں نبھ سکتی۔ اس واسطے کہ وہ نہ صرف ایجاد و تخلیق کی نفی ہے بلکہ تخیل کی بھی نفی ہے۔

رمزی علامتیں جامد یا سکونی نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ حرکت اور تغیر کی حالت میں رہتی ہیں۔ کوئی ایسے قواعد نہیں بنائے جا سکتے۔ جن کے مطابق اُن کے استعمال کو داخلی یا خارجی تجربوں کے لئے مخصوص کیا جا سکے۔ ہر حالت میں اُن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے اس تعلق میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جو ہماری خودی اور عالم میں پایا جاتا ہے۔ جب ہم اپنے کسی تجربے کے اظہار کے لئے علامتی اسلوب اختیار کرتے ہیں تو عالم کو اس طرح نہیں دیکھتے جیسا کہ اس سے پہلے دیکھتے تھے۔ علامتی اسلوب ہمارے شعور میں بھی ایک پراسرار تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اعلیٰ درجے کے مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر کو دیر تک دیکھتا رہے جس میں فطرت کی منظر کشی کی گئی ہو اور اس کے فوراً بعد وہ فطرت پر نظر ڈالے تو وہ کچھ بدلی سی نظر آئے گی۔ اور اسے وہی رنگ اور خطوط ہر طرف نظر آئیں گے جو اُس نے تصویر میں دیکھے تھے

اسی طرح شاعر علامتی انداز میں حقیقت کی رُوح کو اس طور پر جذب کر لیتا ہے کہ اس کے کلام کا سننے والا اس کے تجربے میں شریک ہو جاتا ہے۔ چاہے یہ تجربہ داخلی ہو یا خارجی۔ شعر کا موضوع چاہے کچھ ہو۔ استعارے اور کنائے کی تصویر کشی سے معانی کی جو نئی دنیا جنم لیتی ہے اس میں چونکا دینے والا اچانک پن پایا جاتا ہے۔ وہ اچھوتی اور بے مثل ہوتی ہے۔ شعر کو سننے والے یا پڑھنے والے لفظوں کے ان تعلقوں اور معانی کی ان کیفیتوں کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں جو شاعر کے وجدان میں گزر چکی ہیں اور اس طرح خود اپنے تخیل اور جذبے میں بہ نسبت پیشتر کے زیادہ وسعت اور گہرائی محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی جمالیاتی حس میں تیزی آجاتی ہے جو پہلے نہیں تھی اور اس طرح اُن کی قدروں کی دنیا میں قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ شعر و ادب نے اگر یہ کام خوبی سے انجام دے دیا تو اُن کی کامیابی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

شاعرانہ قدروں کا قطعی تعین تو کبھی نہیں ہوگا۔ فطرت کے ساتھ دائمی آویزش سے خود حقیقت کی حدود ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتی رہتی ہیں مطلق حقیقت تک ہماری رسائی کبھی نہیں ہو سکتی۔ نہ علم و عمل کی دنیا میں اور نہ تخیل و جذبے کی دنیا میں جس سے شعر عبارت ہے۔ علم و عمل کی طرح جذبے کی دنیا میں بھی اندرونی کشمکش کی ہر منزل پر حقیقت کے نئے رخ ظاہر ہوتے رہتے ہیں جو الجھاؤ کے لبادے میں لپٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ الجھاؤ حقیقت کو مالا مال کرتے ہیں۔ بغیر اُن کے حقیقت سادہ اور بے رنگ ہو جائے گی۔ شاعر اپنے تجربے کی پیچیدگیوں سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ اُن کا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جذبے کو سادہ بنانا اس کا مسخ کرنا ہے۔ اس لئے وہ اس کو اس کی اصلی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ علامتی اور رمزی طور پر اس کو گرفت میں لائے۔ وہ اس کا شعوری اور منطقی تجزیہ نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ تجزیئے سے جذبے کی حقیقت فنا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اس حقیقت کو علامتی طور پر گرفت میں لاتا

ہے تو نہ وہ پوری طرح داخلی ہوتی ہے اور نہ پوری طرح خارجی بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک تعلق کی سی مبہم صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لئے اس کا اظہار بھی مبہم ہو جاتا ہے حقیقت کا شاعرانہ تجربہ بظاہر چاہے کتنا ہی بے ربط اور بے ترتیب کیوں نہ ہو لیکن اس کے اندر ایک طرح کی وحدت چھپی ہوتی ہے جس کی سمائی رمز و استعارے کے پھیلاؤ میں بخوبی ہو جاتی ہے جس سے ہمارا ذوق لذت پاتا ہے۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ آرٹ کی تخلیق میں سماجی محرک کام کرتے ہیں مگر آرٹ ایسا جمالیاتی تجربہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس کے اندرونی خدوخال کا جائزہ لیا جائے تو سماجی محرکوں کے نقش و نگار نظر آئیں گے۔ جس طرح اخلاق میں فرد عقل و ادراک کے ذریعے جماعتی انا میں شریک ہوتا ہے اسی طرح آرٹ میں جذبے کے اشتراک سے انفرادی انا جماعتی انا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ گوناگوں جماعتی تعلقات جذبے اور تخیل کو ابھارتے اور ان کی تہذیب میں مدد دیتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کا احساس و تاثر وہ ہے جس میں جماعت شرکت کر سکے۔ ایسی مسرت جو شخصی ہو بہت جلد فنا ہو جاتی ہے لیکن وہ مسرت جو غیر شخصی اور اجتماعی نوعیت کی ہے زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دائمی تو وہ بھی نہیں ہوتی لیکن نسبتاً اس میں زیادہ پائداری پائی جاتی ہے۔ جس آرٹ میں سماجی محرک کام کرتے ہیں اس میں سادگی اور اخلاص ہوتا ہے۔ وہ فطرت کی طرح وسیع ہوتا ہے کہ جو چاہے اس سے لطف اندوز ہو لیکن لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ غیر شعوری طور پر وہ اپنی جذباتی زندگی کا تزکیہ بھی کر لیتا ہے۔ جدید سائنٹیفک دور کا اقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہی آرٹ پنپے اور ترقی کرے جو حقیقت میں گہرائی پیدا کرتا ہو۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ زندگی کے صرف مکروہ پہلو کو دیکھا جائے اور اس کو حقیقت کا معیار مانا جائے۔ سائنس جس طرح اخلاق کی دشمن نہیں ہے اسی طرح حسن کی بھی دشمن نہیں۔ ہاں وہ کسی ایسے مقصد

سے تشفی نہیں پا سکتی جو باطل ہو، غیر حقیقی ہو، ادنیٰ اور مبتذل ہو۔ دراصل اگر غور سے دیکھا جائے تو جدید سائنس نے عالم کا جو تصور قائم کیا ہے اس میں لاکھوں درجے اس سے زیادہ شعریت ہے جو کلاسکی ادب میں ملتی ہے۔ خود ارتقاء کا تصور کس قدر شاعرانہ ہے۔ سائنس کی دریافتوں کے اخلاقی اور انسانی مضمرات سے سچا شاعر کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ اس زمانے کے فن کار اور شاعر کا فرض ہے کہ جدید سائنس کی روح کو جذب کرکے اس کو اپنے جذبے اور تخیل کا جز بنائے۔ اس طرح وہ حقیقت میں گہرائی پیدا کردے گا اور اُس کے دل میں فطرت کی وسعتوں کی سمائی ہو جائے گی اس طرح اُس کو اس بات کا بھی احساس ہوگا کہ خود حقیقت سے زیادہ پُراسرار شے کوئی نہیں۔ اسی سبب سے وہ اس کے لئے جاذب نظر ہے۔

آرٹ تخلیق ہے اور سائنس تفہیم۔ اس لئے آرٹ پوری طرح تو کبھی بھی سائنس نہیں بن سکتا۔ شاعر کے جذبے اور وجدان کو ادراک و فہم متاثر تو کر سکتے ہیں لیکن اُن کی گدی پر خود براجمان نہیں ہو سکتے۔ ہاں سائنس جب اپنے بلند ترین مقاموں پر پہنچتی ہے ہے تو آرٹ کے مثل ہو جاتی ہے۔ وہاں وہ بھی وجدان کے سرچشموں سے سیرابی حاصل کرتی ہے اور عقل و وجدان کا فرق و امتیاز مٹ جاتا ہے اور ادراک و علم ہمارے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔ لیکن آرٹ یا شعر میں سوال کا جواب نہیں دیا جاتا بلکہ اس جگہ بات کو ختم کردیا جاتا ہے، جب سننے والا اپنی بات کا جواب سننے کے انتظار میں ہوتا ہے۔ شعر جس طلسم کدے کی تخلیق کرتا ہے وہاں تشفی نہیں ہوتی۔ ہاں تحیر کی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ سننے والے کا تخیل بہت سی کمیوں کو اپنے طور پر پورا کرلیتا ہے۔ تحیر بجائے خود اک قدر ہے۔ اگر شاعر نے اپنے پڑھنے والے یا سننے والے کے تحیر کو اکسا دیا تو اُس نے اپنا کام انجام دے دیا۔ اس کو فطرت یا انسانی زندگی میں قدم قدم پر حیرت میں ڈالنے والے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ان شعروں میں اس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے

پہلا شعر فطرت کی عجوبہ زائیوں کا بیان ہے ؎

پیاسے تو ہیں جاں بلب گرا سے ابرِ کرم
دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی (مرزا یگانہ)

دوسرا شعر انسانی زندگی کی حیرت افزائیوں پر ہے ؎

بہت لطیف ہے شاعر مذاقِ چارہ گری
جہاں پہ زخم نہیں ہے وہاں پہ مرہم ہے (شاعر لکھنوی)

سائنس کے پُراسرار حقائق شاعر کے لئے ہمیشہ خام مواد فراہم کرتے رہیں گے جنہیں وہ اپنے ڈھب سے استعمال کرے گا۔ اور کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ اس طرح کیوں استعمال کیا؟ سائنس میں تخیل کی اتنی کمی نہیں کہ وہ خواہ مخواہ شاعر سے یہ سوال کرے۔ اس کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ وہ اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھتی ہے بیسویں صدی کی سائنس اپنی انیسویں صدی کی بہن کی طرح روکھی اور بے مروّت بھی نہیں دوسروں کا پاس لحاظ کرتی ہے۔ وہ شعر سے کیوں پوچھنے گی کہ یہ کیا ان نزاعیاں میں میری طرح جوں کی توں دو ٹوک بات کیوں نہیں کرتے۔ پھاوڑے کو پھاوڑا کیوں نہیں کہتے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے اس کا جواب یہی ملے گا ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

آرٹ یا شاعری کی جب اجتماعی توجیہ کی جاتی ہے تو ذہنی اور فکری تصورات ایسے چھا جاتے ہیں کہ انفرادیت میں تخیل اور جذبے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے وہ نظر انداز ہو جاتی ہے۔ غالب کے کلام کو اگر صرف اس نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ مغلیہ سلطنت کے زوال آمادہ جاگیری نظام سے وابستہ تھے تو یہ بات یک طرفہ ہوگی۔ غالب کی انانیت اور ان کی شان امارت طبقاتی زندگی کا عکس سہی

لیکن میر صاحب کی انانیت کی کیا توجیہ کیجئے گا جو ایک متوسط طبقے کے فرد تھے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی انانیت غالب کی انانیت سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی سائنٹیفک توجیہ اکثر میکانکی، بے جان اور بے کیف ہو جاتی ہے جس میں من مانے طور پر بندھے ٹکے اصول مدنظر ہوتے ہیں جو زندگی کی پیچیدگی پر پوری طرح سے حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان سے کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ انفرادیت میں تخیل اور جذبے کے نقش ونگار بھی خارجی احوال کا عکس ہوتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جذبے اور تخیل پر خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے۔ اور اگر کسی شاعر کے گرد و پیش کے حالات کا علم ہو تو اس کے کلام کو سمجھنے میں ایک حد تک مدد ملے گی۔ اگر یہ حالات بدل جائیں گے تو شاعر کے تجربوں میں بھی یقینی طور پر تبدیلی پیدا ہو گی۔ قحط سالی کے زمانے میں عشق و عاشقی کے مشغلے میں اگر کمی آ جائے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ شیخ سعدیؒ نے اسی نفسیاتی حکمت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور عام طور پر انسانوں کی نفسی کیفیات کو دیکھتے ہوئے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اس کی فوری جبلّی ضرورت اس تقاضے پر حاوی آ جاتی ہے جو فوری نہیں ہے۔ آخر الذکر کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے ان کا احساس مبہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قحط کے زمانے میں جبلّت کی ساری قوتیں روٹی کے حصول پر صرف ہوں گی۔ یا اگر کسی کو دشمن سے نبٹنا ہو جو جان کا لاگو ہو تو ایسی حالت میں جنسی جبلّت عارضی طور پر دب جائے گی۔ ایسا ہونا قدرتی ہے اور زندگی کی حکمت کا یہی تقاضا ہے۔ ایسا ہونے کی ضرورت اس واسطے ہے تا کہ ارادے اور ہیجان کی سب

توانائیاں فوری مقصد کے حاصل کرنے میں موثر بن سکیں اور ایسا نتیجہ برآمد ہو جو مجموعی طور پر زندگی کو ترقی اور فروغ دینے والا ہو۔ خارجی عالم میں زندگی کا یہ عمل لازمی طور پر افادی پہلو لئے ہوتا ہے جو ہمارے شعور کی سطح پر چھا جاتا ہے۔

ممکن ہے قحط سالی کے زمانے میں یار لوگ عشق کو فراموش کر دیں لیکن قحط کے کم ہوتے ہی دبی ہوئی خواہشوں کے چشمے ابل پڑیں گے اور اُن کی شدت معمول سے زیادہ ہوگی۔ اور غالبؔ کا تو یہ خیال تھا کہ جذبہ خارجی احوال کے آگے چاہے وہ کیسے ہی نامساعد اور ہمت شکن کیوں نہ ہوں اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اس کے اسباب خود اس کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس شعر میں اسی جانب اشارہ ہے ؎

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں آئینۂ خواب گراں شیریں

فارسی اور اردو شاعری میں فرہاد ایک علامتی ہستی ہے۔ وہ ایک انوکھا مزدور ہے۔ وہ پیٹ کے لئے نہیں بلکہ عشق کے لئے مزدوری کرتا ہے۔ اس کے عمل نے زندگی کی معاشی تعبیر کو باطل ثابت کر دیا۔ غالبؔ نے ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی ایک جگہ فرہاد کی مزدوری پر چوٹ کی ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کا عشق فرہاد کے عشق سے زیادہ بے لوث ہے ؎

عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیٔ فرہاد نہیں

دراصل غالبؔ اور شیخ سعدیؒ کے خیال میں تضاد نہیں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں میں اصلیت اور صداقت موجود ہے۔ بڑا مفکر یا حساس فن کار اپنے تجربے میں ایک صداقت محسوس کرتا ہے جس سے زندگی کے کسی خاص رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ صداقت اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ جب کسی سطحی

علم والے کے کان میں اس کی بھنک پہنچتی ہے تو وہ اسے ایک مستقل نظریہ بنا دیتا ہے جو اس کے نزدیک قانونِ فطرت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ہماری شاعری میں سیاسی اثرات کے تحت ایک خاص قسم کی حقیقت نگاری نے راہ پائی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عشقِ بتاں کے ساتھ فکرِ معاش کا مسئلہ زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ شعر زندگی کی آئینہ داری اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ اس میں تمدنی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے میں سمونے کی صلاحیت ہو۔ انسانی زندگی کے پیچیدہ نظام میں معاشی عمل کی اہمیت واضح ہے۔ اس مضمون میں بھی احساس کی اصلیت اور صداقت اسی طرح پیدا کی جا سکتی ہے جس طرح عشق و عاشقی کے مضمون میں۔ اب تک ہمارے شاعروں نے تجمل حسین خاں کے عیش کا ذکر کیا۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب تجمل حسین خاں کے عیش میں کلو اور کلیان بھی برابر کی شرکت کے دعویدار ہیں[1] اس حقیقت کو کوئی ادیب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے غزل کے مقابلے میں نظم میں معاشی نوعیت کے مضمون زیادہ روانی اور خوبی سے ادا ہو سکیں لیکن غزل میں بھی اُن کی نسبت اشارے آجائیں تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن بس اس کا خیال رہے کہ شعریت مجروح نہ ہو۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو اگر شاعر نے اپنے حسنِ ادا سے شعریت

---

[1] غالبؔ کے ممدوح نواب تجمل حسین خاں والیٔ فرخ آباد کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح میں غالبؔ نے ایک قطعہ لکھا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

کلو غالبؔ کا خاص نوکر تھا۔ کلیان بھی اُن کے ملازم کا نام ہے جو کہار تھا۔

کو برقرار رکھا تو اس کے کلام کا پایہ بلند رہے گا۔ جس طرح کوئی لفظ حقیر نہیں جسے شعر میں نہ استعمال کیا جا سکے۔ اسی طرح کوئی موضوع ایسا نہیں جسے شاعر نہ برت سکے۔ ممکن ہے تنگ نائے غزل کی نسبت نظم میں سماجی اور اخلاقی مضمون زیادہ کھپ سکیں۔ اسی لئے آئندہ ہماری زبان کی توسیع اور ترقی میں نظم جو کام کرے گی وہ شاید غزل نہ کر سکے۔

سائنٹیفک تنقید کی اصطلاح آج کل بہت کچھ سننے میں آرہی ہے۔ اس سے غالباً مراد یہی ہے کہ خارجی احوال سے شعر و سخن کو پرکھا جائے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا خارجی احوال کے مقابلے میں اس قسم کا ردعمل ہوتا ہے جیسے ایمبا کا۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ بعض لوگوں کو اس میں شبہ ہے کہ کیا ادبی تنقید واقعی سائنٹیفک ہو بھی سکتی ہے؟ کچھ عرصہ قبل اجتماعی علوم نے بھی بزعم خود دعویٰ کیا تھا کہ ہم سائنٹیفک ہیں۔ ان کے اس دعوے کا پول کھل چکا ہے۔ آج عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات یہ دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ ان علوم کو اپنی نارسائیوں کا روز بروز احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا معاشرتی اور معاشی قانون طبیعیات کے قانونوں کی طرح اٹل ہیں؟ اس سوال کا یہ جواب ہے کہ انسانی اعمال کے محرک اور ان کی نوعیتیں اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہیں کہ سائنس کی طرح انہیں سادہ اجزا میں تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ربط و ترتیب اسی وقت قائم ہے جب کہ ان کے احوال و اسباب کے سلسلے کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس نفسیاتی جائزے میں بھی سائنس کی سی بے لوثی کبھی نہیں آسکتی۔ لیکن پھر بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ادب کی طرح اجتماعی علوم میں طبیعی علوم کی طرح بے جان اور بے حس اور بے ارادہ مادے سے بحث نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان سے بحث ہوتی ہے، جو شعور اور ارادہ اور خواہشیں رکھتا ہے اور جس کو اپنے احوال میں ایک حد تک تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ وہ مجبور محض نہیں ہے۔ اور یہی عقیدہ اس کی اخلاقی بصیرت کا

ضامن ہے۔ اس لئے زندگی کے تمام مظاہر کی تحقیق علمی بھی ہے اور فنی بھی بعض اوقات زندگی کو سمجھنے کے لئے ان غیر عقلی اور جبلی رجحانوں کا کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے جو کسی خاص زمانے میں اجتماعی یا انفرادی زندگی میں محرک ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں اسباب کا سلسلہ اتنا سادہ نہیں ہوتا جتنا فطری مظاہر میں پایا جاتا ہے۔ تجزیہ فطری علوم میں ممکن ہے لیکن انسانی زندگی میں، جو پیچیدہ اور متنوع ہوتی ہے ایک سبب سے نہیں بلکہ اسباب کے مجموعی نتیجے سے ہم بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ سائنس اخلاقی طور پر غیر جانبدار (نیوٹرل) ہے۔ لیکن عمرانی مسائل پر غور کرنے والا اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرنے والا اخلاق سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا۔ سائنس اقدار سے نابلد ہے۔ اجتماعی زندگی اقدار سے وابستہ ہے، اس لئے اس پر سائنٹیفک طریق تحقیق کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی پر تنقید کی جائے گی تو تنقید کرنے والا اس زندگی سے الگ نہیں ہوتا بلکہ خود اس کا جزو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اس کا نقطۂ نظر اتنا معروضی ہو سکے جتنا فطرت کی تحقیق کرتے وقت ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا درست ہوگا کہ ادبی تنقید میں شخصی عنصر کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس کا انحصار تنقید کرنے والے کے ذوق پر ہے کہ وہ اسے بے تکے پن سے ظاہر نہ کرے۔ داخلی اظہار کے اسی ذوق اور ضبط کا نام ادب ہے۔

خارجی احوال کے علاوہ فن کار کی روحانی آزادی کو بھی ماننا چاہئے۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کی تخلیق کسی بندھے ٹکے اجتماعی پروگرام کے تحت عمل میں نہیں آتی۔ جس میں انفرادیت کا جوہر موجود نہ ہو۔ جن قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا معیار اچھا خاصا بلند ہے ان میں بھی فن کار اپنے آرٹ کو عوام کی ذہنی اور جذباتی سطح پر نہیں لاتا۔ بلکہ عوام کو اپنے بلند معیار تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی بڑے فن کار یا شاعر ہوئے ہیں انہوں نے عوام سے اپنا رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے

معیار کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھا ہے کہ بغیر اس کے زندگی کی تخیلی ترجمانی ممکن نہیں

وہ جانتے ہیں شیکسپیئر، گوئٹے اور غالب اپنے اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کس قدر بلند ہیں۔ گرد و پیش کے اثر کے باوجود اُن کے کلام میں کس قدر عالمگیریت ہے۔

جس طرح سیاست و معیشت میں بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد کا سوسائٹی سے کیا تعلق ہے، اسی طرح آرٹ کا بھی یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ جدید تہذیب کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ ذہن کو میکانکی پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ فن کار سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بنے بنائے سانچوں کے مطابق اپنی تخلیق کرے تاکہ پہلے سے مقرر کی ہوئی سماجی ضروریات کی تکمیل ہو۔ یہ سانچے ایسی معاشی قدروں پر مبنی ہوتے ہیں جن سے فن کار چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ وہ معاشیات کے رسد و طلب کے قانون کی پابندی اپنے فکر و فن میں بھی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے تمدن میں کام کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انسان کی رُوح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ انسان اپنے کام میں کوئی تخلیقی لطف اور جوش نہیں محسوس کرتا۔ آج کسی کارخانے میں مشین کا کام کرنے والے کی حیثیت ازمنۂ وسطیٰ کے کاریگر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو اپنی کاریگری میں اپنی شخصیت کا ایک جز رکھ دیتا تھا۔ آج مشین پر کام کرنے والا صرف ایک پرزہ یا مشین کے ایک حصّے کی نسبت واقفیت رکھتا ہے اور اسی حد تک اپنے کام کو محدود رکھتا ہے۔ اس کے کام کی تخصیص پوری مشین سے بھی اس کا کوئی عقلی یا جذباتی تعلق نہیں قائم ہونے دیتی۔ اسی لئے اس زمانے کا مزدور یا کاریگر اپنے کام میں کوئی لطف یا شوق نہیں محسوس کرتا۔ اس کا کام بھی میکانکی ہو کر رہ گیا ہے جس میں حسن نام کو نہیں۔ اسی لئے جدید تمدّن کی مشقت انسانی صلاحیتوں پر بڑا ظلم ہے۔ اس تخصیص میں کتنی ہی افادیت کیوں نہ ہو لیکن اس سے انسانی رُوح کی پیاس نہیں

بجھتی یہی وجہ ہے کہ انسان اس سے فرار کی شکلیں اختیار کرتا ہے جو نت نئے انقلابوں کا روپ دھارتی ہیں۔ اشتراکی سماج بھی اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نہیں پیش کر سکا جسے تشفی بخش کہا جا سکے۔ انسان کی تخلیقی آزادی پر اس نے بھی طرح طرح کی روکیں لگا دی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادبی تخلیق یہاں بھی سماجی پابندیوں سے دب کر رہ گئی ہے۔ ادب کو یقیناً سماج سے بے تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر کسی سماج میں فن کار کو پوری آزادی میسر نہیں تو وہ جمالیاتی قدروں کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ فن کاری کا ایک انتہائی نظریہ یہ تھا کہ وہ موسیقی ہو جائے اور اب دوسرا نظریہ یہ ہے کہ وہ صحافت بن جائے۔ جدید فن کاری کو ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اپنی راہ نکالنی پڑے گی۔ اگر وہ انسانی قدروں کو فروغ دینا چاہتی ہے۔

شعر کی تخلیق طلسمی دنیا میں ہوئی۔ مذہب کے دامن میں اس نے ابتدائی نشوونما پائی۔ عقل و شائستگی نے اس کے جوبن کو نکھارا اور عشق و محبت نے اس کو مستی اور سپردگی کا مواد فراہم کیا۔ اب پروپیگنڈے سے اس کی جان پر بن آئی ہے جس سے اس کا بچانا ضروری ہے۔ جدید تمدن کا اوچھا پن شاعر اور ادیب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ اس کے خارجی ہیجانات میں ایٹون کی سی کیفیت ہے جس کے سبب سے ذہن اور شعور ماؤف ہو رہے ہیں۔ شاعر اور فن کار ان حالات میں کیا کریں؟ اگر وہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اس کی رو میں بہہ جائیں تو وہ اپنی اندرونی پکار پر لبیک نہیں کہتے بلکہ خارجی حالات کا کھیل بن جاتے ہیں۔ جدید انسان تمدن کے خالق کی حیثیت سے خود اپنی مخلوق کی پیچیدگیوں اور گتھیوں سے گھبرا اٹھا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے فرار چاہتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں۔ جس طرح انسان کے جسم کی بیماریاں اس کے ساتھ مرتے دم تک ہیں، اسی طرح اس کی روح کی بیماریاں بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ وہ اپنی روح سے کتنا ہی بچنا اور چھپنا چاہے وہ نہیں چھپ سکتا۔

ادب کا کام ہے کہ اسے نہ چھپنے دے۔

ہر اعلیٰ درجے کے فن کار کی تعلیم میں حقیقت کی بدلتی ہوئی شان ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ کسی بندھے ٹکے اصول کا پابند نہیں کیا جا سکتا جو کسی عارضی سیاسی یا سماجی مصلحت کا نتیجہ ہو۔ وہ اپنے گرد و پیش کی آئینہ داری کرتے ہوئے بھی اس کی پرورش اپنے تخیل میں اس طور پر کرتا ہے کہ مستقبل کے امکان اجاگر ہو سکیں۔ وہ انسانیت کی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی زندگی کا دلدادہ ہوتا ہے جس میں حقیقت کے مختلف رنگوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر فن کار کی روح آزاد نہیں تو وہ نقالی کا کام تو کر سکتا ہے لیکن تخلیق کا فرض انجام نہیں دے سکتا۔ جب وہ سماجی انقلابوں میں سے گزرے گا تو اُن کے تیج و خم کو اپنی رُوح سے وابستہ کرے گا تاکہ وہ تخلیق کے محرک بنیں۔ چونکہ زندگی کی دائمی حرکت اور اس کی بے کمالی اور ناتمامی پر اس کی نظر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو خارجی حقیقت سے کہیں زیادہ بلند اور برتر تصوّر کرتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کو غور سے دیکھتا ہے لیکن اس کو اپنا وجود زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے ذریعہ کائنات کی خواہشوں اور مسرتوں اور غموں میں شرکت کرتا ہے۔ اگر فن کار کو خود اپنے وجود کی اہمیت کا گہرا احساس ہے تو اسی وقت ممکن ہے کہ اس کو کائنات کی اصلیت اور صداقت کا بھی گہرا احساس ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تخیل اور جذبے کے اندرونی تجربے میں خارجی حسّی تجربے سے زیادہ صداقت اور شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ تخیل کافی بالذات بن جاتا ہے اور اپنے اوپر اُسے اتنا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنی رمزیت میں خارجی حقیقت کو سمو سکے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل کی داخلی حقیقت باہر کی ناتمام اور غیر مکمل حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے۔ یہ جذبے اور تخیل کی ہم آمیزی کی کرامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا فن کار جب کسی معمولی اور جانی بوجھی بات کو بیان کرتا ہے تو اس کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے اور

اس میں عجیب انوکھاپن اور ایچ پیدا ہو جاتی ہے۔

جدید زمانے کا انسان اور اُس کا تجربہ

جدید زمانے کا انسان آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جس منزل میں ہے وہاں وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے بھی کہ زندہ رہا جائے۔ اس میں ایک عجیب جھنجھلاہٹ، اُلجھن اور بیزاری کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ فرد اپنی شخصیت کھو چکا ہے۔ بچا ہے اس کا تعلق سرمایہ داری کے نظام سے ہو یا اشتراکی نظام سے۔ قدروں کا احترام اٹھ گیا۔ تلوّن، برہمی اور بے اعتباری کا ہر طرف دور دورہ ہے، جس کا اظہار خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہو رہا ہے۔ دل عقیدت اور محبت سے خالی ہیں۔ بغیر عقیدت کے محبت کا نرم اور نازک پودا کیسے پنپ سکتا ہے؟ آرٹ اور ادب کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی کے کھوئے ہوئے توازن کو پھر سے قائم کرنے میں مدد دیں۔ زندگی کی بے وقاری کو دُور کریں۔ انسانیت کی محبت کو عقیدت کی بنیادوں پر استوار کریں۔ صنعتی دور کے بعد نہ صرف انسانی زندگی بلکہ خود فطرت اپنے اصلی حُسن سے محروم ہو گئی ہے۔ آرٹ دونوں کے لٹے ہوئے حسن کو پھر بحال کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔ علم اگر اس کی پوری کوشش کرے گا تو بھی اس کو کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ وہ اور الجھاؤ پیدا کر دے گا۔

اب تک مغربی ادب میں کلاسکی ہیومن ازم کے اثرات کام کر رہے تھے لیکن کچھ عرصے سے نئے محرک کارفرما ہیں۔ جن کے اثر سے نہ زندگی بچ سکتی ہے اور نہ ادب۔ جدید زمانے کا فن کار پُرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں بنانا چاہتا ہے۔ اس واسطے کہ پُرانی دنیا کی جگہ نئی دنیا بسانے کا اسے حوصلہ ہے۔ وہ صرف جمالیاتی

طلسمی کیفیت سے متاثر نہیں بلکہ وہ زندگی کے مختلف اور پیچیدہ مسائل کی نسبت اپنے حل پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دعوے میں کامیاب نہیں معلوم ہوتا۔ امیجسٹ سمبولسٹ اور سرریلسٹ فن کار اب تک کوئی مکمل فلسفۂ حیات نہیں پیش کر سکے۔ وہ پرانی قدروں کی جگہ کوئی نئی قدریں نہیں لا سکے جو زندگی کے مہیب خلا کو پر کر سکیں۔ یہ خلا روز بروز مہیب سے مہیب تر ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے حقائق میں جو تعلق پائے جاتے ہیں اُن کو ذہنی طور پر درہم برہم کرنا کافی نہیں جب تک کہ اُن کی جگہ دوسرے حقائق نہ لائے جائیں، جو زندگی پر حاوی ہوں۔ سرریلسٹ فن کار تحت شعوری تلازموں کو شعور پر ترجیح دیتے ہیں۔ اچھا ترجیح دیں انہیں اختیار ہے لیکن نتیجہ کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ کسی چمن کے ایک تختے میں وہ کسی حسین مجسمے کو دیکھیں۔ انہیں وہ مجسمہ کسی غلاظت کے ڈھیر میں پڑا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کبھی ایسا اتفاق ہو جائے کہ حسین مجسمہ غلاظت کی آلودگیوں میں لتھڑا نظر آئے لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا زندگی کا یہ معمول تو نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی مانا کہ سرریلسٹ فن کار کو ایسی تحت شعوری کیفیت محسوس کرنے کا حق ہے جس میں خواب کی سی بے ترتیبی اور الٹا پن پایا جاتا ہو۔ ع

ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تحت شعوری کیفیت محسوس کرنے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ سرریلسٹ شاعروں کی انفرادیت پسندی کے ڈانڈے نراج سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان کے ہاں تحت شعور میں اس قدر غلو برتا گیا ہے کہ گویا عقل و فکر کو زندگی میں کچھ دخل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فن کاروں کے یہاں نہ صرف اخلاقی بلکہ جمالیاتی قدریں بھی باقی نہیں رہیں۔ اُن کے بیان کی بے ترتیبی اور ایچ پیچ مضمون کو اتنا تنگ و تاریک بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والے

کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ لفظوں کی بھول بھلیوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ ان سے باہر نکلنے کا راستہ اسے نہیں ملتا۔ یہی حال سمبولسٹوں کا ہے۔ بودلیر، ریمبو، ورلین، ملارمے اور اس طرز کے دوسرے شاعروں نے جو چیستانی ابہام کی بنا ڈالی اس کا اثر اب تک باقی ہے۔ پال ویلیری نے اپنی سنجیدگی سے ان سمبولسٹوں کی بے راہ روی کو ہر چند دور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس طرز کے پیرو لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور زندگی کی حقیقت سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ کم وبیش یہی کیفیت امیجسٹ کی ہے۔ ان کے خیالی تلازموں تک رسائی حاصل کرنا کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہے۔ بیان کی بے تکلفی تو انہیں چھو کر بھی نہیں گئی لیکن اُن کے عالمِ تصور میں بعض ایسی صداقتیں ہیں جن کی طرف سے ادب اور شعر آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ غرض کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ادب کے ان مختلف طرزوں اور دبستانوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارا ادب فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ذوق کی رہنمائی شاملِ حال رہے اور نقالی کا شیوہ نہ اختیار کیا جائے۔ مغربی ادب کی ان مختلف تحریکوں سے ہم انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن پیروی کسی کی بھی نہیں کرنی چاہیئے۔

مغربی ادب کے جدید رجحانوں میں سینما، ریڈیو اور اخباروں سے زیادہ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ سینما کی ٹیکنیک یہ ہے کہ کسی جذباتی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے مختلف واقعات کے الگ الگ ٹکڑے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان ٹکڑوں میں مبہم سا تعلق ہوتا ہے جو پوری داستان کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ریڈیو اور اخبار بھی زندگی کی تصویر کے الگ الگ ٹکڑے پیش کرتے ہیں۔ سمبولسٹ شاعر کی علامتوں اور امیجسٹ شاعر کی لفظی تصویروں میں کچھ اسی قسم کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کی باتیں ان مل، بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت

میں ان میں تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق جیسے تحت شعوری نظاموں میں پایا جاتا ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں عقل و شعور بھی تحت شعور کی نقالی پر اتر آئے ہیں
لیکن کیا واقعی شعور اور تحت شعور کے بیچ میں ایسی خلیج ہے جو پر نہیں ہو سکتی؟ کہیں یہ تو
نہیں کہ جس طرح وجدان اور عقل کلی کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح شعور اور تحت
شعور بھی ایک دوسرے سے اتنے دور نہ ہوں جتنا کہ تحلیل نفس کے ماہر ظاہر کرتے
ہیں۔ جدید تمدن و تہذیب کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس طرح اس نے وجدان اور
عقل کے الگ الگ خانے بنائے اسی طرح اب شعور اور تحت شعور کو ایک دوسرے
سے بالکل بے تعلق خیال کیا جا رہا ہے۔ جدید تہذیب کی بنیادی بے آہنگی یہی ہے
آرٹ اور ادب میں ایک طرف تحت شعور کے علم برداروں کی جماعت ہے جس میں
سمبولسٹ، امیجسٹ اور سرریلسٹ شامل ہیں۔ جن کے نزدیک انفرادیت یا
نرگسیت ہی ادب کی جان اور ایمان ہے اور دوسری طرف اشتراکی نقاد ہیں جو شعور
وعقل کے اجتماعی معیار کے علاوہ ادب اور آرٹ کو کسی اور کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہتے
اور اس کو سائنس کا جز بنا دینے پر مصر ہیں۔ جدید تمدن کی اندرونی کشاکش انہی رجحانوں
کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ آج یہ دونوں رجحان ہمارے ادب میں بھی آ چکے ہیں جن کی وجہ
سے ہمارے فن کاروں کی ذہنی الجھنیں بڑھ گئی ہیں۔ یہ کوئی افسوس کی بات نہیں مجھے
یہ توقع ہے کہ یہ الجھنیں ہمارے ادب کو مالا مال کریں گی اور اُن کی بدولت ہمارے
فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوں گی۔ جس طرح بیسویں صدی کے انگریزی زبان کے
سب سے بڑے شاعر ییٹس کے یہاں ان سب رجحانوں کے امتزاج سے ایک
خاص نزاکت اور لطافت اور گہرائی پیدا ہوئی۔ اسی طرح ہمارا ذوق بھی ان مختلف رجحانوں
میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔

تحلیل نفس کے ماہروں نے شعر اور زندگی کی جو توجیہ پیش کی ہے اس کی رو سے

ذہن کو شعور اور تحت شعور اور لاشعور کے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لیکن ذہنی زندگی تو ایک کل ہے جو ان سب پر حاوی ہے۔ شاعر اس کل کو اُس کے ٹکڑوں کی خاطر نظرانداز نہیں کر سکتا۔ انسان کا عمل شعوری ارادے سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس ارادے کی تہ میں کیا ہے۔ تحت شعوری قوتوں کو جاننا ضروری ہے۔ جب تک کسی انسان کی دبی ہوئی خواہشوں اور یادوں کو نہ معلوم کیا جائے اس کے عمل کی توجیہہ ممکن نہیں۔ جدید شاعری میں چونکہ شعوری اور تحت شعوری ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ ایسے مبہم اشاروں کا مجموعہ بن گئی ہے کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب تک اس شاعری کے سننے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہن میں وہی تلازمات (ایسوسی ایشن) موجود نہ ہوں جو شاعر کے ذہن میں شعر کہتے وقت تھے اس وقت تک وہ اس شاعری کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس وجہ سے ہمیں جدید مغربی شاعری میں عجیب بے تکاپن سا محسوس ہوتا ہے جو مجذوب کی بڑ سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس قسم کا بے تکاپن حافظ، گوئٹے اور غالب کے یہاں نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان استادوں نے وجدان اور عقل اور شعور اور تحت شعور کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہونے دیا انہوں نے انسانی فطرت اور ذہن کی سالمیت کو برقرار رکھا۔ ہماری ادبی روایات بھی اسی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔ یہ روایات جدید نفسیات کی بنیادی صداقتوں کو جذب کرتے ہوئے ہمارے ادب کو بے راہ روی سے بچا سکتی ہیں۔

انسان کا تجربہ پورے انسان کا ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی زندگی کے کسی ایک رُخ کا۔ اس میں داخلیت اور خارجیت دونوں کو اپنا اپنا مقام ملنا چاہیئے بغیر اس کے جذباتی اور ذہنی انتشار سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بالزاک نے اپنے ناول "لے شے دورا ین کنو" میں اس قسم کی یک رُخی زندگی کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا

ہے۔ اس کا ہیرو مصوری سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ایک تصویر کھینچتا ہے جس میں رنگوں کی افراتفری اور ابتری اپنی انتہائی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے تصویر میں بے تکا پن پیدا ہو گیا ہے۔ اس تصویر کے ایک کونے میں عورت کی ٹانگ ایک طرف کو نکلی ہوئی ہے۔ یہ ٹانگ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی بھوت کی ٹانگ معلوم ہوتی ہے اس کا انداز بہت کچھ امپریشنسٹ مصوری کے طرز سے ملتا جلتا ہے جس کے جذباتی انتشار کو آج کل حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بالزاک نے جس کا آرٹ سماجی اہمیت میں رچا ہوا ہے اس تصویر کے ذریعے دروں بینی کا مذاق اڑایا ہے اس کا خیال بالکل درست ہے۔ ادیب اور فن کار کا فرض ہے کہ وہ ایسا مثالی نمونہ پیش کرے جو اصلیت پر مبنی ہو۔ اندرونی زندگی بالکل خود مختار تو نہیں کہی جا سکتی اور نہ وہ ایسے آزاد قوانین کے تحت نشوونما پاتی ہے جو گردوپیش کی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں۔ انسانوں کے جذبات اور خیالات بڑی حد تک اس کشمکش سے وابستہ ہوتے ہیں، جو انہیں اجتماعی زندگی میں پیش آتی ہے۔ فن کار کا فرض ہے کہ وہ اوپر، اندر، باہر سب طرف دیکھے اور اصلیت اور صداقت کا جہاں کہیں بھی وہ ملے خیر مقدم کرے۔ یہ صداقت ذہنی تجرید نہ ہو بلکہ جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی اور انسانی ہونی چاہئے۔ زندگی کی اصلیت اور صداقت کا یہ بھی اقتضا ہے کہ تہذیب و ادب کو حیوانی عناصر سے جہاں تک ممکن ہو الگ کر کے انسانی بلندی تک لے جائے اس لئے شاعر یا فن کار کا موضوع چاہے کچھ ہی ہو وہ اپنے آپ کو اخلاق سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ ایسا کرے گا تو یقیناً اپنے فن میں ایک عیب کو راہ دے گا جس سے اس کے کمال کو بٹہ لگ جائے گا۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ اس کا موضوع چاہے خارجی حقیقت سے تعلق رکھے یا داخلی سے وہ ہمیں اس کا براہ راست جلوہ دکھا دے اور ہمیں ایسا محسوس ہو جیسے وہ پردہ جو فطرت اور ہماری خودی کے درمیان اور خود

ہمارے شعور اور ہمارے درمیان پڑا ہوا تھا، اچانک طور پر ہٹ گیا معلوم ہوتا ہے غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ اعلیٰ درجے کے آرٹ میں خارجیت اور داخلیت، شعور اور تحت شعور، بیداری اور خواب میں فرق اور امتیاز باقی نہیں رہنا چاہیے جس کی نسبت اُس کے اس غیر مطبوعہ شعر میں اشارہ ہے ؎

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب　　　جو جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

(آسی، شرح غالب صفحہ ۲۱۵)

یورپ کے جدید ادب میں بعض بنیادی صداقتیں ہیں جن کے معنی خیز ہونے میں کلام نہیں۔ ان کو ہمارا ادب نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن انہیں جس یک طرفہ انداز میں برتا گیا ہے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو ان صداقتوں کے اصلی عناصر غزل میں صدیوں سے موجود رہے ہیں سیمبولسٹ کی رمز و علامت، امیجسٹ کی لفظی تصویر کشی اور سرریلسٹ کی تحت شعوری اُلجھن یہ سب کسی نہ کسی شکل میں غزل میں آپ کو ملیں گی۔ ہمارے غزل نگاروں نے شعر کے ان عناصر کو اس خوبی سے برتا ہے کہ ان میں معمے کی کیفیت نہیں پیدا ہونے پائی۔ اگر تعقید یا ابہام کی حد سے آگے بڑھ گئی تو وہ شعر کا عیب سمجھا گیا ہے۔ اس کو اچھی نظر سے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ استعارہ، کنایہ اور رمز میں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ معنی آفرینی کے باوجود ذہنی تلازم ایک دوسرے سے بہت دور نہ جا پڑیں اور تخیل کا دامن ادبی ضبط و توازن سے بندھا رہے۔ اس طرح اجتماعی فہم و تنقید فن کار کو بھٹکنے سے روکتی ہے۔ جتنا بلند تخیل ہوگا اتنا ہی بھٹکنے کا احتمال زیادہ ہوگا۔ غالب کو اپنی مشکل پسندی بہت کچھ اسی اجتماعی تنقید کی وجہ سے چھوڑنی پڑی۔ اُن کے دوستوں نے جن میں خاص طور پر مرزا خانی اور مولوی فضل حق خیر آبادی کا نام لیا جاتا ہے، انہیں مشورہ دیا کہ سننے والوں کی خاطر رمز و استعارے کی پیچیدگی کو ذرا کم کریں۔ آغا جان عیش نے یہ پھبتی بھی کس دی ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

انہی باتوں کو سُن کر غالبؔ کو کہنا پڑا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ہمیں معلوم ہے کہ شروع شروع میں غالبؔ اس قسم کی تنقید پر بہت جھنجلائے لیکن پھر بھی انہوں نے اس کا اثر قبول کیا اور پرانی روش کو بڑی حد تک ترک کر دیا۔ اگرچہ اُن کے سہل ممتنع میں بھی خیال کی نزاکت اور رمز و استعارے کا الجھاؤ موجود ہے لیکن زبان کی سادگی کی وجہ سے عام لوگ بھی اُن کے بعد کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس رنگ میں بھی اُن کی انفرادیت اور ترنگ باقی رہی۔ یہ حقیقت کا الجھاؤ علامتی طور پر ہی تھوڑا بہت گرفت میں آتا ہے۔ اس لئے اعلیٰ فن کار کے یہاں چاہے وہ کتنی ہی سادگی کیوں نہ برتنے کی کوشش کرے مطالب کا تھوڑا بہت اشکال پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

حقیقت پسندی کے جوش میں بعض نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ شعر کی حیثیت کو اسی حد تک ماننا چاہتے ہیں جس حد تک کہ وہ خارجی سماجی احوال کی ترجمانی کرے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ خارجی حقیقت جب شعر کا جزو بنتی ہے تو اس کی خاصیت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ جب شاعر کسی منظر کو بیان کرتا ہے تو وہ صرف اس منظر کی بات نہیں کرتا بلکہ خود اپنے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور کہہ جاتا ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کا لفظوں کا انتخاب اس کی اندرونی حالت کی چغلی کھاتے ہیں۔ شعر کی تعریف اس کی ظاہری ہیئت و صورت (فارم) اور موضوع سے مکمل نہیں ہوتی۔ اس کی صورت (فارم) ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک خاص قاعدے کے مطابق ہو

لیکن یہ اس لئے ضروری نہیں کہ اس سے شاعر خارجی حقیقت کا فنی تعین کرتا ہے بلکہ اس واسطے ضروری ہے کہ وہ خود ایک روحانی اصول کی حیثیت رکھتی ہے جسے شعر سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ذریعے حقیقت کی پر اسرار کارفرمائیوں کو ظاہر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ شاعری میں صورت اور معنی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہمارے شعور پر وہ الگ الگ حیثیت سے اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ ان کا مجموعی اثر ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور اسی سے شاعر کے لب و لہجہ میں صداقت پیدا ہوتی ہے۔

سائنٹسٹ کے لئے اس کی ذات سے باہر جو کائنات ہے وہ زیادہ اہم اور معنی خیز ہے۔ لیکن شاعر کے نزدیک اس کی ذات خارجی حقیقت سے زیادہ اہم ہے جو اس کے احساس کو انفرادیت بخشتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ آیا خارجی حقیقت زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا اس کو ادراک واحساس کرنے والی صلاحیت۔ بالکل اسی طرح جیسے ان سوالوں کا جواب دینا دشوار ہے کہ بھوک زیادہ اہم ہے یا روٹی۔ محبوب کی خواہش زیادہ اہم ہے یا خود محبوب۔ جگر نے اس دشواری کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

سب کچھ ہوا مگر نہ کھلا آج تک یہ راز
تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو

شاعر چاہے کتنا ہی حقیقت پسندی کا دعویٰ کرے وہ اپنے شعر کے لئے جو اسلوب اور موضوع منتخب کرے گا اس میں اس کا ذاتی رجحان لازمی طور پر موجود رہیگا اس کی اندرونی زندگی کا رنگ، خارجی تصویر کشی میں اُجاگر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کے جذبے و خواہش کے الجھاؤ اور پیچ و خم چھپانے پر بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ ہر شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر اپنے موضوع سے جذباتی تعلق رکھتا ہے اور اگر نہ

رکھے تو وہ شعر کا حق ادا نہیں کر سکتا ضرور ہے کہ وہ اپنی رُوح کی گہرائیوں میں اندرونی زندگی کے نغمے پہلے خود سنے۔ اس کے بعد ہی اُس کو یہ طاقت حاصل ہو گی کہ وہ اپنے سننے والوں کے شعور اور دل میں جو پردہ حائل ہے اُسے اٹھا دے تاکہ وہ اپنی اندرونی زندگی کو بہ نسبت پہلے کے بہتر سمجھنے لگیں۔ جب شاعر اپنے موضوع کو زبان و بیان کا جامہ زیب تن کراتا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ اس کو اپنے جذباتی اور ذہنی نظام کا جز بنا لیتا ہے۔ یہ جذباتی اور ذہنی نظام شعور اور تحت شعور دونوں پر حاوی ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس زمانے کے ادب اور آرٹ کا عام رجحان یہ ہے کہ زندگی کے خارجی احوال کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ اور ان کا اظہار کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ادب کے لئے بھی وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ اس میں خارجی مسائل کو کس طرح سمویا جائے تاکہ اُن کی نسبت ہماری بصیرت میں اضافہ ہو۔ یہ مضمون جب شعر میں ادا کئے جائیں گے تو لازمی طور پر ان میں فکری عنصر داخل کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ فکر تخیلی فکر ہو گی جو جذبے سے ہم آمیز ہو گی۔ اس طرح جب علامتی تخیل میں تصور و فکر پیوست ہو جائیں گے تو وہ تجریدی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ تخیلی فکر کی قوت اس کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سارے انداز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ وہ جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرتی ہے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح عین اور حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد دُور ہو جاتے ہیں اور شعر زندگی کے ہر کیف و رنگ کا مظہر بن جاتا ہے۔

اگرچہ سماجی اور اخلاقی مسائل کا بیان نظم میں بہتر طور پر ہو سکے گا لیکن غزل میں بھی انہیں حکیمانہ نکات کے انداز میں داخل کیا جا سکتا ہے تاکہ جدید عہد کے انسان کی ذہنی کیفیت ظاہر ہو سکے۔ لیکن اس اظہار کے بہت سے طریقے ہیں ایک

اس طور پر خیالوں کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ معاشی عمل یا تحت شعور کی ڈائری یا کھتونی معلوم ہوں اور ایک اس طرح کہ سننے والا اپنی زندگی میں مسرت اور فراوانی محسوس کرے۔ اس کی بصیرت کو جلا ہو اور اس کی قدروں اور خواہشوں میں ہم آہنگی اور ہم ربطی پیدا ہو۔ قدر ہی وہ کنجی ہے جس سے زندگی کے سارے طلسم کھلتے ہیں۔ شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیئے نہ کہ اس کو مٹانے والا۔ غزل گو شاعر جب زندگی کا ذکر کرے گا، تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ اُن پر چڑھائے گا اور کبھی اُن کے اثر سے اپنی آرزؤں کی صورت گری کرے گا۔ وہ حسن آفرینی بھی کرے گا اور قدر آفرینی بھی۔ لیکن یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی چاہیئے جس میں اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں پنہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے۔ ہم بہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتی اور یہی دونوں جز تغزل کی جان ہیں۔ انہی سے حُسنِ ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے۔

انتخابِ غزلیات

محمد ولی ولیؔ اورنگ آبادی

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا — جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے ولیؔ اس درد سے ہرگاہ — جلدی سے ترے درد کے درماں سے کہونگا

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سے جوں آفتاب ہوگا
مت آئینے کو دکھلا اپنا جمالِ روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مستِ جامِ خوبی — تجھ انکھڑیوں کو دیکھے عالم خراب ہوگا

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

طاقت نہیں کہ حشر میں ہووے وہ دادخواہ — جس بے گنہ پہ تیری نگہ سوں ستم ہوا

آج تیری بھواں نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ملا ہو گل بدن جس کو اُسے گلشن سوں کیا مطلب — جو پایا وصف یوسف اس کو پیراہن سوں کیا مطلب

ولی جنت میں رہتا ہی نہیں درکار عاشق کوں — جو طالب لامکاں کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب

اب جدائی نہ کر خدا سوں ڈر — بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر
اے ولی غیر آستانۂ یار — جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

کر چاک گریباں کوں گلاں صحن چمن میں — آئے ہیں تیرے شوق میں پردے سوں نکل کر
اے نورِ نظر شمع کوں دیکھا ہوں سراپا — تجھ عشق کی آتش ستی کاجل ہوئی جل کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار — تجھ کو اپنا راحتِ جاں بوجھ کر
زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب — حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر
رحم کر اس پر کہ آیا ہے ولی — دردِ دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

دل کو ہوتی ہے سجن بے تابی — زلف کو ہاتھ لگایا نہ کرو

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رو سوں — خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — عشق کا اعتبار کھوتی ہے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لیجاوے

جس وقت تبسم میں وہ رنگیں دہن آوے — گلزار میں غنچے کے دہن پر سخن آوے
تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے — جس بر منے یک بار وہ گل پیرہن آوے

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک — جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار — جسے عشق کی بے قراری لگے
ولی کوں کہے تو اگر یک بچن — رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

یک بار گر چمن میں وہ نو بہار جاوے — بلبل کے دل سوں گل کا سب اعتبار جاوے
مستی نے تجھ نین کی بے خود کیا ولی کو — آوے جو بزم میں کیوں ہوشیار جاوے

سیّد سراج الدین سراج اورنگ آبادی

بیان عشق کی بیہودہ گفتگو مت کر — نہیں سراج یہ قصہ تمام ہونے کا

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں — کہاں سراج کہاں آفتابِ عالم تاب

مدت سے گم ہوا دلِ بیگانہ سراج — شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

خبر تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں

کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر ہے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراجؔ کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج الدین علی خاں آرزو

ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

دکھائی چشمِ مست اپنی جب اس رندِ شرابی نے
نہ دم مارا کٹورے نے نہ ہچکی لی گلابی نے

جان کچھ تجھ پہ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروسا ہے

شاہ مبارک آبرو دہلوی

نین سیں نین جب ملائیے گا
دل کے اندر مرے سمائیے گا
آبرو ہجر بیچ مرتا تھا
مکھ دکھا کر اسے جلائیے گا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہو گی
اس دلِ بے قرار کی صورت

جلتا ہے اب تلک تری زلفوں کے رشک سے
ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل

ٹک باغ میں شتاب چلو اے بہارِ حسن
گل چشم ہو رہا ہے تمہارے نظارے کوں

سر سے لگا کے پاؤں تلک دل ہوا ہوں میں
یاں تک تو فنِ عشق میں کامل ہوا ہوں میں

جب چمن میں جا کے پیارے تم نے زلفیں کھولیاں
لے گئی بادِ صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں

نہ دیوے لے کے دل وہ جعد مشکیں
اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

کریں جو بندگی ہو ویں گنہگار
بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

افسوس ہے کہ مجھ کوں وہ یار بھول جاوے
وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے
کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبیح کرے فراموش زنار بھول جاوے
یوں آبرو بناوے دل میں ہزار تاباں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

مرزا جانِ جاناں مظہر دہلوی

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستایا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا / لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بے کس افسوس / کیا ہوا اُس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

زخمی تری نگاہ کا اک پل جیا تو پھر کیا / صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار / ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب / پھر یہ اُن خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک / جی نکل جاتا ہے جب سننے میں آتی ہے بہار
شاخِ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں / ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم / مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے نو بہار تو ہم سے / چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

اُس کے دل میں کبھی تاثیر نہ کی / اے محبت اسے کیا کہتے ہیں

اُس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ / اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
برگِ حنا سے اوپر لکھو احوالِ دل مرا / شاید کہ جا لگے وہ کسی دلربا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو / یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے / ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

حنا تیرے کف کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انہوں کی نیند کیوں جاتی

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشمِ تر سے مینہ نہ برساتی

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ظہور الدّین شاہ حاتمؔ

اے یار مت اڑا تو گریباں کی دھجیاں
لے ہے جنوں حساب یہاں تار تار کا

ہمارا جان گیا ہم نے آہ بھی نہ کیا
یہ کیا غضب ہے کہ تم نے نگاہ بھی نہ کیا

میں اپنے دل کو بڑا کارداں سمجھتا تھا
پر ایک کام مرا سربراہ بھی نہ کیا

کچھ حسن کی ہوتی نہ یہاں قدر نہ قیمت
جو عشق کبھی اس کا خریدار نہ ہوتا

ہاتھ مت کھینچ جنوں تجھ کو مرے سر کی قسم
ایک جب تک بھی رہے تار گریبان کے بیچ

اس درجہ ہوئے خرابِ الفت
جی سے اپنے اتر گئے ہم

سا باغ میں تم جو کارفرما ہو
تو خزاں میں بہار پیدا ہو

حسن اور عشق ترے فیضِ قدم کے صدقے — دونوں آباد ہیں ہم گلشن و ہم ویرانہ

کہتے ہیں سبھی مہرِ بتاں خوب نہیں ہے — سنتا ہی نہیں یہ دلِ گم راہ کسی کی

کچھ دور نہیں منزل اٹھ باندھ کمر حاتمؔ — تجھ کو بھی تو چلنا ہے کیا پوچھے ہے راہی سے

ترے رخسار و قد نے دھوم ڈالی ہے گلستاں میں — ادھر بلبل سسکتی ہے ادھر قمری بلکتی ہے
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہو وہ ہم چشمی کے دعوے سے — کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے

رائے ٹیک چند بہارؔ

دل ہمارا لے کے کیوں انکار کرتے ہو سجن — کس سے یہ سیکھے ہو تم نے کر مکر جانے کی طرح

عبث تشویش کیوں دیتی ہے گل کی طبع نازک پر — یہ گستاخی نہیں ہے خوب مت کر شور اے بلبل

وہی ایک ریسماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں — کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زنار کہتے ہیں

میر محمد سجادؔ سجادؔ

بتوں کی بھی یہ یاد دوروزہ ہے — ہمیشہ رہے نام اللہ کا

یار سے دل ملا وہ غیر ستی — نہ دل اپنا ہوا نہ یار اپنا

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق — اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو؟

رات اس زلف کا وہ افسانہ — قصۂ کوتاہ بڑی کہانی ہے

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے — جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

راجہ رام نرائن موزوںؔ

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری[1]

میر عبدالحئی تاباںؔ

میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح — یارب کبھو خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا
ہم بے کسی پہ اپنی نہ روئیں تو کیا کریں — دل سا رفیق ہائے ہمارا جدا ہوا

حرم کو چھوڑ رہوں کیوں نہ بتکدے میں شیخ — کہ یاں ہر ایک کو ہے مرتبہ خدائی کا

---

[1] اس شعر کو پڑھ کر میر صاحب پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کی خوبی کی سند اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی۔ میر صاحب اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں فرماتے ہیں: — "فقیر را از دیدن ایں شعر تواجد دست ہم می دہد از بسکہ خواندن ایں شعر حظے بر می دارم، می خواہم کہ صد بار بنویسم۔" (صفحہ ۵، شائع کردہ انجمن ترقی اردو)

[2] راجہ صاحب عظیم آباد کے صوبہ دار تھے۔ یہ شعر انہوں نے سراج الدولہ کے شہید ہونے پر لکھا تھا۔ اس شعر سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (تذکرۂ شعرائے اردو، میر حسن دہلوی صفحہ ۱۵۰۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو)

اوڑا دے صبا خاک میری اگر تو — تو کوچے میں اُس بے وفا کے ہی لے جا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ — حیراں ہوں میں کہ گل کے گریباں کو کیا ہوا

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں — ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

کہتے ہیں اثر ہے گا رونے میں یہ ہیں باتیں — اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

ہاتھ بے فائدہ زنداں میں نہ دوڑا مجنوں — طوق ہے تیرے گلے میں یہ گریباں تو نہیں

گلشن میں بھٹنے کو تمہارے دہن کے ساتھ — کھولا تھا منہ کو کلیوں نے پر کچھ نہ بولیاں

غم وصل میں ہے ہجر کا ہجراں میں وصل کا — ہرگز کسی طرح مجھے آرام ہی نہیں

سُن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں — کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے — اب کس کے ساتھ پیالے دے دلربائیاں ہیں

پھر بہار آتی ہے دیوانے کی تدبیر کرو — بے خبر کیا ہو شتابی اسے زنجیر کرو
ہوں مقرر میں گنہ گار کہ چاہا تم کو — خوبرویاں مجھے من مانتی تعذیر کرو

شورِ جنوں کا سرد ہے بازار ان دنوں — اُٹھے بہار جلد الٰہی ہوا پھرے

محفل کے بیچ سُن کے مرے سوزِ دل کا حال — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

شاہ واقف دہلوی

جلایا مجھ کو مری ضبط آہ نے جوں شمع — اٹھا جو شعلہ جگر سے تو پھر جگر میں رہا

کروں میں شکوہ اگر تیری بے وفائی کا — جہاں میں نام نہ لے کوئی آشنائی کا

اچپلاہٹ اسے کہتے ہیں کہ شوخی سے وہ شوخ — میری آنکھوں کے تصوّر میں سمایا نہ گیا

کبھی ایسا بھی اے خُدا ہوگا — وہ صنم ہم سے آشنا ہوگا
روز و شب مجھ کو ہے یہی دھڑکا — نہ ملو گے . ملو گے کب ہوگا

چمن سے کوئی باتیں اپنے جانے کی سُناتا ہے — کہ گل کا ایک رنگ آتا ہے اور اک رنگ جاتا ہے

ہوس سیر چمن لے تو چلی ہے یاں سے — پر کسی دام میں مت کیجو گرفتار مجھے

سب سے ملتے تو ہو ظاہر میں پہ دھڑکا ہے مجھے — کہیں مجھ سا نہ کوئی اور گرفتار ملے

جب کہ یاد آتا ہے گلشن میں مرا گگرو مجھے — خضرِ راہ بے خودی ہوتی ہے گل کی بُو مجھے

محمد امان نثار

ہے جو سینے میں جگر دہکے ہے انگارا سا — دل جو پہلو میں ہے بیتاب ہے وہ پارا سا

آنکھ لگتی ہے کوئی پل تو ہمیں ہاں اُس کا — عالمِ خواب میں ہو جائے ہے نظارا سا
دل کہیں، دیدہ کہیں، جی ہے کہیں، جان کہیں — گردشِ چرخ میں ہر ایک ہے آوارا سا

امید شفا ہے لبِ جاں بخش سے اُس کو — شرمندۂ عیسیٰ نہیں بیمار تمہارا
ہم عشق میں تم حسن میں مشہور ہیں دونوں — ہے ذکر ہمارا کہیں اذکار تمہارا

کھول کر بندِ قبا یوں نہ پھرا کیجے — گل کی ہنسی پر بھی ٹک دھیان لگایا کیجے

تجھ بن چمن کی سیر سے کیا یار لے گئے — جوں لالہ داغ سینے پہ دو چار لے گئے

خاطر سے تیری یاد نہ برباد کریں گے — جس حال میں ہم ہوں گے تری یاد کریں گے

میر محمدی بیدار دہلوی

اشک سے سوزِ غمِ عشق مٹایا نہ گیا — شعلہ اس آگ کا پانی سے بجھایا نہ گیا

طلب میں تیری اک تنہا نہ پائے جستجو ٹوٹا — کہ نایابی سے تیرے تار تار آرزو ٹوٹا
کیا ہنگامۂ گل نے مرا جوشِ جنوں تازہ — اودھر آئی بہار ایدھر گریباں کا رفو ٹوٹا

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک — جی سے نہ ترے غبار نکلا

ایک بھی تار نہیں تا سرِ داماں ثابت — اس طرح چاک گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا

ناتوانی سے مری دیکھیو اے دستِ جنوں
رہ گیا ہو نہ کوئی تار گریباں میں چھپا

اے صبا گل تو کھل چکے پہ کبھو
غنچۂ دل مرا بھی وا ہوگا

اے رشکِ گل کرے ہے عبث جستجوئے عطر
یک شمہ تجھ شمیم بدن سے ہے بوئے عطر
ہو جس دماغ میں مرے گل پیرہن کی بُو
بیدار ہو نہ وسکو کبھی میل بوئے عطر

کیوں نہ لے گلشن سے باج اس ارغواں سیما کا رنگ
گل سے ہے خوش رنگ تر اس کے حنائی پا کا رنگ
جوں ہی منہ پر سے اٹھا دی باغ میں آکر نقاب
اوڑ گیا رنگ چمن دیکھ اس رخِ زیبا کا رنگ
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا
سُرخ مے، کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ

بھاتی نہیں ہے باس کسی گل کی اے صبا
کس کی ہوا ہے بُو سے معطّر دماغِ دل

اے بہارِ گلشنِ ناز و نزاکت ہر طرف
تیرے آنے سے ہوئی ہے اور بھی بستاں میں دھوم

جانیں مشتاقوں کی لب پر آئیاں
بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
جیب تو کیا ناصحا دامن کی بھی
دھجیاں کر عشق نے دکھلائیاں
اس صنم اندام گل رخسار کی
جانفزا نکہت چرا کر لائیاں

سُن کے یہ بادِ صبا سے باغ میں گھڑیاں غنچوں کی سب کھلوائیاں

ہم تری خاطر نازک سے خطر کرتے ہیں ورنہ نالے تو یہ پتھر میں اثر کرتے ہیں
دل وہیں تھا سو لیا اور بھی کچھ مطلب ہے بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں

کریں ہیں ناز گل و لالہ اپنی خوبی پر ملک ایک تو بھی نمایاں ہو کے جلوہ فرما ہو

کفِ پا ہیں ترے صحرا کی نشانی پیدا مر گیا تو بھی پھپھولوں میں رہے خار کئی

زلف اس رُخ پہ صبا سے جو پریشاں ہو جائے سحر و شام بہم دست و گریباں ہو جائے
گیسوئے مشک فشان و رُخ رنگیں سے ترے سنبل آشفتہ و گل چاک گریباں ہو جائے

اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے
کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

میر تقی میر

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک پلک تک گیا تو تلاطم کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبحِ چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تم کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گُل نے جو کل دعوئِ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

اب کے جو تیرے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

نے خوں ہوا آنکھوں سے بہا ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میرؔ کسو کام نہ آیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

وہ اک روش پہ کھولے ہوئے بال ہو گیا
سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اُس کے عشق میں
دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رُخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

تڑپ کے خرمنِ گل پر کہیں گرا اے بجلی
جلانا کیا ہے میرے آشیاں کے خاروں کا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

آگے جمالِ یار کے معذور ہو گیا
گل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا

دیکھا جو میں نے یار تو وہ میرؔ ہی نہیں
تیرے غمِ فراق میں رنجور ہو گیا

بے کسانہ جی گرفتاری کے شیون میں رہا
اک دلِ غم خوار رکھتے تھے سو گلشن میں رہا

پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل　　اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میرؔ　　جی ہر اک نخچیر کا اس صید افگن میں رہا

گریہ پہ رنگ آیا، قید قفس سے شاید　　خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا
دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو　　یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا

اب تو جاتا ہی ہے کعبے کو تو بت خانے سے　　جلد پھر یو تجھے اے میرؔ خدا کو سونپا

ہم اسیروں کا بھلا کیا جو بہار آئی نسیم　　عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے مے خانے　　نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں　　تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے　　ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے　　دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

خوبی کا اس کے بسکہ طلب گار ہو گیا　　گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

ہے اُس کی حرف زیر لبی کا سبھوں میں ذکر　　کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا
کیا کہئے آہ عشق میں خوبی نصیب کی　　دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا
کب رُو ہے اس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میرؔ　　ناکردہ جرم میں تو گنہ گار ہو گیا

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا　　اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک　　پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز　　آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
دم آخر ہے، بیٹھ جا مت جا　　صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
تیرے بے خود جو ہیں وہ کیا چیتیں　　ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں

گل نے ہزار رنگِ سخن سر کیا ولے　　دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں
جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے　　گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی یاریاں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں　　اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا　　اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرض عشق کا علاج نہیں

بُرا حال اُس کی گلی میں ہے میرؔ　　جو اٹھ جائیں واں سے تو اچھا کریں

شہر خوبی کو سب نے دیکھا میرؔ　　جنس دل کا کہیں رواج نہیں

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا　　جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں　　تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
بوئے گل اور رنگ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم　　لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں
شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں　　مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

ناز بتاں اٹھا چکا دیر کو میرؔ ترک کر
کعبے میں جا کے رہ میاں تیرے مگر خدا نہیں

جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
دوانہ ہو گیا تو میرؔ آخر ریختہ کہہ کر
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بزم میں جو ترا ظہور نہیں　　شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں

کتنی باتیں بنا کے لاؤں لیک — یاد رہتی ترے حضور نہیں
عام ہے یار کی تجلی میرؔ — خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

موئے سہتے سہتے جفاکاریاں — کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر — یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تانکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک — سر سے سودائے جستجو نہ گیا
دل میں کتنے مسوّدے تھے ولے — ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے — دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

کیا کہئے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا — ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے — گل پھول کو ہے ان نے پروانہ بنا رکھا

دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لُوٹا مارا ہے حسن والوں کا
جی کا جنجال دل کو ہے الجھاؤ — یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم — حال خوش اُس کے خستہ حالوں کا
دم نہ لے اُس کی زلفوں کا مارا — میرؔ کاٹا جئے نہ کالوں کا

پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا | اب جس جگہ کہ داغ ہے یہاں پہلے درد تھا
عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبطِ عشق کے | دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

سرسری تم جہان سے گزرے | ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا | ہم نے جانا تھا کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن | چُپ ہے یوں بے زباں ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے | میکدہ اک جہان ہے گویا
وہی شور مزاج شیب میں ہے | میرؔ اب تک جوان ہے گویا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا | جی کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا
عشق گیا سو دین گیا ایمان گیا اسلام گیا | دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں ناکام گیا
کس کس اپنی کل کو روئے ہجراں میں بے کل اُس کا | خواب گئی ہے تاب گئی ہے چین گیا آرام گیا

ہائے جوانی کیا کیا کہیئے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا

(کل لے گئے تھے یار ہمیں بھی چمن کے بیچ | اس کی سی بُو نہ آئی گل و یاسمن کے بیچ)
ہے قہر وہ جو دیکھے نظر بھر کے جن نے میرؔ | برہم کیا جہاں مژہ برہم زدن کے بیچ

بس نہ تنگ چل نسیم مجھ سے کہ میں | رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

کوئی خواہاں نہیں محبت کا — تو کہے جنس ناروا ہے عشق
میر جی زرد ہوتے جاتے ہو — کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

گرچہ آوارہ چوں صبا ہیں ہم — لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
اے بتاں اس قدر جفا ہم پر — عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر — گویا اک جنسِ ناروا ہیں ہم

بلبل کو موا پایا کل پھولوں کی دوکاں پر — اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا
خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ کہنے کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا
رہ میر غریب نہ جاتا تھا چلا روتا — ہر گام گلہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

کل دل آزردہ گلستاں سے گزر ہم نے کیا — گل لگے کہنے کہو منہ نہ ادھر ہم نے کیا
اس رخ و زلف کی تسبیح ہے یاں اکثر میر — ورد اپنا یہی اب شام و سحر ہم نے کیا

دل دفعۃً جنوں کا مہیا سا ہو گیا — دیکھی کہاں وہ زلف کہ سودا سا ہو گیا
ٹک جوش سا اٹھا تھا مرے دل سے رات کو — دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا
جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا — اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا

اللہ رے غرور و ناز تیرا — مطلق نہیں ہم سے ساز تیرا
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

اندوہ و غم کے جوش سے دل رُک کے خوں ہوا — اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا
میرؔ ان نے سرگزشت سنی ساری رات کو — افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا — کھب گئی جی میں تیری بانکی ادا
جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ — ہائے رے چشمِ دلبراں کی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہے — سنتے ہو میرے بدزباں کی ادا
دل چلے جائے ہے خرام کے ساتھ — دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا
خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے — بے ادائی تھی آسماں کی ادا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
تاب کس کو ہو حال میرؔ سنے — حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو باس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے — قیس کی آبرو کا پاس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن — شوق نے ہم کو بے حواس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا
ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں — میرؔ کو تم عبث اداس کیا

دل خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک — کبھی سوز سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا

کبھو جائیگی جو اُدھر صبا تو یہ کہیو اس سے کہ بیوفا　　مگر ایک میرؔ شکستہ پا ترے باغِ تازہ میں خار تھا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا　　رات کو سینہ بہت کوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم　　گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

مجلس آفاق میں پروانہ ساں　　میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

کہا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ　　کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ　　مذہب عشق اختیار کیا

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا　　وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا　　رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا

گلی میں اس کے گیا سو گیا نہ بولا پھر　　میں میرؔ میرؔ کر اُس کو بہت پکار آیا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے　　یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل — سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا — غم کے جانے کا نہایت غم رہا
جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا — تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی — ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
صبحِ پیری شام ہونے آئی میرؔ — تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

اس چہرے کی خوبی سے عبث گل کو جتایا — یہ کون شگوفہ چمن زار میں لایا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ — یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
ایسے بتِ بے مہر سے ملتا ہے کوئی بھی — دل میرؔ کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو — تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

سرو و شمشاد خاک میں مل گئے — تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا
سعیِ طوفِ حرم نہ کی ہرگز — آستاں پر ترے مقام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے — یہیں سے کعبے کو سلام کیا

عشق خوباں کو میرؔ میں اپنا　　قبلہ و کعبہ و امام کیا

یار عجب طرح نگہ کر گیا　　دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی　　پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا

پہنچے ہے کوئی اس تن نازک کے لطف کو　　گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

نظر میں طور رکھ اس کم نما کا　　بھروسہ کیا ہے عمر بے وفا کا
گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے　　کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا
پرستش اب اسی بت کی ہے ہر سو　　رہا ہوگا کوئی بندہ خدا کا
کہیں اس زلف سے کیا لگ چلی ہے　　پڑے ہے پاؤں بے ڈھب کچھ صبا کا
نہ جانو میرؔ کو ایسا ہی چپکا　　نمونہ ہے یہ آشوبِ بلا کا

تا بمقدور انتظار کیا　　دل نے اب زور بے قرار کیا
دشمنی ہم سے کی زمانے نے　　کہ جفا کار تجھ سا یار کیا
ہم فقیروں سے بے وفائی کی　　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا　　اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
گل میں اس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا　　ہم کو بن دوشِ ہوا باغ سے لایا نہ گیا
گل نے ہر چند کہا باغ میں آ پر اس بن　　جی جو اچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا

سر نشینِ رہ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں — رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُرپیچ و تاب — شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا
گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم — مدتیں گزریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

اک نگہ سے بیش تو نقصاں نہ آیا اُس کے تئیں — اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا
وصل و ہجراں سی جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
کب نیازِ عشق نازِ حسن سے کھینچے ہے ہاتھ — آخر آخر میرؔ بر سرِ آستاں مارا گیا

کب تلک یہ ستم اٹھائیے گا — ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا
شکل تصویر بے خودی کب تک — کسو دن آپ میں بھی آئیے گا
کہیے گا اس سے قصۂ مجنوں — یعنی پردے میں غم سنائیے گا
شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ — کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد — کسی ویرانے میں بنائیے گا

شریعت نگہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ — یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے کا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات — اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو — سو دلوں کا غبار ہے اپنا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانے پر

دامن میں آج میرؔ کے داغ شراب ہے
تھا اعتماد ہم کو بہت اس جوان پر

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ
ہے پیارے ہنوز دلی دور

پچھتائیے نہ کیوں کہ جی اس طرح سے دیکر
یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چکے ہیں

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز
ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

نالے کیا نہ کر سنا نوحے پہ میرے عندلیب
بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
آب و ہوائے ملکِ عشق تجربہ کی ہے میں بہت
کر کے دوائے درد دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

قسمت اس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی
دے ہے مے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں
حسن اک چیز ہے ہو دین کہ تو ہو ناصح
ایسی شے سے کوئی بھی ہاتھ اٹھاتا ہے میاں

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ہے تکلف نقاب وے رخسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم
گھر تھے دو سو خراب ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ
اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

کیا میں نے رو کر فشارِ گریباں
رگِ ابر تھا تار تارِ گریباں

نشاں اشکِ خونیں کے اڑتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہارِ گریباں

جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے
نہ رکھا مرے سر پہ بارِ گریباں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے یہ بھی خوب جانے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اُس پری رو سے
میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

گرمی نہیں ہے ہم سے وہ اے رشکِ آفتاب
اب آگیا ہے فرق بہت اس تپاک میں

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید ہی کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں

جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر
بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

ناز و انداز و ادا عشوہ و اغماض و حیا
آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں

دل کے الجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح
تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

مجھ کو دماغ وصف گل یاسمن نہیں
میں جوں نسیم بادہ فروشِ چمن نہیں

گل کام آوے ہے ترے منہ کے نثار کے
صحبت رکھے جو تجھ سے یہ اس کا دہن نہیں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

دل کھلتا ہے واں صحبت رندانہ جہاں ہو
میں خوش ہوں اسی شہر سے میخانہ جہاں ہو

کچھ حال کہیں اپنا نہیں بےخودی تجھ کو
عشق آتا ہے لوگوں کو یہ افسانہ جہاں ہو

حیران ہو رہو گے جو ہم ہو چکے کبھو
دیکھا نہیں ہے مرتے کسو عشق باز کو

صوفی کی پارسائی کی ہے خانقاہ میں دھوم
بے چلئے گا کبھو ادھر اس مست ناز کو

جاتے نہیں اٹھائے یہ شور ہر سحر کے　　یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے ہے　　ظالم معاف رکھیو میرا کہا سُنا تو
آتی بخود نہیں ہے باد بہار اب تک　　دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو
کہہ سانجھ کے موئے کو اے میرؔ روئیں کب تک　　جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

بکھری رہے ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
کیوں کر چھپے مے خواری شب جب ایسے رات کے ماتے ہو
سرو تہ و بالا ہوتا ہے، درہم برہم شاخِ گل
ناز سے قد کش ہو کے چمن میں ایک بلا تم لاتے ہو
چشم تو ہے اک دید کی جا پر کب تکلیف کے لائق ہے
دل جو ہے دلچسپ مکاں تم اس میں کب کب آتے ہو

سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت　　اس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی گل گئے پر مر کر چمن سے نکلی　　اس مرغ شوق کش کی ٹک تم وفا تو دیکھو

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ　　کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

نالاں تو ہیں مجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے　　گو طائر گلستاں سیکھے مری زباں کو
بعد از نماز بیٹھے کل مے خانے کے در اوپر　　کیا جانے میرؔ اٹھ کر واں سے گئے کہاں کو

اگرچہ گل بھی نمود اس کے رنگ کرتا ہے　　ولیک چاہئے ہے منہ بھی ناز کرنے کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا | میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

روز دفتر لکھے گئے یاں سے | اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل | غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار | عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم | اب جو ہیں خاک انتہا یہ ہے
بودِ آدم نمودِ شبنم ہے | ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
دیکھ بے دم لگا مجھے کہنے | ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں | اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ | ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا | کم تماشا نہیں ہے پروا کچھ
وصل اس کا خدا نصیب کرے | میرؔ دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی | دھوم ہے پھر بہار آنے کی
وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دُور ہی دُور | ہے یہ تقریب جی جلانے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شبِ آتشِ شوق | تھی خبر گرم اس کے آنے کی
جو ہے سو پائمالِ غم ہے میرؔ | چال بے ڈول ہے زمانے کی

ہستی اپنی حباب کی سی ہے | یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھی میرؔ بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

تڑپنا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
میں کشتہ ہوں اندازِ قاتل کا اپنے

بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا
ہوں بندہ خیالاتِ باطل کا اپنے

آرزو اس بلند و بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا؟
عشق کی زور آزمائی ہے

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ
کیا دوانے نے موت پائی ہے

پھر اس سے طرح کچھ جو دعوے کی سی ڈالی ہے
کیا تازہ کوئی گل نے اب شاخ نکالی ہے

سچ پوچھو تو کب ہے گا اس کا سا دہن غنچہ
تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنالی ہے

یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھئے ہمارا جانا کدھر بنے ہے؟

گلگشت کی ہوس تھی سو تو بگیر آئے
آئے جو ہم چمن میں ہو کر اسیر آئے

کیا کہوں شرحِ خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

حالِ بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے ذوق دل لگانے کے

میرے تغیرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا
اور بھی وقت تھے بہانے کے

اب گریباں کہاں کہ اے ناصح
چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے

دل و دیں، ہوش و صبر سب ہی گئے   آگے آگے تمہارے آنے کے

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی   بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں، آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح   اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی
نالے کر یو سمجھ کے اے بلبل   باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے   ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی   حق بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے   نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے   اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے
پھرتے ہو میر صاحب سب سے جدے جدے تم   شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

مجھ کو ملنے کا کچھ ڈھب نہ آیا   نہیں تقصیر اُس ناآشنا کی

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ   کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے   دل پُر خوں کی اک گلابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کام تھا عشق میں بہت پر میرؔ
ہم بھی فارغ ہوئے شتابی سے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوریِ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاکِ آشیاں سے

کیا خوبی اُس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تُو تو نہ بول ظالم بُو آتی ہے دہاں سے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے
نکہتِ گل سے آشنا نہ ہوئے

کیسا کیسا قفس سے سر مارا
موسمِ گل میں ہم رہا نہ ہوئے

خدا کرے مرے جی کو ٹک اک قرار آوے
کہ زندگی تو کروں جب تلک کہ یار آوے

ہمیں تو ایک گھڑی گل بغیر دو بھر ہے
خدا ہی جانے کہ اب کب تلک بہار آوے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میرؔ
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آوے

ہم طورِ عشق سے واقف نہیں مگر ہاں
سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

اُس کے بدن میں ہر جا دلکش ہے یوں و لیکن
یا سطحِ رُخ جگہ ہے یا کنجِ لب جگہ ہے

دروازے سے لگے ہم تصویر سے کھڑے ہیں
وارفتگاں کو اس کے مجلس میں کب جگہ ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں — اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے

لطف پر اُس کے ہم نشیں مت جا — کبھی ہم پر بھی مہربانی تھی

وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اُس کے رُو کے تئیں — بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ — آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

ناچار ہم تو تجھ بن جی مار کر رہیں گے — پر اس روش کو تیری یہ لوگ کیا کہیں گے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا — عشق نے زور آزمائی کی
اب نگہ میں ہزار دل مارے — ساحری کی کہ دل ربائی کی
نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی — برسوں تک ہم نے جبہ سائی کی

دل جاوے ہے جوں رو کے شبنم نے کہا گل سے — اب ہم تو چلے یاں سے تو رہ جو رہا چاہے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں — کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی
دیوانگی کسو کی بھی زنجیر پا نہ تھی

بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے
ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی

دیکھے دیارِ عشق کے میں کارواں بہت
لیکن کسو کے پاس متاعِ وفا نہ تھی

اتنا نہیں خیال میں خوش رُو کوئی کبھی
تو مار ڈالیو نہ مجھے اس گمان سے

دل میں مسودے تھے بہت پر حضورِ یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

روشن ہے چپکے مرنا پروانے کا ولیکن
اے شمع کچھ تو تو کہہ تیرے بھی تو زباں ہے

یہ چشم آئینہ دارِ روتھی کسو کی
نظر اس طرف بھی کبھو تھی کسو کی

سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی
کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی

جلایا شب اک شعلۂ دل نے ہم کو
کہ اس تند سرکش میں خو تھی کسو کی

نہ تھے تجھ سے نازک میانِ گلشن
بہت تو کمر جیسے مو تھی کسو کی

دمِ مرگ دشوار دی جان اُس نے
مگر میرؔ کو آرزو تھی کسو کی

مرزا محمد رفیع سوداؔ

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ دیں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا
زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ پائی کے
کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھئے

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

سودا یہ کیا کرے گا نت اس قدر کا رونا
عالم کو اے دوانے مت ساتھ لے ڈبونا

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا
بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا
پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو
کوئی سیو کوئی مرہم کرو ہوا سو ہوا
کہے ہے سن کے مری سرگزشت وہ بے رحم
یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا
دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ	یہ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

دیکھئے واماندگی اب کیا دکھائے	قافلہ یاروں کا سفر کر گیا
وہم غلط کار نے دل خوش کیا	کس پہ نہ جانے وہ نظر کر گیا

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا	جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

داغِ محبت اے گل تیرا تھا جب نہ جگ میں	داغوں سے جس کا سینہ گلزار تھا سو میں تھا
اس مے کدے میں سودا ہم تو کبھی نہ بہکے	سب مست و بے خبر تھے ہشیار تھا سو میں تھا

لذت دی نہ اسیری نے صیاد کی بے پروائی سے	تڑپ تڑپ کر مفت دیا جی ٹکڑے ٹکڑے دام کیا
او بے دیا ہے ہاتھ سے اپنے کبھی بھلا میخانے کو	کیسے ہی ہم مست چلے پر سجادہ ہر ہر گام کیا

کس کو گلگشتِ چمن کا ہے دماغ اے باغباں	کھینچ کر میرا گریباں یاں لے آتی ہے بہار
عارضِ گل پر نہیں شبنم عرق ہے شرم کا	دیکھ کر میرا جنوں یارو لجاتی ہے بہار
کس کی آنکھوں سے کہو اٹھی ہے مستی سیکھ کر	اس برس نرگس پہ کیا دھومیں مچاتی ہے بہار

ساقی گئی بہار رہی جی میں یہ ہوس	تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

ہیں صفائے بادۂ دُردِ تہ پیمانہ ہم	نورِ شمعِ مجلس و سوزِ دلِ پروانہ ہم
جانِ عقلِ کامل و شوریدہ سر دیوانگاں	رونقِ آبادگی اور وحشتِ ویرانہ ہم

چشمِ شیخ و برہمن میں ہے ہمیں جوں سُرمہ جا
گردِ راہِ کعبہ و خاکِ درِ مے خانہ ہم

فیض سے مستی کے دیکھا ہم نے گھر اللہ کا
جا رہے مسجد میں شب گم کردۂ کاشانہ ہم

زاہدا کہہ تو صلاحِ نیک ان دونوں میں کیا
جام کا بوسہ لیں یا چومیں لبِ جانانہ ہم

کیا گلا صیّاد سے ہم کو یونہی گزرے ہے عمر
اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

فصلِ گل جاتی ہے سودا دیکھ لے نرگس کو ٹک
باغ میں مہماں کوئی دن ہے یہ بیمارِ چمن

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو اک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر
مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

قیمت میں اُن کی گو ہم دو جگ کو دے چکے ہیں
اس یار کی نگاہیں تس پر بھی سستیاں ہیں

جب میں کہا یہ اُس سے سودا سے اپنے مل کے
اس سال تو ہے ساقی اور مے پرستیاں ہیں

اُن نے کہا یہ مجھ سے اب چھوڑ دخترِ رز کو
پیری میں اے دِوانے یہ کون مستیاں ہیں

لختِ جگر آنکھوں سے ہر آن نکلتے ہیں
یہ دل سے محبت کے ارمان نکلتے ہیں

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

آہ اپنی میں اثر ڈھونڈے ہے اے سودا تو کیا
بیدِ مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

آئے تھے سبھی ہم نفس اک بار تہِ دام — آزاد ہوئے اور گرفتار رہا میں
صد شکر کہ رحمت کا سزاوار ہوں سوداؔ — گو شیخ کے نزدیک گنہ گار رہا میں

مہر ہر ذرّے میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے — تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں
پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل — ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں — کچھ علاج اُن کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر — کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

تو نے سوداؔ کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں — دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانے میں
ہم سا تجھے تو ایک ہمیں تجھ سے ہیں کئی — جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں
سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

ساقی ہے یک تبسمِ گل موسمِ بہار — ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں
جادو بھری ہیں چشم میں مت آئینے کو دیکھ — دھڑکے ہے دل مرا کہ نہ پلٹے نظر کہیں

خوباں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں — خواہانِ جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں

چشم ہوس اٹھائیے تماشے سے جوں حباب — نادیدنی کا دید بس اک دم بہت ہے یاں
دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل — کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں
سودا کہہ اس سے دل کی تسلی کے واسطے — گوشے سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

بل بے ساقی تیری بے پروائیاں — جانیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں

یوں پاس بیٹھا تو جس کو چاہے — پرجاگہ نہ دیجو یار جی میں

یار آزردہ ہوا رات جو مے نوشی میں — کیا ہوا ہم سے خدا جانیئے بے ہوشی میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں — اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

ترغیب نہ کر سیر چمن کی ہمیں سودا — ہر چند ہوا خوب ہے واں لیک ہوس کو

مے کشاں! روح ہماری بھی کبھی شاد کرو — ٹوٹے گر بزم میں شیشہ تو ہمیں یاد کرو

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا — ہونی جو کچھ تھی قبلہ حاجات ہوگئی
مستی سے اس نگاہ کی بے محتسب خبر — دنیا تمام بزم خرابات ہوگئی
یارو وہ شرم سے جو نہ بولا تو کیا ہوا — نظروں میں سو طرح کی حکایات ہوگئی

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی — اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ   کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات   آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

نسیم بھی ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے   ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے
نزاع عز و در مرا عجز تا کجا ظالم   ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں   کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے   یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

بے وفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی   تیری نسبت تو میاں بلبل سے گل نے خوب کی

اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا   ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو گئے

مجھ کو سونپا ہے زمانے کے تئیں قسمت نے   دستِ نامرد میں شمشیر بہت اچھی ہے
لے کے کعبے سے کیا سیر میں میخانے تک   خانۂ دل ہی کی تعمیر بہت اچھی ہے
کیوں ہے خاموش مری طرح چمن میں بلبل   تیرے نالے کی تو تاثیر بہت اچھی ہے

ہو دیں گے ترے کوچے میں یوں دل تو ہزاروں   میرا جو اک دل ان میں ہے بسمل تو وہی ہے
خواری کا نہ کر اپنے دلا یار سے شکوہ   رسوا جو ہوا عشق میں کامل تو وہی ہے

ناصح جفائے عشق اگر ہیں سہی سہی   تو نے بھی کچھ زراہ نصیحت کہی کہی

دریائے عشق کیا میں بتاؤں کہ جس کے بیچ
کشتی پھرے ہے عقل کی تیری . بہی . بہی
یہ دل نہ کھول زلف سے ظالم خدا کو مان
لاکھوں گرہ جہاں ہیں تو یہ بھی رہی رہی

جب اس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
اک ہمصفیر نے بھی نہ دیکھا کہاں چلے
کیا لے لیا تھا ہم نے اُلجھنا جو کوئی خار
جوں گل ہم اس کے باغ سے دامن فشاں چلے
غافل ہماری آہ سے رہنا نہ بے خطر
کر خوف ایسے تیر سے جو بے کماں چلے

حسن و عشق ایسا نہیں ہو جس میں دخل انصاف کو
جرم عاشق ہو نہ ہو تعزیر دامن گیر ہے
دیر سے میرا نکلنا جوں حرم آساں نہیں
کھینچتا ہر بُت کی واں تصویر دامن گیر ہے
مخلصی سوداؔ کی کچھ حق کے کرم سے ہو تو ہو
ورنہ یاں ہر کام کی تقصیر دامن گیر ہے

اب کے بھی دن بہار کے یونہی چلے گئے
پھر پھر گل آ چکے پہ سجن تم بھلے گئے
پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب
ٹوٹے جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

بے چین جو رکھتی ہے تمہیں چاہ کسو کی
شاید کہ ہوئی کارگر آہ کسو کی
اس چشم کا غمزہ جو کرے قتل دو عالم
گوشے کو نگہ کے نہیں پرواہ کسو کی

کرے ہے توبہ جو واعظ کی ہرزہ گوئی سے
نگہ بہار کو سوداؔ نے دور دیکھا ہے

ہم ہیں وابستہ محبت کی مددگاری سے
سب سے آزاد ہوئے دل کی گرفتاری سے
شکوہ ہے جور و جفا کا ترے کس کافر کو
مجھ پہ گزرے ہے سو میری ہی وفاداری سے

تری آنکھوں نے نرگس سے چمن میں یاری ایسی کی — کہ اب چھپتے نہیں آتے نظر بیمار ایسی کی
تری دوری بہار باغ سے جو کچھ کہ کرتی ہے — خزاں نے کس چمن میں باگل و گلزار ایسی کی
بیک نقدِ محبت جنسِ دل بکتی نہیں سودا — بتاں نے داغ سے دے کر خراب و خوار ایسی کی

مگر وہ دید کو آیا تھا باغ میں گل کے — کہ بو کچھ اور ہی پائی دماغ میں گل کے
چمن کھلے ہیں پہنچ بادہ لے کے اے ساقی — گرفتہ دل مجھے مت کر فراق میں گل کے
نہیں ہے جائے ترنم یہ بوستاں کہ نہیں — سوائے خونِ جگر مے ایاغ میں گل کے

قامت نے تیرے باغ میں جا خطِ بندگی — لکھوا لیا ہے سرو چمن سے کھڑے کھڑے
سودا کے ہوتے وامق و مجنوں کا ذکر کیا — عالم عبث اکھاڑے ہے مردے گڑے گڑے

غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے — نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے

پھرتے ہو باغ سے تو ٹپکا ہے ہے عندلیب — صبحِ بہارِ گل پہ شبِ تار کر چلے
آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب — پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

ادا تو لے گئی دل کو پر اس کا ناز اے محرم — بغیر از جی لیے کافر مری چھاتی سے ٹلتا ہے
اثر نے آہ میں ہر چند نے تاثیر نالے میں — پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

نالاں ہوں مدتوں سے ترے سائے کے تلے — پوچھا نہ یہ کبھو پسِ دیوار کون ہے
ہر آن دیکھتا ہوں میں اپنے صنم کو شیخ — تیرے خدا کا طالب دیدار کون ہے

سودا کو جرمِ عشق سے کرتے ہیں آج قتل
پہچانتا ہے تو یہ گنہ گار کون ہے

پاس اب ہمارے نکہتِ گل کو نہ لا نسیم
دل سے ہوس چمن کی اسیروں نے دور کی

الفت میں کچھ اپنی بھی اثر چاہیئے سودا
ہر چند وفا شیوۂ محبوب نہیں ہے

اشرف علی فغاںؔ دہلوی

مجھ سا گرفتہ دل بھی کبھی شاد ہووے گا
یہ خانماں خراب بھی آباد ہووے گا
اس سال ہم نفس مرے آزاد ہو گئے
مجھ پر بھی مہربان کبھی صیاد ہووے گا

دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے
گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا

باقی ہے کیا گلوں کا وہی رنگ اب تلک
بلبل جو ہے چمن میں خوش آہنگ اب تلک

بادِ صبا تو عقدہ کشا اس کی ہو جیو
مجھ سا گرفتہ دل نظر آوے اگر کہیں
میری طرف سے خاطرِ صیاد جمع ہے
اڑتا ہے یعنی طائرِ بے بال و پر کہیں

یہی دعا ہے اسیروں کی اے خزاں ہر دم
نہ ہم قفس میں رہیں اور نہ تو چمن میں رہے

قاصد تو نا امید پھرا کوئے یار سے
خفت ہوئی مجھے دل امیدوار سے

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی　　اے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی

خواجہ میر درد

جگ میں آ کر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی　　جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ، فریاد و آہ اور زاری　　آپ سے ہو سکا تو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
زورِ عاشق مزاج ہے کوئی　　دردؔ کا قصہ مختصر دیکھا

ہم نے چاہا بھی پر اس کوچے سے آیا نہ گیا　　واں سے جوں نقشِ قدم دل تو اٹھایا نہ گیا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا　　پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما　　اس طرف کو کبھی گزر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم　　نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب　　خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
سب کے جوہر نظر میں آئے دردؔ　　بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر　　لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا

ہم جانتے نہیں ہیں اے دردؔ کیا ہے کعبہ　　جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شیخ کعبے ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا
بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
پہنچا اس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانے
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں پڑا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

اے جنوں جیب میں تیرے ہاتھوں
ایک بھی تار خوش نہیں آتا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر　　　میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

چٹکا عبث نہیں کوئی غنچہ چمن میں آ　　　اے نوگل بہار تجھے تازیانہ تھا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک　　　اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا　　　کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا
اس نے قصداً بھی میرے نالے کو　　　نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا
دیکھیے غم سے اب کے جی میرا　　　نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم　　　کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غم زدہ کا جس تس نے　　　جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں　　　کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا　　　کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا　　　آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

گلی سے ترے دل کو لے تو چلا ہوں　　　میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا
خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تو　　　کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل　　　گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہے دیدہ دیکھ شبنم کا

خارِ مژہ پڑے ہیں مری خاک میں ملے　　　اے وحشت اپنے کیجیو داماں کی احتیاط

جوشِ جنوں کے ہاتھوں سے فصلِ بہار میں   گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط
تیرے ہی دیکھنے کے لئے آئینے کی طرح   کرتا ہوں اپنے دیدۂ گریاں کی احتیاط
دل کے تئیں گرہ سے کبھو کھولتے نہیں   ہے زلف کو بھی اپنے پریشاں کی احتیاط
داغوں کو اپنے کیوں نہ کرے درد پرورش   ہر باغباں کرے ہے گلستاں کی احتیاط

مجنوں ہو خواہ کوہ کن ہو   عاشق کے دوست دار ہیں ہم
اپنے ملنے سے منع مت کر   اس میں بے اختیار ہیں ہم

کدھر بھٹکی پھرتی ہے اے بیکسی تو   تری جنس کا یاں خریدار میں ہوں

بساں کا نخلِ آتش زدہ مرے گل رو   ترے جلے بھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر   مگر یہ زندگیٔ مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری   یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں
بتوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے   جو اس پہ بھی نہ ملیں اختیار رکھتے ہیں
ہر ایک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں   خنک یہ سب ہیں پہ دل میں شرار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا   اگرچہ درد اسے ہم ہزار رکھتے ہیں

ادھر بھی اہلِ بزم توجہ ضرور ہے   کچھ کچھ کہے ہے شمع بھی اپنی زبان میں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار   کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول   منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پروانہ — کہ حالِ دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں — یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں
گرے ہے مست نگاہوں میں ایک عالم کو — لئے پھرے ہے یہ ساقی شراب آنکھوں میں

افسوس اہلِ دید کو گلشن میں جا نہیں — نرگس کی گو کہ آنکھیں ہیں پر سوجھتا نہیں

.. شیخ میں رشکِ بے گناہی ہوں — موردِ رحمتِ الٰہی ہوں

مجلس میں بار ہووے نہ شمع و چراغ کو — لاویں اگر ہم اپنے دلِ داغ داغ کو
جاتی تو ہے تو زلف کے کوچے کو اے صبا — پر دیکھیو نہ چھیڑے کسی بے دماغ کو
بس بار دل زیادہ نہ ہو حسرتِ چمن — کیدھر لئے پھروں گا میں گلگشتِ باغ کو
بلبل کی طرح رشتۂ الفت میں دیکھ دل — بندھوا نہ دیجیو کہیں بالِ فراغ کو
اے درد رفتہ رفتہ کب آپ کو بھی گم — اس راہ میں چلا تھا میں کس کے سراغ کو

مت کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہووے — دوستاں درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

اس کی بہار حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے — فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یہ گل فروش ہے
خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل — حسن بلائے چشم ہے نغمہ و بالِ گوش ہے

خیر تجھے جو چاہیے بدرقہ جنوں نہ چھوڑ　　ہم نے جہاں کی سیر کی رہزن خلق ہوش ہے
غیر ملال زاہدا کیا ہے طریق زہد میں　　دل ہو شگفتہ جس جگہ کوچۂ مے فروش ہے

گزرا ہے بتا کون صبا آج ادھر سے　　گلشن میں پڑی پھولوں کی یہ باس نہیں ہے
بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کر اے درد　　ہر دم دم عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں ہے

آگے جو بلا آئی تھی سو دل پہ ٹلی تھی　　اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

آتش عشق جی جلاتی ہے　　یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
تو ہے اور سیر باغ ہے ہر وقت　　داغ ہیں اور میری چھاتی ہے
شام بھی ہو چکی کہیں اب تو　　اُشتابی کہ رات جاتی ہے
درد اس کی بھی دید کر لیجے　　نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے
بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے درد　　کہ بُو گلاب کی آتی ترے پسینے سے

دید وا دید ہوئی دُور سے میری اُس کی　　پر جو میں چاہا تھا سو بات نہ ہونے پائی
اُٹھ چلے شیخ جی تم مجلس رنداں سے شتاب　　ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی
جی فنا ہو ہی گیا اک نگہ گرم کے ساتھ　　درد کچھ اور عنایات نہ ہونے پائی

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف　　جس کے ہاتھ آوے جام جم ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا　　میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا　　گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے
نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر　　جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

کھلتی ہے میری آنکھ جو احوال پہ اپنے　　جوں شمع گھٹا جاتا ہوں میں اپنی نظر سے

دل دے کے ستمگار سے اظہار محبت　　ایسا کہیں پھر دیکھو تو زنہار نہ ہووے
گر قید ہی قسمت میں ہے کچھ اور نہ ہو یارب　　پر دل کسو دل سے تو گرفتار نہ ہووے

جی کڑا کر کے ترے کوچے سے جب جاتا ہوں　　دل دشمن یہ مجھے گھیر کے پھر لاتا ہے
دردؔ کی قدر مرے یار سمجھنا واللہ　　ایسا آزاد ترے دام میں یوں آتا ہے

لا گلابی دے مجھے ساقی کہ یاں مجلس ہی　　خالی ہو جاتی ہے پیمانے کے بھرتے بھرتے
جو گیا کوچے میں اس کے نہ پھرا ایدھر کو　　اے صبا جاتی تو ہے جائیو ڈرتے ڈرتے

ناداں نظر سے اپنی گرا دے نہ دردؔ کو　　جو کچھ کہ ہے سو ہے پہ ترا دوستدار ہے

کعبے کو بھی نہ جائیے دیر کو بھی نہ کیجے منہ　　دل میں کسو کے درد یاں ہووے تو راہ کیجیے

پوچھ مت قافلۂ عشق کدھر جاتا ہے　　راہرو آپ سے اس راہ میں گذر جاتا ہے
گو اچٹتا ہے مرا نالہ بتوں کے دل سے　　کچھ نہ کچھ کام تو اپنا بھی یہ کر جاتا ہے

ہر چند تجھے صبر نہیں درد و لیکن — اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

کاش نا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ — تم نے کیا قہر کیا بال و پرِ پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے اُسے دیکھا تھا بھی — پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ
کیوں اُسے آتشِ سوزاں میں لیے جاتی ہے — سوجھتا بھی ہے تجھے اے نظرِ پروانہ
ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُس نے — راہ رو زشمع کی جا ہے سفرِ پروانہ
شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی — پوچھوں اے درد میں کس سے خبرِ پروانہ

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں — مجھے اپنے رونے ہی سے آبرو ہے

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے — کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا — ایک دم آئے اِدھر اودھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس — تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے — وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے
جو شرارِ ہستیٔ بے بود یاں — بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں — فائدہ اس زیان میں کچھ ہے

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے — معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

اب کون حال دل کہے اس مستِ ناز سے — اک آہ تھی سو وہ بھی سر اپنا پٹک گئی

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے — یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کی کیا چلے
کہہ بیٹھیو نہ درد کہ اہلِ وفا ہوں میں — اس بے وفا کے آگے جو ذکرِ وفا چلے

دم لینے کی فرصت یہاں ٹک دی نہ زمانے نے — ہم تجھ کو دکھا دیتے کچھ آہ بھی ہوتی ہے

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجے کیونکر — ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

دل دے چکا ہوں اس بُتِ کافر کے ہاتھ میں — اب میرے حق میں دیکھیے اللہ کیا کرے

یہی پیغام درد کا کہنا — گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملیے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے — جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے

روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اگر بے حجابانہ وہ بُت ملے
غرض پھر تو اللہ ہی اللہ ہے
عدم رفتگاں کو جو کہنا ہے کچھ
تو قاصد ہمارا سرِ راہ ہے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

اٹھتی نہیں ہے خانہ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

مانندِ صبا تری گلی سے
جو کوئی گیا پھر نہ واں سے

خبر اپنی لے اے گلستانِ خوبی
کرے ہے تبسّم تری گل فروشی

دشوار ہوتی ظالم تجھ کو بھی نیند آنی
لیکن سُنی نہ تو نے ٹک بھی مری کہانی
میرے غبار کا کچھ پایا نشاں نہ ہرگز
صحرا میں جا صبا نے ہر چند خاک چھانی

سوائے تیرے کسو سے نہیں ہے واشدیاں
مثالِ آئینہ اے چشمِ انتظار مجھے

مت جا ترو تازگی پہ اُس کی
عالم تو خیال کا چمن ہے

اک خلق سیہ مست مے بے خبری ہے
کس زلف کی بُو تجھ میں نسیم سحری ہے
غافل تو کدھر بھٹکے ہے ٹک دل کی خبر لے
شیشہ جو بغل میں ہے اسی میں تو پری ہے

سیّد محمد میرسوزؔ

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا
جل گیا، بل گیا، کباب ہوا
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھمتا
کیا بلا دل ہی دل میں آب ہوا
یار اغیار ہو گیا ہیہات
کیا زمانے کو انقلاب ہوا

ہوا دل کو میں کہتا دوانہ
پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا
کوئی دم تو بیٹھے رہو پاس میرے
میاں میں بھی چلتا ہوں ٹک دم لے جانا
مجھے تو تمہاری خوشی چاہیے ہے
تمہیں گو ہے منظور میرا کڑھانا
کہاں ڈھونڈوں ہے ہے کدھر جاؤں یارب
کہیں جاں کا پاتا نہیں میں ٹھکانا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جاگر پڑے گلزار پیدا ہو

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لئے
ہاتھ میں اک روز تو دامنِ قاتل ہووے گا

کعبے ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
جو تم سے بتو ہو گا سو اللہ کرے گا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ
دیکھا مزا نا تونے ناداں عاشقی کا

آتی شمیم کچھ تو اس زلفِ عنبریں کی
بادِ صبا کا ہوتا اس جا اگر گزارا

کس کی مجال دیکھے اس حُسن آفریں کو
ہر چند اس کا جلوہ ہے عام آشکارا

دعوے کیا تھا میں نے اس رُخ سے رنگ و بُو کا
ماریں صبا نے دھولیں شبنم نے منہ پہ تھوکا

مجھ کو دھوکا دیا کہا کہ شراب
ان آنکھوں کا ہووے خانہ خراب

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

سیرِ گلشن سے مجھ کو کیا ہے کام
مگر آتی ہے اس صنم کی باس

بھلا اے عشق تیری شوکت و شان
بھائی مرے توڑ گئے اوسان

بس غمِ یار ایک دن دو دن
اس سے زیادہ نہ ہو جیو جہان

نہ کہ بیٹھے ہو پاؤں پھیلا کر
اپنے گھر جاؤ خانہ آبادان

وے صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

اے اہلِ بزم میں بھی مرقعے میں دہر کے
تصویر ہوں ولے لبِ حسرت گزیدہ ہوں

مرا جان جاتا ہے یارو بچا لو
کلیجے میں کانٹا گڑا ہے نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو

خدا کے لئے میرے اے ہم نشینو! | وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے | تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمہارے کہے سے | تو منت کرو گھیرے گھیرے منالو
قطعہ
کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے | اسے جان کندن سے چل کر بچالو
جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے | تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو | راہ ملتی ہی نہیں دشت کے آواروں کو

کسی عنوان اس کو چین نہیں | آہ لے جائیے کہاں دل کو

او مارِ سیاہ زلف سچ کہہ | بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے | کاٹا نہ ہمی ترا برا ہو

آہستہ رو تو منزلِ مقصود پر گئے | رفتارِ گرم تھے سو ہمیں درمیاں رہے
اے رہرواں غریب کے احوال پر نظر | ہے جائے گریہ یہ کہ پسِ کارواں رہے

دامن تلک تو تیرے کہاں دسترس مجھے | تیری گلی کی خاک میں ہوں تو ہے بس مجھے

کرنے کی نہیں فائدہ تدبیر کسی کی | پاؤں میں پڑی زلفِ گرہ گیر کسی کی
دل آپ ہی پر کالۂ آتش ہے کہوں کیا | اس امر میں ہرگز نہیں تقصیر کسی کی

منہ دیکھو آئینے کا تری تاب لا سکے | خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا | پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

مکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھنگ نکالا ہے | ہر اک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے؟ | دل جو اب بے قرار ہے کیا ہے؟

شیخ قیام الدّین قائمؔ

عہدے سے اس صنم کے بر آیا نہ جائیگا | یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائیگا
کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ | کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائیگا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائمؔ | شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

جلوہ ہر رنگ میں ہے اُس بتِ ہرجائی کا | یہ پریشاں نظری کام ہے بینائی کا

چھوٹ کر دام سے ہم گرچہ رہے گلشن میں | پر تری قید کو صیاد بہت یاد کیا

بے دماغی سے نہ اس تنک دلِ رنجور گیا | مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دُور گیا

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے | کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا

قسمت تو دیکھو ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون — پیام بر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

شمیمِ زلف کا کس کے چمن میں تھا مذکور — نسیم نکہتِ گل سے ہے بے دماغ ہنوز

ترے دامن تلک ہی پہنچوں اور — خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں — ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

نہ دل بھرا ہے نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

سمجھ کے شیشۂ دل کو ٹپکیو اے بُتِ مست — بجائے بادہ لہو ہے اس آبگینے میں

وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا نازِ نکہتِ گل — ہے بے دماغیِ دل ان دنوں گراں مجھ کو

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ — ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

اک ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ

کسے گل گشت گلشن کی ہوس ہے — اسیری کا جگر پرداغ بس ہے

شب گریے سے وابستہ مری دل شکنی تھی — جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

دامانِ گل تنیش ہے کہاں دسترس مجھے — تکلیفِ سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے

بھٹکا پھروں ہوں یاں جو اکیلا میں ہر طرف — اے ہمرہانِ پیش قدم تم کدھر گئے؟

دو چیزیں ہیں یادگارِ دوراں — تیرا ستم اپنی جاں فشانی

عشق تو قائم نہ ہوا آپ سے — اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہئے

دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک — اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے

دل ڈھونڈتا سینے میں مرے بوالعجبی ہے — اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

دم بدم اس رنجش بے جا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھ کو تو کچھ میں نے گنہ گاری نہ کی

انعام اللہ خاں یقینؔ

اس گل سے کچھ حجاب ہمیں درمیاں نہ تھا
جس دن کہ یہ بہار نہ تھی گلستاں نہ تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

پھر کوئی سلسلہ جنباں ہوا زنداں کے بیچ
آج زنجیر سے آتی ہے جھنک کان کے بیچ

فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھئے کیا ہو یقیںؔ
اب کی چلتا ہے جنوں پہ جی ہمارا بے طرح

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیںؔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

جی میں آتا ہے تری چھب کو دکھا دیجے اسے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
ہم ہوئے ایسے برے وقت میں آزاد کہ بس

ناصح سے غم نے مجھ کو کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کوئی دن چلنے پھرنے دیں عبث زنجیر کرتے ہیں
دوانا مجھ سا کب چلتا ہے کیوں تدبیر کرتے ہیں

کعبے سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو　　کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

جنوں کے ہاتھ سے محفوظ اک دم رہ نہیں سکتا　　رفو کرنا یقیںؔ میرے گریباں کے نہیں لائق

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں　　عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے　　بے گانگی سے اس کی کوئی آشنا نہیں

جس محبت میں نہیں ہے شور ہے وہ بے نمک　　کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں
بن یقیںؔ کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب　　سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

بہ مقدارِ جفائے یار بڑھتی ہے وفا میری　　کوئی چاہا ہے تو آ دیکھے محبت اس کو کہتے ہیں

کرتا ہے کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں　　مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

گلی میں عشق کی دل بھول جا پڑا تھا یقیںؔ　　پھر اُن دنوں سے دوانے کا کچھ سراغ نہیں

عمر آخر ہے جنوں کر لوں بہاراں پھر کہاں　　ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں
ہے بہشتوں میں یقیںؔ سب کچھ ولیکن درد نہ　　بھر کے دل رو لیجئے یہ چشم گریاں پھر کہاں

بلائے عقل سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں　　بغیر مے کدہ یارو کہیں پناہ نہیں

اسیرانِ قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو — بہار آوے تو اے صیاد مت ہم کو خبر کیجو
کہا جاتا نہیں مجھ سے جو کچھ تیں کہہ سکے کہیو — مری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر کیجو

عمر میں تیں نے تو دیکھی ہے بہت غمخواری — اب تو اے چرخ ٹک اک اس دل ناشاد کو دیکھ

کیا دھوم مچائی ہے صحرا میں دوانوں نے — اس فصل مبارک میں آباد ہے ویرانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیںؔ مجھ سے — کیا خوب نہیں سنتا افسوں ہے یہ افسانہ

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا — بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اُس کی — محبت میں یقیںؔ لیتا ہے نامِ مدعا کوئی؟

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
ناصحو! یہ بھی کچھ نصیحت ہے — کہ یقیںؔ یار سے وفا نہ کرے

دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا — اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

گریباں چاک کرنے سے کسو کے کیا تجھے ناصح
ہمارا ہاتھ جانے اور ہمارا پیرہن جانے

خواجہ احسن اللہ بیاںؔ

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ
کانوں تلک تو اُس کے تو اے نارسا پہنچ

ہم سرگشتہ کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ
دل میں اس شوخ کے تو راہ نہ کی

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے
یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے
کیا ہے عجز نے میرے اسے بیاںؔ مغرور
مری وفا اُسے جور و جفا سکھاتی ہے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی

رسوا نہ کر خدا سے ڈرا اے چشمِ تر مجھے
آنا ہے اُس کی بزم میں بارِ دگر مجھے

اُلجھ دیکھو دامن سے اس کے بھی ہاتھو
یہ مجھ ناتواں کا گریباں نہ ہووے

آفریں صبر کو بیاںؔ تیرے
مر گیا ضبط سے پہ آہ نہ کی

ہے کدھر قیس کہاں ہے فرہاد
عشق سے نام چلا جاتا ہے

کہا تھا سارہ باں کے کان میں لیلیٰ نے آہستہ　　کہ مجنوں کی خرابی کا کہیں مذکور مت کیجو

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

دور میں اس کی مست آنکھوں کے　　محتسب بھی شراب خوار رہا

حیا کے پردے میں مارا ہے ایک عالم کو　　شہید میں تو ہوں اُن شرمگیں نگاہوں کا

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اُس سے کہیں گے　　پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

سونپا ہوا داغ اُن کا تازہ ہی سدا رکھا　　ہم نے اس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا

تا خواب مرگ ذکر تھا اُن کا زبان پر　　نیند آ گئی ہمیں تو اسی داستان پر

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے　　قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز
شیخ اس بُت شکنی پر نہ ہو اتنا مغرور　　تو نے توڑا نہیں اپنا بُت پندار ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا　　لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنسِ وفا ہم

آہ عالم کی ہم اس وضع سے حیران ہوئے　　وحشت یاں شہر ہوئے شہر بیابان ہوئے
دم میں آزاد کیا قید سے ہستی کی ہمیں　　تیغِ قاتل کے تو ہم بندۂ احسان ہوئے

احمد علی جوہر

آتش وہ چمن ہو یا برقِ آشیاں ہو
اے مرغِ نالہ کچھ ہو یک شب تو پرفشاں ہو
شاید کہ پہنچے تجھ تک واماندہ کوئی ہم سا
آوارۂ بیاباں اے گردِ کارواں ہو
گر ہو سکے ہے تجھ سے اٹھ اے غبارِ مجنوں
ناقے کے ساتھ تو بھی اک دو قدم رواں ہو

نظیر اکبر آبادی

دُور سے آئے تھے ساقی سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

جُدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

سید محمد میر اثر

بلبل کرے ہے نالہ و گُل ہے جگر فگار
شاید کہ باغ میں وہ گل اندام ہو گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا پر بتوں سے آہ
پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

کیا بتاویں کہ اس چمن کے بیچ
کبھو اپنا بھی آشیانہ تھا

ہوشیار دل سے مل کے بجاؤ گے
کہ آخر بھی کوئی دوا نہ تھا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں
یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر ہمیں تو اثرؔ کی آس نہیں

مر تو چلے کہاں تلک اب در گزر کریں
یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں
وابستہ سب یہ اپنے ہی دل سے ہے کائنات
گو ہو جہاں پر آپ نہیں تو جہاں نہیں

کیا کیجئے اختیار نہیں دل کی چاہ میں
ہیں سب وگرنہ تیری یہ بانکی نگاہ میں

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا
تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں
کچھ نہ ہوتا اثرؔ اثر اُس کو
بھلے کو نالہ تو کب ہی نہیں

وہی میں ہوں اثرؔ وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

غرض آئینہ داری دل ہے
تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے
ہے دیوانا بکار خود ہشیار
یہ نہ سمجھو اثرؔ دیوانا ہے

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثرؔ ہی نہیں

ہر چند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں
آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آئے

کلیجہ پک گیا ہیں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اُس میں خیال خام رہتا ہے

دل نے مجھ سے آشنہ کیا سو کیا
کیا کہوں مہربان اپنا ہے

کون سنتا ہے یاں کسو کی بات
بس آشنہ قصہ مختصر کیجے

ہر دم فزوں ہیں کج رویاں روزگار کی
کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی

دل ہر اک سے لڑاتے پھرتے ہو
آنکھ تو ہم سے بھی لڑائیے گا
آشنہ اتنا تو التماس کروں
ہر کسی کی دغا نہ کھائیے گا

فرصت زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

یاں غم ہی اب رہے گا بس یا کہ ہم رہیں گے
وہ دن گئے کہ یک جا دونوں بہم رہیں گے

رام انند رام مخلص دہلوی

دھوم اُڈنے کی کس کی گلزار میں پڑی ہے
ہاتھ ادب گجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

میر غلام حسن حسن دہلوی

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
ہیں تماشا وفا کا دکھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ | دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

چھوٹتا نہ واں تغافل اس اپنے مہرباں کا | اور کام کر چکا یاں یہ اضطراب جاں کا
سامان لے چلا ہے اندوہ کا یہیں سے | کیا جانیے ارادہ دل نے کیا کہاں کا

اپنی طرف سے ہم نے تم سے بہت نباہا | پر آہ کیجئے کیا تم نے ہمیں نہ چاہا

عشق کب تک آگ سینے میں مرے بھڑکائیگا | راکھ تو میں ہو چکا کیا خاک اب سلگائے گا

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں | لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا
کر چکے صحرا میں وحشت پھر چکے گلیوں میں ہم | دیکھئے اب کام ہم کو عشق کیا فرمائے گا

کوئی دم کے ہیں مہماں اس چمن میں ایک دم آخر | مثالِ نکہتِ گل شام جانا یا سحر جانا

وہ آشفتہ بلبل میں جاتا ہوں یاں سے | کہ جس بن چمن سب پریشاں رہے گا

آساں تم نہ سمجھو نخوت سے پاک ہونا | اک عمر کھو کے ہم نے سیکھا ہے خاک ہونا

اتنا بھی تو بے چین نہ رکھ دل کو مرے تو | آخر یہ وہی دل ہے جو آرام طلب تھا
کعبے کو گیا چھوڑ کے کیوں دل کو تو اے شیخ | ٹک جی میں سمجھتا تو یہی یاں بھی تو رب تھا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

بت خانے ہی میں چل بیٹھ یا کعبے میں حسن اب — یوں کب تلک دوانے تو در بدر رہے گا

اظہار خوشی میں ہے سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

پا برہنہ ساتھ ناقے کے چلا آتا ہے قیس — اک طرف کردے صبا خارِ مغیلاں دیکھ کر
دامن صحرا سے اٹھنے کو حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

رہا گل نہ خار ہی آخر — اک رہا حسن یار ہی آخر
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے تو کیا — ہو چلی واں بہار ہی آخر
آتش دل پہ آب لے دوڑا — دیدۂ اشکبار ہی آخر

دونوں دیوانے ہیں کیا سمجھیں گے آپس میں عبث — ہم کو سمجھاتا ہے دل اور دل کو سمجھاتے ہیں ہم

بس دل کا غبار دھو چکے ہم — رونا تھا جو کچھ سو رو چکے ہم
ہونے کی رکھیں توقع اب خاک — ہونا تھا جو کچھ سو ہو چکے ہم

دل غم سے ترے لگا گئے ہم — کس آگ سے دل جلا گئے ہم
مانندِ حباب اس جہاں میں — کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

آرزوِ دل کی برآئی نہ حسن وصل میں اور | لذتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ | بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

عشق کا اب مرتبہ پہنچا مقابل حسن کے | بن گئے بُت ہم بھی آخر اس صنم کی یاد میں

حسن میں جب نہیں گرمی نہ ہو جی دیوے کون | شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں

دل اور جگر لہو ہو آنکھوں تلک تو پہنچے | کیا حکم ہے اب آگے نکلیں کہو نہ نکلیں[1]

صیّاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں | نالے نہ کریں مرغِ گرفتار قفس میں

اُس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں | اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

بن کہے بنتی نہیں کہیے تو سنتا نہیں وہ | حال دل اس سے ہم اظہار کریں یا نہ کریں

حسنؔ دیکھو قدم ہرگز نہ صحرائے محبت میں | کہ ہے سر سے گزرنا رسم یاں کی راہ منزل میں

---

[1] اس شعر کا مضمون حافظ کے اس شعر سے ملتا جلتا ہے ؎

عزمِ دیدارِ تو دارد جان بر لب آمدہ
باز گردد یا بر آید چیست فرمانِ شما؟

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

دل صد پارہ میرے کی تو پہلے فکر کر ناصح
رفو کیجو پھر اس کے بعد تو چاک گریباں کو

نہیں تقصیر کانٹوں کی مرا چھالا ہی پاؤں کا
برنگ کہربا کھینچے ہے خود خارِ مغیلاں کو
نہیں معلوم یہ کس کا ہے اتنا منتظر یا رب
کہ ہیں مُندتے نہیں دیکھا حسن کی چشم حیراں کو

دیکھنا زلف و رُخ تمہیں ہر دم
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو
گُل ہوئے جاتے ہیں چراغ کی طرح
ہم کو ٹک جلد آن کر دیکھو

ناقے سے دُور رہ گیا آخر نہ قیس تو
کہتے نہ تھے کہ پاؤں سے مت کھینچ خار کو

کہیو صبا کہ جس کو تو بھولا گیا تھا سو
جوں نقش پا پڑا تری دیکھے ہے راہ وہ

اترائیو مت حسن پہ ناداں بہت کچھ
دیکھا ہے ان آنکھوں نے مری جاں بہت کچھ

اس بُت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن
یہ بات بھی نہیں نہ خُدا کو بُری لگے

ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی
تمام عمر گئی پر ہم یہ سر نہ ہوئی

شبِ فراق میں رو رو کے مر گئے آخر
یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے کترا کے کبھی — دل مجھے پھیر کے کہتا ہے ادھر کو چلئے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں — ہاں مگر ایک ترے ملنے کا ارمان تو ہے

کیا جانئے کہ شمع سے کیا صبح کہہ گئی — اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش رہ گئی

پھر دہک اٹھی آگ دل کی ہائے — ہم نے رو رو ابھی بجھائی تھی
دل کو روؤں کہ یا جگر کو حسنؔ — مجھ کو دونوں سے آشنائی تھی

شبنم کی طرح سیر چمن بھی ضرور ہے — رو دھو کے ایک رات یہاں بھی گزاریئے

اتنا معلوم تو ہوتا ہے کہ جاتا ہوں کہیں — کوئی ہے مجھ میں کہ مجھ سے لئے جاتا ہے مجھے
تجھ کو منظور جفا مجھ کو ہے مطلوب وفا — نہ یہ بھاتا ہے تجھے اور نہ وہ بھاتا ہے مجھے

کسی کی بے وفائی سے مجھے کیا — میں اپنا کام رکھتا ہوں وفا سے

کس کس کے غم کو سنئے حسنؔ اب وہ دل نہیں — اپنی ہی سرگزشت سے جی اپنا سیر ہے

صورت نہ ہم نے دیکھی حرم کی نہ دیر کی — بیٹھے ہی بیٹھے ہم نے دو عالم کی سیر کی

یار کا دھیان ہم نہ چھوڑیں گے — اپنی یہ آن ہم نہ چھوڑیں گے

جب تلک دم میں ہے ہمارے دم	تجھ کو اے جان ہم نہ چھوڑیں گے
ہے بڑا کفر ترکِ عشق بتاں	اپنا ایمان ہم نہ چھوڑیں گے
دل نہ چھوڑے گا تیرا دامن اور	دل کا داماں ہم نہ چھوڑیں گے

آ جا کہیں شتاب کہ مانندِ نقشِ پا	تکتے ہیں تیری راہ سرِ راہ میں پڑے

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن	فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آتی ہے
جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسنؔ	اب چمن میں ہیں تو پھر یادِ قفس آتی ہے

ہو چکا حشر بھی حسنؔ لیکن	نہ جیے ہم فراق کے مارے

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم	کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا	ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم	حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

نہ دشتِ محبت کو سرسبز دیکھا	کئی بار خضر اس بیاباں سے گزرے
ہوئے فرشِ گل اس کے ہر ہر قدم پر	جو دامن کشاں وہ گلستاں سے گزرے

مرے جنوں پہ بہت تنگ ہے فضائے جہاں	مکان چاہیے اس کو بڑی فراغت کا

عشق مجھے اہلِ بصر کر گیا
اشک کے قطرے کو گہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے
قافلۂ صبح سفر کر گیا

عشوۂ و ناز و ادا اس کے ہی کہتے ہیں
"لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا"

کیوں قتل کیا مصحفی خستہ کو تو نے
کیا چاہنے والوں میں گنہ گار یہی تھا

کوئی یہ ساقیٔ مجلس سے کہہ دو آئے ادھر
کبھی ہمارے بھی حصے میں دور ساغر کا

کہتے ہیں کہ پھر فصلِ گل آئی ہے چمن میں
کیوں وحشتِ جنوں دھوم مچانے نہیں دیتا

اس چشم کی گردش تو مجھے لے ہی گئی تھی
پر مصحفی اپنے تئیں میں زور سنبھالا

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا
یاں عمر کا وقفہ ہے چراغ سحری کا
تربت پہ مری برگِ گل تازہ چڑھائے
احسان ہے یہ مجھ پہ نسیم سحری کا

میں ادا اُس کی کہوں کیا مرے مے نوش نے رات
سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بے نصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اُس دم پہنچے — گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

یک طرفہ مے کدہ میں یہ صحبت ہوئی کہ رات — زاہد کے سر سے بقچہ و دستار لے گیا
ہرگز بکی نہ جنس وفا گرچہ مصحفی — سو بار اس کو میں سر بازار لے گیا

شوخی تو دیکھو تیر کو سینے سے کھینچ کر — کہتا ہے میرے تیر کا سوفار رہ گیا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے — یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

اب نہ فرہاد ہے نہ مجنوں ہے — رہ گیا عاشقوں کا افسانا

جنونِ عشق جو مجھ سے نہ دشمنی کرتا — کبھی تو ہاتھ گریباں سے آشتی کرتا

نہ قفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجیو صیاد — کہ گھڑی گھڑی وہ ہووے دم اضطراب اٹھا
میرے دم اٹھنے کی جو خبر اس کو دی کسی نے — وہیں نیم رہ سے قاصد بصد اضطراب اٹھا

اک تیر میں جب اُس نے نشانا اڑا دیا — اس وقت چٹکیوں میں زمانا اڑا دیا
دستِ جنوں سے جب کہ لگیں اڑنے دھجیاں — ہم نے بھی اپنا جیب سلانا اڑا دیا

تجھے اے مصحفیؔ کیا ہے خبر درد محبت کی
نہ اے بیدرد میرے سامنے لے نام درماں کا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

تجھے کس نے روک رکھا ترے جی میں کیا یہ آئی
کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا

نالۂ صبح یہ کیا بے ادبی کرتا ہے
پایۂ عرش معلیٰ کو ہلانا نہیں خوب

بے پر و بال کیا تو بھی قفس میں مجھ کو
چین دیتی ہی نہیں شوخیٔ پرواز ہنوز

ہوں میں اے مصحفیؔ آئینۂ تہ زنگ ولے
مجھ سے غافل ہے مرا آئینہ پرداز ہنوز

بے گانگی ہے اس کی ملاقات میں ہنوز
واحسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز

اے مصحفیؔ اس کوچے میں دل بسکہ لگا ہے
جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفر روز

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ "یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس"

دیکھا ہے تجھے جلوہ کناں جب سے چمن میں
ہر گل کا اڑاتی ہے نسیم سحری رنگ

اُس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

برق و سیماب نے کہاں پایا
اس دل بے قرار کا عالم

نکلے ہے اس کی زلفِ پُرخم سے
سُنبلِ تاب دار کا عالم

اُڑنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریبان سلانے کے نہیں ہم
مر جائیں گے اے بادِ صبا دور چمن سے
پر تیری طرح خاک اڑانے کے نہیں ہم

اور سب تم سے ورے بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں کہ پرے بیٹھے ہیں
پھٹ چکا جیب سے گریباں تب سے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
شیشے کی طرح اے ساقی
چھیڑ مت ہم کو بھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

خوش رہو بے سبب خفا ہو اگر
اے بتو تم مرے خدا تو نہیں
پوچھتا کیا ہے حالِ دل کا مرے
او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

کچھ تو ملتا ہے مزا سا شبِ تنہائی میں
پر یہ معلوم نہیں کس سے ہم آغوش ہوں میں

رہنے دو مرے سینے میں پیکاں کو نہ چھیڑو
از بہر خدا ناوکِ جاناں کو نہ چھیڑو
ٹک رحم کرو چاک گریبان پہ میرے
یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو
اس دھوم سے آتی ہے بہار اب کی کہ ہرسو
غل ہے کہ برگِ گل ریحاں کو نہ چھیڑو
یہ وہ نہیں ناسور کہ ہو بند کسی سے
بہنے دو مرے دیدۂ گریاں کو نہ چھیڑو
اے ناصحو! کچھ فکر کرو چاکِ جگر کا
بیہودہ مرے چاکِ گریباں کو نہ چھیڑو
زلفیں تری زاہد سے اُلجھتی ہیں تو آنکھیں
کہتی ہیں کہ اس مردِ مسلماں کو نہ چھیڑو

رہنے دو پڑا مصحفیٔ خاک بسر کو | اس غمزدۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو

ہوا ہے عشق کا اظہار دیکھئے کیا ہو | سجی ہے اس نے بھی تلوار دیکھئے کیا ہو
تغافلوں نے ترے ہم سے روز محشر پر | رکھا ہے وعدۂ دیدار دیکھئے کیا ہو

واں چشم فسوں ساز نے باتوں میں لگایا | وسے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

اس نور تجلی میں ہیں سو برق کے انداز | سو بار کرے جلوہ تو سو بار نہاں ہو

فتنے سے کہہ رہی ہے تری شوخیٔ خرام | "میں سیر کو چلوں مرا دامن سنبھال تو"

اے شوقِ سفر اس کی خبر ہم کو بھی کرنا | گریاں سے کوئی قافلہ جاتا ہو سفر کو

کہتا ہے یہی تجھ سے ترا حسن ہمیشہ | اے برق جہاں سوز کہیں پردہ نشیں ہو

رہا کچھ آسرا رستے میں منزل تک پہنچنے کا | نظر آتی رہی جب تک کہ گرد کارواں مجھ کو

جاتا ہے لئے رشک مرے لختِ جگر کو | اور مجھ سے یہ کہتا ہے مری نامہ بری دیکھ

ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل | اب تلک دامنِ صحرا ہے غبار آلودہ

روز کی خارا تراشی سخت مجبوری ہے یہ — عاشقی کا ہے کوہے فرہاد مزدوری ہے یہ

لبِ زخم جگر سئے ہی بنی — خونِ دل ہم کو پیئے ہی بنی
دل گرا ہی پڑے ہے سینے سے — اب یہ دل ہاتھ میں لئے ہی بنی
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل — ایک شب اور بھی جئے ہی بنی

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفیؔ اسیر — فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

مرغانِ تیز بال سے شکوہ ہے یہ کہ ہائے — ہم کو اسیرِ چنگلِ صیاد کر گئے

حسرت پہ اس مسافرِ بے کس کی روئیے — جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

برقِ رخسارِ یار پھر چمکی — اس چمن کی بہار پھر چمکی
میرے گریہ سے اب وتاب آیا — صورتِ روزگار پھر چمکی

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے — پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
ذرا جواب تو دے اٹھ کے اپنے سائل کو — یہ بد نصیب ترے آستاں سے کیا پھر جائے

کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے — رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست — پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

کیوں آج ہلا جاتا ہے دل بانگِ جرس سے
کیا قافلے کے پیچھے کوئی آبلہ پا ہے

ہے نہاں داغِ جگر زخمِ نمایاں کے تلے
جس طرح لالہ کہیں ہو گلِ خنداں کے تلے
آشیاں بندی کی تکلیف نہ کر ہم کو ہوس
گر رہیں گے کسی دیوارِ گلستاں کے تلے

ترا شوقِ دیدار پیدا ہوا ہے
پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

میں نے بازارِ حسنِ خوباں سے
مول اک حسرتِ نظر لی ہے

اے دستِ جنوں تیری مدد ہو وے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے
اے مصحفیؔ اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
لیکن نہ لگا اک یہ پریشان ٹھکانے

دن جنوں کے ہیں نہ یہ تکلیف کر ناصح ہمیں
ان دنوں چاکِ گریباں کا سلانا منع ہے

ملنے کو جو تم چاہو تو ہے بات ذرا سی
اک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی
نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے
ہو جائے نگاہوں میں مکافات ذرا سی

کچھ خوب نہیں یہ خود نمائی
ہاں اے بتِ شوخ ڈر خدا سے

او دامن اٹھا کے جانے والے — ٹک ہم کو بھی خاک سے اٹھا لے
دل نے تو مجھے بہت ستایا — دشمن کے پڑے نہ کوئی پالے

دیکھے تو اک نظر بہت ہے — الفت تری اس قدر بہت ہے

تجھ کو پامال کر گیا ہے یہی — یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہل جنوں — وضع میں اس کی جو اک جامہ دری نکلے ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا — واللہ تری نرگس فتاں میں کچھ ہے
خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیر چمن سے — داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے

بلبل کے مشت پر بھی اڑاؤ تو سیر ہے — غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے
نالے تو ہم نے وادیِ غربت میں سر کئے — پر خفتگانِ خاک کو ناحق جگا چلے

صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ — عشق کی داستان چھوڑ گئے

حیراں ہوں اس قدر کہ شب وصل بھی مجھے — تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو — رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

خارِ صحرا اے جنوں دستِ درازی سے تری   چاک جاتے ہیں گریباں کو مرے داماں کے

اے عشق اب کہ وہ تری تاثیر کیا ہوئی   شورِ جنوں کدھر گیا زنجیر کیا ہوئی

دیوانہ پن کا میرے جو کرتے نہیں علاج   تدبیر کرنے والوں کی تدبیر کیا ہوئی

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں   پا بہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے

مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے   کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر   جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

آیا ہے جب چمن میں نازک نہال میرا   ہر شاخِ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے

اے ساکنانِ کنجِ قفس آئی ہے بہار   ایسے میں تم بھی دھوم مچاؤ تو خوب ہے

اے دیدہ شرطِ گریہ ہے ابرِ بہار سے   اتنا تو کیجیو کہ مری آبرو رہے

کر سلوک اب تو گریباں سے اے دستِ جنوں

چاک اک جھٹکے میں تا دامنِ محشر پہنچے

جو کچھ شکستہ قفس کی بھی تیلیاں ملتیں   تو ہم انہی کو خس و خارِ آشیاں کرتے

نہ دی فلک نے ہمیں طاقت اس قدر ورنہ   کسی طرح تو ترے دل کو مہرباں کرتے

آفتاب رائے رسوا

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے   ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

قفس سے دوں گئے ہم اور چمن میں جائے نہیں   اڑیں تو پر نہیں رکھتے، چلیں تو پائے نہیں

مرزا عسکری مرشد آبادی

اے اشک تو اس کوچے میں اب مجھ کو ڈبا دے
چاہے ہے صبا یہ کہ مری خاک اڑا دے

جعفر علی حسرت

دل میں سو بات تھی پر اُس نے نہ پوچھا احوال   مجھ سے کچھ دردِ دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا

فسانہ وصل کا جس سے دل بے تاب کہتا ہے   وہ کہتا ہے کہ افسانہ نہیں یہ خواب کہتا ہے

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں   گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا
نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رویا کی   کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

دل پر نہیں اختیار اپنا   افسوس گیا قرار اپنا
جوں لالہ بہار کر رہا ہے   یہ سینۂ داغدار اپنا

کی دل نے بھی آہ بے وفائی — کوئی نہیں غم گسار اپنا
کیا مے تھی وہ چشمِ مست ساقی — ٹوٹا نہ کبھی خمار اپنا

گر ہے یہی بہار کی شورش تو ناصحا — مجھ سے نہ ہو سکے گی گریباں کی احتیاط
کچھ اس سے میرے پاؤں کے ہے آبلوں کو کام — اے برق کیجو خارِ گریباں کی احتیاط

کر ٹک تو اثر کہ اپنے جی سے — اے نالۂ بے اثر گئے ہم
شبنم کی مثال اس چمن میں — شب آئے تھے ہم سحر گئے ہم

ساقی مے دے کہ اہلِ محفل — پانی پانی پکارتے ہیں

مثالِ نقشِ قدم یاں سے اٹھ نہیں سکتے — تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

کس کا ہے جگر کس پہ یہ بیداد کرو گے — لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

بہار ہو چکی اور شور بلبلوں کا گیا — مرے دماغ سے اس گل کی ہائے بو نہ گئی

میر اعلیٰ علی دہلوی

نہ چھوڑا میں جھنجھلا کے تارِ گریباں — رہے تا نہ گردن میں بارِ گریباں
جو ہاتھ اس کے بندِ قبا کھولتے تھے
سو مشغول ہیں اب بہ کارِ گریباں

شیخ قلندر بخش جرأت

جو راہ ملاقات تھی سو جان گئے ہم — اے خضر تصور ترے قربان گئے ہم
جمعیتِ حسن آپ کی سب پر ہوئی ظاہر — جس بزم میں با حالِ پریشان گئے ہم
اک واقفِ کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کم بخت نے کیا ہم پہ کیا سحر — جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

بات میں کس کی سنوں آہ کہ اے مرغِ چمن — شور میں اپنے ہی نالوں کے سدا رہتا ہوں

حال اپنا اس کی محفل میں جتا سکتے نہیں — دل پڑا تڑپے ولے ہم تلملا سکتے نہیں
دور بیٹھے ان سے آنکھوں میں ہی کہتے ہیں ہم — تم بلا سکتے نہیں ہم آپ آ سکتے نہیں

دردِ دل بھی بہت کہا لیکن — اس نے باتیں نہ کچھ سنیں نہ کہیں
روئے ہے بات بات پر جرأت — ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

مل جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں — بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جس پہ جی — یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں

کب بیٹھتے ہیں چین سے ایذا اٹھائے بن — لگتا نہیں ہے جی کہیں لپکا لگائے بن

جب تک نہ بے قرار ہوں پڑتا نہیں قرار — آتا نہیں ہے چین ہمیں تلملائے بن
دیوانہ گر نہ ہو تو پری رو نہ دیکھیں سیر — بگڑے ہے بات حالِ پریشاں بنائے بن

ہے یہ ڈھب یاد ہنسی کا اسے جو اس سے کوئی — بگڑے کیسا ہی پہ اس کو وہ منا لیتا ہے
میں ہی رہ جاتا ہوں اس پاس جو محفل میں تو وہ — بس کسی کے تئیں جلدی سے بلا لیتا ہے

کیا بچارے سرنگوں بیٹھے ہیں اس کی بزم میں — فرقۂ عشاق بھی فرقہ گنہ گاروں کا ہے

جس جگہ رہتے ہیں جرأت ہم مریضِ چشمِ یار — وہ محلہ شہر میں مشہور بیماروں کا ہے

جو خواہش اس سے آنکھوں میں کروں نظریں ملانے کی
تو کہتے ہیں بنائی تو نے صورت کیوں دِوانے کی
گئے ہو جب سے تم یاں سے نہیں سدھ بدھ ہمیں پیارے
نہ جینے کی نہ مرنے کی نہ آنے کی نہ جانے کی
دلِ وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دِوانا ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

جی کے لگ جانے کا کچھ پایا دلا تو نے مزا — ہم نہ کہتے تھے بری ہوتی ہے دیو لنے لگی
سوزشِ پروانہ ہوئی اس طرح کس سے بیاں — جو خموشی میں زبانِ شمع بتلانے لگی

ہجر میں مضطرب سے ہو ہو کے — چار سو دیکھتا ہوں رو رو کے

ناصحا! اس کو چھوڑ دیں کیوں کر   جس کو پایا ہو جان کھو کھو کے
گو بلاوے نہ ہم کو وہ جرأت   جاتے ہیں سب فرانہ ہو ہو کے

قسمت جو وہ کھینچے تو کھنچی جائے ادھر جان   اور چھوڑ دے زلفوں کو تو بس مار ہی ڈالے
بے ہوش سا محفل میں مجھے دیکھ وہ کیا کیا   ڈرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کچھ منہ سے نکالے

صحبت اب یار میں اور مجھ میں ہے جوں شعلہ و خس
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں وہ گھٹاتا ہے مجھے

اس کے آنے تک اے دلِ بیمار   جس طرح ہو سکے جیے ہی بنے
تو وہ آرام جاں ہے اے کافر   کہ گلے سے لگا لیے ہی بنے
رہ دوں جس جا کہے یہ ہمسایہ   اس کو یاں سے اٹھا دیے ہی بنے

جرأت بلند مرتبۂ عشق ہے بہت   ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں ورے ورے

غم مجھے ناتواں رکھتا ہے   عشق بھی اک نشان رکھتا ہے
شوق سننے کا ہے تو سن آ کر   دردِ دل کا بیان رکھتا ہے

ہے یہ ہوس کہ رخصتِ پرواز ایک بار   صحنِ چمن میں مجھ کو بھی اے باغباں ملے
یہ بھی نہ ہو سکے تو بھلا مجھ اسیر کو   اک دم قفس میں رخصتِ آہ و فغاں ملے
اے راہرو خبر وہیں جرأت کی لیجیو   حسرت زدوں کا تم کو جہاں کارواں ملے

محروم ہیں اگرچہ دیدار سے آنکھیں — پر حسن کا کرشمہ دل میں سما گیا ہے

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی — بھری سہاگ کی تس پہ یہ بو دلہن کی سی
یہ دشت و خار اب اپنے قدم کی برکت سے — قدم قدم پہ بہاریں ہیں سو چمن کی سی
جتاؤں دردِ محبت تو کس ادا سے کہے — کرو نہ مجھ سے یہ باتیں دوانہ پن کی سی
وہ ایک تو ہے بھبھوکا سا تس پہ اے جرأت — اکڑ تکڑ بھی قیامت ہے بانکپن کی سی

اجل گر اپنی خیالِ جمالِ یار میں آئے — تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
بیک کرشمہ جو بے اختیار کر ڈالے — وہ عشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے
پسِ فنا جو ترے دل جلے کی خاک اڑے — تو مضطرب سا دھواں اک نظر غبار میں آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے دردِ فراق — الٰہی موت بھی آئے تو وصلِ یار میں آئے

دور چھوڑا ہمیں گلشن سے یہ رونے کی ہے جا — کہ سزاوارِ اسیری بھی نہ ہم ہائے ہوئے
دمِ رخصت کہے جرأت کوئی اس کافر سے — اک مسلمان کو کیوں جاتے ہو تڑپائے ہوئے

لطف بے یار ہمیں سیرِ گلستاں کب دے — دیکھئے دیدۂ گریاں گلِ خنداں کب دے
آنکھ جس سے ہو لگی وہ ہی نہ ہو پاس تو پھر — تنگ آنکھوں میں فضائے چمنستاں کب دے

ازل سے گرفتار پیدا ہوا ہے — یہ دل کیا مزے دار پیدا ہوا ہے
کرو منع ناصح کو ہم سے نہ بولے — کہاں کا یہ غمخوار پیدا ہوا ہے
کہے گر کوئی اس سے ملنے کو جرأت — تمہارا طلبگار پیدا ہوا ہے

تو کہتا ہے وہ از رہِ طعن ہاں جی
یہی تو خسم بدار پیدا ہوا ہے

قصد محفل سے وہ اٹھنے کا کرے ہے جس وقت
دل بے تاب وہیں مجھ کو جتا دیتا ہے

ہم نشیں مت ہو خفا گر نہ سنوں تیری بات
اک تصور ہے کہ وہ دھیان بٹا دیتا ہے

کرتے ہیں جوں گل گریباں چاک ہم بے اختیار
جب کہ وحشت میں ہمیں یادِ بہاری لائے ہے

عاری تھے قافلے سب فریاد سے ہماری
بے تابیوں کے مارے ہم کارواں سے نکلے

شب بزمِ یار میں ہم بیٹھے تو تھے پہ اس کی
چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یاں سے نکلے

اس انجمن میں جرأت سب کامیاب آئے
حسرت بھرے پر ارماں اک ہم وہاں سے نکلے

مجھ سے پوچھے ہے بگڑ کر یہ حقیقت میری
کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے

انگلیاں پاؤں کی اب اپنی وہ دبوائے ہے
کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سببِ حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

مت خفا ہو ایک دم یاں بیٹھنے سے اس قدر
ٹک تمہیں بس دیکھ کر اے مہرباں اٹھ جائیں گے

ہم بھی اس باغِ جہاں میں شب کے مہمان ہیں
مثلِ شبنم صبح کو گریہ کناں اٹھ جائیں گے

تب متاعِ عشق کا سودا بنے جرأت کہ جب
وسوسے سود و زیاں کے سب یہاں اٹھ جائیں گے

مجھ کو ڈر ہے کہ کرے حشر نہ برپا یہ کہیں
زیر پا اس دل مضطر کو دبائے رکھئے

بیٹھیں کیا دور کہ چاہے ہے یہی کثرتِ شوق
آپ کے زانو سے زانو کو بھڑائے رکھئے

ہووے محفل میں جو وہ تو یہی جی چاہے ہے	روز و شب بس یونہی صحبت کو جمائے رکھئے
کچھ لگاوٹ کا سبب اور نہیں پر جرأت	یہ وہ چاہے ہے کہ اس کو بھی لگائے رکھئے

زنجیر شب اس در پہ جو درباں نے لگائی	کیا آہوں کی دھونی دلِ نالاں نے لگائی
جامہ ترے وحشی کو جنوں نے جو پہنایا	قینچی وہیں گردن پہ گریباں نے لگائی

بے خبر جلد کہ ٹک ٹھہر گیا ہے اب تو	کام آخر ترے بیمار کا ہونے ہوتے

ہم کلام اتنے نہ جرأت سے ہو تم رک رک کر	بات اس بات سے کچھ اور میاں کھلتی ہے

بھری جو حسرت دیاں اپنی گفتگو میں ہے	خدا ہی جانے کہ بندہ کس آرزو میں ہے
یہ حال ہے ترے وحشی کے جیب و دامن کا	کہ چاک چاک میں ہے اور رفو رفو میں ہے
نگھا بدن کو کہا کس مزے سے چیتوں میں	ربودگی یہ کسی عطر کی بھی بو میں ہے
حجابِ چشم کو جرأت نے دی بصارتِ نو	کسی جو پردہ نشیں کی یہ آرزو میں ہے

یاد کس گل کی تھی یارب مرے تن من سے لگی	آگ سی دل میں جو سیرِ گل و گلشن سے لگی
رنگ یہ لائی کہ حسرت سے پیا جائے ہے دل	اس کے قدموں سے حنا ہائے عجب فن سے لگی
تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی تھی وہ کیا اے جرأت	شمع شرمانے جو شب اس رخِ روشن سے لگی

ٹک لگ گیا گلے سے جو وہ گل تو اب مجھے	جوں بوئے گل کرے ہے نہ خود رفتہ بو مری
یارب یہ کس کے گھر سے ہیں نکلا کہ خلق ہے	ہے داستان در بدر و کو بہ کو مری

ہم کچھ اسیر ہوتے ہی خاموش ہو گئے — سب چہچہے چمن کے فراموش ہو گئے

شب ہجراں نہیں بلا ہے یہ — صبح ہوتی نہیں ہے کیا ہے یہ

قفس میں ہمصفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ — بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا

ناصح ہیں اور ہم ہیں یاں کچھ طرفہ صحبتیں — ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جاتے ہے

جوش گل چاک چمن سے دم بدم دیکھا گئے — سب نے لوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

میر انشاء اللہ خاں انشا

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا — لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا
نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشاؔ — نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا — کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم پہ عاشق — نہ ہوا ثواب حاصل یہ کیا عذاب الٹا
یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

نالوں پر میرے نالے کرنے لگی ہے اب تو — بلبل نے یہ نکالا نخرا نیا چمن میں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں میں، شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

چھیڑنے کا تو مزا جب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

اک واسی کارواں پہ چھا گئی اے ساربان
ٹک خبر لیجو کہیں لیلیٰ کی یہ منزل نہ ہو

چند مدت کو فراقِ صنم و دیر تو ہے
چلو پھر کعبے ہی ہو آئیں بھلا سیر تو ہے

جھڑکی سہی ادا سہی چین جبیں سہی
یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا برا ہو کچھ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

غصے میں تیرے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

غنچۂ گل کی صبا گود بھری جاتی ہے
اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

بارِ گراں اٹھاتا کس واسطے عزیزو — ہستی سے کچھ عدم تک تھوڑا ہی فاصلہ ہے

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اس کے ہم انشاؔ — بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے — وہ تو بے چاری آپ ننگی ہے

خواجہ حسنؔ شاگرد جعفر علی حسرتؔ

امنڈ کے آنکھوں سے یک بار بہہ چلے آنسو — ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

رہی بے قراری اسیروں کی یوں ہی — تو صیاد ٹکڑے ترا دام ہوگا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی — حسنؔ اس نے احساں دوبارہ کیا

آغا جان عیشؔ

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

طالب علی خاں عیشیؔ

کوئی پابند جنوں فصلِ بہاراں میں نہ تھا — اس برس ننگِ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا
چشم پوشی ہے عبث مجھ سے کہ مانند سرشک — دیکھنا مجھ کو کہ اک جنبشِ مژگاں میں نہ تھا
عیشیؔ اس میکدے میں کب ہمیں لائی تقدیر — دور دیکھے جب کہ خم بادہ پرستاں میں نہ تھا

لذتِ چشمِ تمنّا کو نہیں یاں کب کیا — یاد آوے گا کوئی دل میں گلستاں کیا کیا
آمدِ عشق ہی میں صبر نے رخصت مانگی — اس سے رکھتا تھا توقع دلِ ناداں کیا کیا

رونقیں، آبادیاں گلشن کی کیا کب یاد ہیں — بوئے گل کی طرح ہم گلشن کے خانہ زاد ہیں

تا چند سر کو پھوڑیئے دیوارِ باغ سے — رونق چمن کی لے گئی بادِ خزاں کہاں
لانا ادھر نہ بوئے گل اے موجِ بادِ صبح — ہم کم دماغ اور یہ بارِ گراں کہاں
بے رحم باغباں ہے اور بے وفا بہار — باندھا تھا ہم نے آ کے عبث آشیاں کہاں

گل گراں گوش، چمن صورتِ حیرانی ہے — کس گلستاں میں ہمیں حکمِ غزل خوانی ہے
کفِ افسوس بہم ملتے ہیں مژگاں یعنی — آخر اس دہر کا انجام پشیمانی ہے

جب سے وہ رشکِ گلستاں پئے گلگشت آیا — ہر دم اک تازہ خلل رونقِ گلزار میں ہے

کوئی اس فصل میں دیوانہ ہوا ہے شاید — کہ ہوا ہاتھ میں زنجیر لئے پھرتی ہے

مرزا محمد تقی خاں ہوس شاگردِ مصحفی

جب سے گل خون میں ڈوبا قفس اے مرغِ اسیر — تو نے پھر آج وہی زمزمہ ایجاد کیا

محمد منور خاں غافل لکھنوی

اُٹھ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد — نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

گرم بازاری الفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

شیخ محمد روشن جوشش لکھنوی

جی سیر میں گلزار کی تن کنجِ قفس میں
یہ صیدِ گرفتار اِدھر کا نہ اُدھر کا

نہ پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

کل بزم میں سب پر نگہِ لطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشمِ بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

شیخ محمد ابراہیم ذوق

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا
بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا
ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اٹھ نہیں سکتا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا
آخر کو فیضِ بیعتِ دست و سبو ہے آج
پیرِ مغاں کے میں بھی مریدوں میں مل گیا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوے سے کہے — آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس
زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو — پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفاس

نگہ ہا نہیں حرفِ دل نشیں تھا دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو — دلِ خانہ خراب کی باتیں

ہاں تامل وہم ناوک فگنی خوب نہیں — ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں
خوبیاں یوں تو ہیں اس عالمِ تصویر میں سب — اک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں
یہ نہیں شیشۂ مے ہے کسی مے خوار کا دل — محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی — باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں
پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

خانقہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے
فرق پر یہ ہے یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

ہے اُن کی سادگی بھی تو کس بچپن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کیساتھ
ناخن نہ دے خُدا تجھے اے پنجۂ جنوں
ٹکڑے اڑا دے جسم کے تو پیرہن کیساتھ

رخصت اے زنداں جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اف ری بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

جمالِ یار نے مڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا
پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے
ہوائے وادیِ وحشت مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے
نہ دیتا عشق اگر چشم اشک بار اے ذوق
جلا چکی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بُت کو خدا سمجھے

غالب

ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے — فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سُرمہ سا سمجھے
حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا — حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دل رُبا سمجھے

کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک — پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
اے ذوق دیکھ! دخترِ رز کو نہ منہ لگا — چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

خوب روکا شکایتوں سے مجھے — تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اُس نے ٹھہرایا — آیتوں سے روایتوں سے مجھے
لے گئی عشق کی ہدایت ذوق — اُس سرے سب نہایتوں سے مجھے

مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے — تو گُل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
سراغ عمرِ گزشتہ کا کیجیے گر ذوق — تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق — اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے — ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

زلفیں تیری کافر ہیں دل سے مرے کیا کام
دل کعبہ ہے اور کعبہ مسلماں کے لئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہے تو میری شب ہجراں کیلئے ہے

دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانہ زنداں کے لئے ہے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

خدنگ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دروازہ مے کدے کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل
سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

الٰہی کس بے گناہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچے میں اس کے شور با ہئیِ ذنبِ قتلتنی ہے

ہوئے ہیں تر گریہ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

لگا نہ اس بت کدے میں تو دل یہ ہے طلسمِ شکستِ غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے

صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کیلئے

نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشم خوں فشاں کیلئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیوں کر ہو
زباں نہ دل کیلئے ہے نہ دل زباں کے لئے

اسد اللہ خاں غالب

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے	کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفتِ ہستی	عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو	آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ	ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ	جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ! — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
خدائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی — دوام کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا کہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی — پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

قید میں بھی تھی ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یا رب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ / جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
موجِ غم سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے / آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے / کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا / درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
دل سے مٹتا نہیں تری انگشتِ حنائی کا خیال / ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس / کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب / چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے / رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب / خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب / دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل / کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد / بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق / ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا — یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد — ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے خطرۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا، گنہ گار ہیں ہم

نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ شکوہ کفرِ دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

--- (نسخۂ حمیدیہ)

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت	وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا	یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے	تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو یہ کہتے ہیں	کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب	یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے	ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر	برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشد گل	مست کب بند قبا باندھتے ہیں
اہل تدبیر کی واماندگیاں	آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پرکار ہیں خوباں غالب	ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں	لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی	تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار	جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں
جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا	سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا	لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش — شراب خانے کی دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ — ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے — اس کے ہر اک اشارے میں نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی — آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں — کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں اُن کے ہے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے — حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو
تم ہی کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا — بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

بہ یادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم — ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
امیدوار ہوں تاثیر تلخ کامی سے — کہ قند بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

(نسخہ حمیدیہ)

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بہ انداز چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی
مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کرتا — لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوہ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا — عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے مگر باایں ہمہ — ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے جو اس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی — یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہمارے قلم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو — شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے
کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم — آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا — کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

تب چاک گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے　　آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ　　ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل　　اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا　　ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن　　سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں　　آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کو کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کماں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے سے اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

لالہ و گل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہو مجھے

جام ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

(نسخہ حمیدیہ)

بہادر شاہ ظفؔر

نہ ہوس سیرِ چمن کی کہ گُلِ تر کی ہوا
سرِ عاشق میں ہے اس سروِ سمن بر کی ہوا

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ شکیب و قرار ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

تو کہیں ہو دلِ دیوانہ وہاں پہنچے گا
شمع ہووے گی جہاں پروانہ وہاں پہنچے گا

دل کو ہو میرے نہ کیوں میلان سوئے چشمِ یار
بادہ کش ہوگا جہاں میخانہ وہاں پہنچے گا

وہ بے حجاب جو گُل پی کے یاں شراب آیا
اگرچہ مست تھا میں پر مجھے حجاب آیا

خواہ وہ داغِ جنوں ہو خواہ کوئی اشکِ خوں
ہم نے سر آنکھوں پہ رکھا عشق تو نے جو دیا

چاہیے دلداری کرے چاہے دل آزاری کرے
اے ظفؔر اس دل رُبا کو ہم نے دل اب تو دیا

دلِ صد چاک بنایا تو بلا ہے لیکن زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

میری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال تھا
وہ جب آگیا مرے سامنے نہ تو رنج تھا نہ ملال تھا

کس چشمِ پُر خمار کا ساقی پڑا تھا عکس جس سے کہ یہ نشہ قدحِ مُل میں آگیا

ہے عشق کی منزل میں یہ حال اپنا کہ جیسے لٹ جائے کہیں راہ میں سامان کسی کا

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

نہ اُن کی بزم میں آنسو بہائیو اے چشم نگاہ رکھیو ذرا میری آبرو کی طرف

صبر مشکل ہے نہ کر صبر کا دعویٰ ہرگز عشق میں تجھ سے ظفرؔ یہ کبھی ہونے کا نہیں

ظفرؔ اس اپنے تصور کے جائیے قربان کہ رکھتی یار کی تصویر روبرو سے نہیں

ترے ہاتھ سے دشت وحشت کی میں — جنوں کب تلک خاک چھانا کروں
خرد کچھ کہے ہے جنوں کچھ مجھے — کہو میں کہا کس کا مانا کروں

کوچے سے زلفِ یار کے گزری ہے گر کبھی — عنبر فشاں نسیم سحر ہو گئی تو ہے
لائے گی اور جنبشِ مژگاں وہ کیا بلا — دنیا تمام زیر و زبر ہو گئی تو ہے
کیا ہوگا دیکھئے کہ دیا ہم نے دل اُسے — تقصیر اب یہ ہم سے ظفرؔ ہو گئی تو ہے

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار — بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت اُن کی گلے پڑی
وہ جو کاکلیں تھیں بڑی بڑی وہ اُنہی کے پیچ میں آ گئے

دیکھ اے دستِ جنوں پردہ نہ کر عشق کا فاش — داغ سینے کے ہیں پوشیدہ گریباں کے تلے
حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے — گر کے پھڑکا کئے دیوارِ گلستاں کے تلے

جس وقت اس کی زلف گرہ گیر کھل پڑی — سودائیوں کے پاؤں کی زنجیر کھل پڑی

میر مہدی مجروحؔ

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا تھا اور آپ نے کیا جانا
انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو کہو خیر تو ہے
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

ہم بھی امیدِ وصل سے خوش ہیں
ہے زمانے کو انقلاب بہت

دیکھ کر دل کو یار کہتا ہے
چیز اچھی تھی گر نہ لگتا داغ

گریباں چاک ہیں گل بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں
قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں
سنے گر طالعِ خفتہ کا قصہ
تو نیند آجائے چشمِ پاسباں میں
سنا حال دلِ مجروحؔ شب کو
کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

کیا چمن میں ہے گئی بوئے گریباں اُس کی
آج غنچہ کوئی کھلتا جو گلستاں میں نہیں
در و دیوار کو توڑا ہے ترے وحشی نے
اب تو گھر میں وہ مزا ہے جو بیاباں میں نہیں
دل کو شاید تری مژگاں کا تصور نہ رہا
اب وہ پہلی سی کھٹک کاوشِ پنہاں میں نہیں

شوق سا شوق ہے کچھ منزل کا
راہبر سے بھی بڑھے جاتے ہیں

دُور ہے منزلِ مقصد اے خضر — آپ کیوں پیچھے رہے جاتے ہیں

آنکھ نرگس کی خواب ہے لیکن — ہائے وہ چشمِ نیم خواب کہاں
کج ادائی یہ سب ہمیں تک تھی — اب زمانے کو انقلاب کہاں

جانا زبس ضرور تھا اُس جلوہ گاہ میں — ہم دیر و کعبہ چھوڑ گئے دونوں راہ میں
اُس نے ملائی آنکھ نہ گھر میں نہ راہ میں — کیا کیا سبک ہوا ہوں عدو کی نگاہ میں

ملتی ہے اُس کی وضع زبس خوئے یار میں — آئے نہ کیوں مزا ستمِ روزگار میں
کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ملے ہمیں — دستِ جنوں کا دھیان ہے ایک ایک تار میں
ہر ایک جانتا ہے کہ مجھ پر نظر پڑی — کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ سحر کار میں

دل کی بے چینیاں گئیں نہ کہیں — اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
مہر کیا چیز ہے وفا کیسی؟ — یہ تو باتیں ہیں اب رہیں نہ کہیں
خالی جائے یہ وہ بناؤ نہیں — آج جائیں گے وہ کہیں نہ کہیں

کسی کی کاکلِ مشکیں کی نکہتِ خوش نے — گلِ شگفتہ میں چھوڑا نہ رنگ و بو باقی
اگرچہ آپ کو کھویا تلاش میں اُس کی — مگر ہے دل میں وہی شوقِ جستجو باقی

کیا حالِ دل اس شوخ ستم گر سے کہا جائے — جو جنبشِ لب دیکھتے ہی بات کو پا جائے
میں جادۂ متروک کے مانند پڑا ہوں — شاید وہ اِدھر بھولے سے آ جائے تو آ جائے

مٹ جائے ابھی کا فرو دیندار کا جھگڑا　　گر وہ رُخِ دل کش کو ذرا اپنے دکھا جائے

پھر کس سے یہ شکوے شب ہجراں میں رہینگے　　کام اپنا کہیں آہِ فلک سوز نہ کر جائے
تشبیہ مرے حال پریشاں سے نہ دینا　　ایسا نہ ہو وہ طرّۂ شب رنگ بکھر جائے
دل خوگر شادی ہے یہ ممکن ہے پہ یارو　　فرماؤ کہ یہ حسرتِ جاوید کدھر جائے
ظاہر ہے کہ باطن کی لگاوٹ ہے وگرنہ　　کیوں غیر کی جانب نری دزدیدہ نظر جائے
اک کام ہمارا ہے کہ بن جائے تو بگڑے　　اک غیر کا مطلب ہے کہ بگڑے تو سنور جائے
آنکھوں میں کسی کی جو جگہ پاؤں تو کیوں کر　　میں خواب پریشاں ہوں جو دیکھے وہی ڈر جائے
میں جانتا ہوں کس نے گزاری ہے شب ہجر　　یہ دل کی تسلی ہے جو کہتا ہوں گزر جائے
لو رشک بھی اب چھوڑ دیا مضطربی میں　　ہر ایک سے کہتا ہوں کوئی یار کے گھر جائے

اچھا ہے جو مجروح کو روکے کوئی اٹھ کر
یہ جینے سے بیزار ہے کیا جانے کدھر جائے

اے وحشتِ جنوں ہجر کی شب میں نہیں تھمتا　　ہاں دھجیاں اڑ جائیں گریبانِ سحر کی
ہے دیکھنا اس طرح کہ گویا نہیں دیکھا　　کیا تم کو خبر ہے یہ شرارت ہے نظر کی

کیا ہے شوقِ منزل نے یہ بے تاب　　بڑھا جاتا ہوں کوسوں کارواں سے
مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے　　کوئی لادے درِ پیر مغاں سے
کہ اس کو جوڑ کر میں توڑ ڈالوں
پھر اک جام شرابِ ارغواں سے

مفتی صدر الدین آزردہ

اس دردِ جدائی سے کہیں جان نکل جائے — آزردہ مرے حق میں ذرا یوں بھی دُعا کر

اُسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر — کہیں پرسشِ دادخواہاں نہیں
یہ ہاتھ اُس کے دامن تلک پہنچے کب — رسائی جسے تا گریباں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے ہی طور — کہ اپنے کیے پر پشیماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند — کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق — شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

ناصح یہاں یہ فکر ہے سینہ بھی چاک ہو — ہے فکرِ بخیہ تجھ کو گریباں کے چاک میں

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں — کیوں ہے بے کار گریباں تو مرا دُور نہیں

کیا جانو کیا اثر ہے دلِ شعلہ تاب میں — یہ وہ ہے برق آگ لگا دے نقاب میں
میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں
یارب یہ کس نے چہرے سے اُلٹا نقاب جو — سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مومن خاں مومن

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

مر گئے اس کے لبِ جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

جائے تھی تیری مرے دل میں سو ہے
غیر سے کیوں شکوۂ بے جا کیا

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آساں نہیں
میں گرفتارِ رمِ گیسوئے صیاد رہا

گہ غمِ حور گہے عشقِ بتاں اے مومن
میں سدا سوختۂ حسنِ خداداد رہا

محشر میں پاس کیوں دمِ فریاد آ گیا
رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آ گیا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ — مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
دلربائی زلفِ جاناں کی نہیں — پیچ و تابِ طرۂ شمشاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے — یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا — دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا
ہوں کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگ ہائے شوق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

بزمِ مے میں بس ایک میں محروم — آپ کے اجتناب نے مارا
یادِ ایامِ وصلِ یار افسوس — دہر کے انقلاب نے مارا
جبہ سائی کا بھی نہیں مقدور — اُن کی عالی جناب نے مارا
مومن از بس ہیں بے شمار گناہ — غمِ روزِ حساب نے مارا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں — اس مرغِ پرشکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

کشتہ ہوں اس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح　　کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے　　مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

بے بخت رنگ خوبی کس کام کا کہ میں تو　　تھا گل ولے کسی کی دستار تک نہ پہنچا
مفت اوّل سخن میں عاشق نے جان دیدی　　قاصد ترا بیان تو اقرار تک نہ پہنچا

پوچھنا حالِ یار ہے منظور　　میں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا　　تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

بے کاری امید سے فرصت ہے رات دن　　وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا
نیند آگئی فسانۂ گیسو و زلف سے　　وہم و گمانِ خوابِ پریشاں نہیں رہا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا
ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم　　حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو　　دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن　　صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا　　مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اس کے
کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا
جنت کی ہوس واعظ بیجا ہے کہ عاشق ہوں
ہاں سیر میں جی لگتا گر دل نہ لگا ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا
پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو کہ اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے
کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا
یہ بے تکلف پھرا رہی ہے کشش دل عاشقاں کی اس کو
وگرنہ ایسی نزاکتوں پر خرام نازک قدم نہ ہوتا
ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درس واعظ کو سن کے مومن
بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

یہ شعر ایک قصیدے کے ہیں لیکن ان کا تغزل ملاحظہ ہو ؎

تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں
میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوق رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بت بیداد ہے یہ کیا انصاف
کہ تو جفا سے نہ ہوا اور وفا سے میں ہوں خجل

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
اس کوُ میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور — اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

الجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم — کرتے ہیں اس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم
سرگرمِ رقصِ تازہ ہیں قربانیوں میں ہم — سُرخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم
ثابت ہے جرمِ شکوہ نہ ظاہر گناہِ رشک — حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبحِ شبِ وصال — کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم

دستِ جنوں کے جائیے صدقے کہ چین سے — پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں — لب نہیں کھلتے ہیں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
ترجمانِ التماسِ شوق ہے تغییرِ رنگ — جوں زبانِ شمعِ عاشق بے صدا کہنے کو ہیں
دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا — بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں
ہو گئے نامِ بتاں سنتے ہی مومن بے قرار — ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند گو — وہ ماجرا جو لائقِ شرح و بیاں نہیں
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق — ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

قطعِ امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت — مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

تقدیر تھی بُری مری تدبیر بھی بُری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں
کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں
کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی رنجشِ بار بار میں

یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے
آئی چمن سے نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریبان سی لیا
اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو ایک پارسا کے ساتھ

نہ جانے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہارِ وضع ترے مسکرا کے آنے کی

پھر اب بجے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی

خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا
امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

حسن روز افزوں پہ غرّا کس لئے اے ماہ رو
یوں ہی گھٹتا جائے ہے جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

تاب طاقت صبر و راحت جان ایماں عقل و ہوش
ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدی زنداں ہوں گے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آج اس بزم میں طوفان اٹھا کے اٹھے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلا کے اٹھے

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

اف رے گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشک پری اتنی

لے چھیڑے ہے نکہت کو گلہائے شبینہ کی
اب تم سے بھی چل نکلی باد سحری اتنی

یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبے میں ہی ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی
رہ گئی بات بے قراری کی

یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی
بات اپنی امیدواری کی

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن
حاصل اس بت سے سرشاری کی

نام بدبختیٔ عشاق خزاں ہے بلبل — تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آ جائے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے — کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم — کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
میرے تغییرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے — وہ بُت آزروہ گر نہ ہو جائے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے — اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

کیوں کر نہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں — اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسےٰ — اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی — ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — ہم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا — اب آگے ہو نہ ہو امیدِ انفعال تو ہے
شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں — کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

وہ رند غم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں — تنگ آ کے حریفانِ بادہ خوار مجھے
ہر آن آنِ دگر کا ہوا ہیں عاشق زار — وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی تو ظالم نے کیا کی
موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس — اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی
کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال — کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی
مجھے اسے دل تری جلدی نے مارا — نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی
کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا — وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے
بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے موئے — ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کیلئے

صاحب جی امۃ الفاطمہ

نظر ہے جانبِ اغیار دیکھئے کیا ہو
پھری ہے کچھ نگہِ یار دیکھئے کب ہو

مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی

پھر غلغلہ ہے آمدِ فصلِ بہار کا　　بگڑا مزاج میرے دلِ بیقرار کا
وحشت میں بھی نہ ترکِ محبت ہوا نسیمؔ　　منہ آبلوں نے چوم لیا نوکِ خار کا

اللہ رے درازیِ آغازِ مدعا　　نکلا جو حرف منہ سے مری داستاں بنا
لیل و نہارِ گیسو و رخسارِ یار میں　　جی چاہتا ہے بیٹھ رہیں اک جہاں بنا

گلے میں بخت کے اُن کا بھی کچھ قصہ نکل آیا　　ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک　　آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے　　تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

جب دیکھئے قرار نہیں ایک حال پر　　میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

حسرتِ دیدار میں کیا کیا نہ تڑپی عندلیب　　تا قفس لائی صبا جس دم چمن سے بوئے دوست

ہجومِ جوشِ وحشت سے ہوئے ہیں بے ادب ایسے　　گریباں سے اُلجھ کر ہاتھ اُلجھاتے ہیں دامن تک
خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے　　نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوارِ گلشن تک
ترے چھٹنے سے چھوڑا آنسوؤں نے ساتھ آنکھوں کا　　گلے مل مل کے آپس میں چلے آتے ہیں دامن تک

بہارِ فصلِ گل آئی ہے میں کنجِ قفس میں ہوں
مبارک باد مجھ کو ڈھونڈھ جاتی ہے نشیمن تک

دیکھ او قاتل بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم
چارہ گر سے درد نالاں درد سے دل دل سے ہم

ہائے کیا بےخود کیا ہے غفلتِ امید نے
حالِ دل کہتے ہیں اپنا پھر اسی قاتل سے ہم

خالی از احساں نہیں یہ بھی کہ وقتِ اضطراب
خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدۂ باطل سے ہم

لطفِ تکلیفِ قفس کچھ ہم سے پوچھا چاہئے
مدتیں آخر ہوئی ہیں خدمتِ صیاد میں

برق نے اک طرزِ بیتابی مرا سیکھا تو کیا
سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطرِ ناشاد میں

بے جا ہے اسے بھی سبک دوش ہوں کہیں
رکھئے مری امید بھی اپنی حیا کے ساتھ

گھبرا گئے تم ایک ہی عرضِ بیاں میں آج
سو حسرتیں ہیں اور مری التجا کے ساتھ

اب وہ گلی جائے خطر ہو گئی
حال سے لوگوں کو خبر ہو گئی

دیکھیں گے اے ضبط یہ دعوے ترے
رات جدائی کی اگر ہو گئی

کیا جانئے آتے ہیں کہاں سے مرے شکوے
کم ہوتے ہیں ہر چند مگر کم نہیں ہوتے

بے فائدہ ہے فکر مرے چارہ گروں کو
سب زخمِ جگر قابلِ مرہم نہیں ہوتے

مرنے بھی نہ دے گی مجھے محرومیِ تقدیر
کچھ آنکھ چراتا ہے وہ قاتل کئی دن سے

گر یہی ہے باغِ عالم کی ہوا
شاخِ گل اک روز جھونکا کھائے گی

جو چپ رہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے
فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

میں وہ بے آس ہوں کہ میرے پاس
یاس آتی ہے آسرا کر کے

نئے ڈھب کا کچھ جوشِ سودا ہوا ہے
خدا جانے اب کی مجھے کیا ہوا ہے

تعلق ان آنکھوں سے پیدا ہوا ہے
بہت دن کا یہ خواب دیکھا ہوا ہے

ذرا دم تو لینے دے اے چشمِ جادو
بڑی مدتوں میں دل اچھا ہوا ہے

میر نظام الدین ممنونؔ

اے آہ بے ادب نہ اسے پھونکیو کہ ہے
دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

دل میں کیا کیا ہوس چشم تمنا تھی ولے
تیری چتون کا وہ ڈھب مانعِ تقریر رہا

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا
ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر بیٹھ کر

تفاوتِ قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنوںؔ
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

کلیم ثناء اللہ خاں فراقؔ

دل تھا متا کہ چشم پہ کرتا تیری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

سمجھے تھے دامِ زلفِ سیہ ہے بلائے جاں — پر کیا کریں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

ہر غنچے میں بو ہے تیری ہر گل میں ترا رنگ — جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
مجنوں کے سوا دیکھئے اب دشتِ جنوں میں — ہو کون فراق اپنا مقابل نہیں معلوم

خواجہ حیدر علی آتش

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا — ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا
وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں — معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی — جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا
وہ یاد ہے اس کی جو بھلا دے دو جہاں کو — حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا
یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے — قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا
آوارگیِ نکہتِ گل سے ہے اشارہ — جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب — دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

یار نے وعدۂ فردائے قیامت تو کیا — شک ہے اے نالۂ دل تیری کرامات میں کیا

اثر منزل مقصود نہیں دنیا میں — راہ میں قافلۂ ریگِ رواں ہے کہ جو تھا

سمجھتے تھے نہ ہم اتنا حد اندازہ اے جنوں تجھ کو — گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا

اے جنوں تجھ سے مری آنکھ جھپکنے کی نہیں — قید خانہ تو دکھایا مجھے صحرا دکھلا

سنا کرتا تھا اس کو چھیڑ کر پاؤں سے اے مجنوں — مری زنجیر کا نالہ ہے افسانہ بیاباں کا

کوئی عشق میں مجھ سے افزوں نہ نکلا — کبھی سامنے ہو کے مجنوں نہ نکلا
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

خار دامن سے الجھتے ہیں بہار آئی ہے — چاک کرنے کو کیا گل نے گریباں پیدا
موجد اس کی ہے سیہ روزی ہماری آتش — ہم نہ ہوتے تو نہ ہوتی شب ہجراں پیدا

تار اس زلف معنبر کا نہ توڑا اے شانے — سلسلہ ہے یہ مرے دل کی گرفتاری کا

وحشت نے ہمیں جب کہ گلستاں سے نکالا — غیرت نے قدم پھر نہ بیاباں سے نکالا

گردن مری اے دستِ جنوں تو نے جھکائی   آزاد کیا بند گریباں سے نکالا

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا   سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا
شب فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا   جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا   خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب   زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

نالۂ بلبلِ شیدا میں اگر ہے تاثیر   دستِ صیّاد میں گلچیں کا گریباں ہوگا

زنجیر و طوق ہر برس آ کر پہنا گئی   دیوانہ ہوں میں بادِ بہاری کی چال کا

کیونکر وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں   انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا
ہو جائے حسنِ معنی بے صورت آشکار   روئے حقیقت اٹھے جو پردہ مجاز کا

حال ہے مجھ ناتواں کا مرغِ بسمل کی تڑپ   ہر قدم پہ ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
پاسِ الفت سے جنوں میں بھی نہ کپڑے پھٹ سکے   طوق بن کر میری گردن میں گریباں رہ گیا

ہجر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سے دراز   دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست
اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بنے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

نہ ہو گا پاک کبھی حسن و عشق کا جھگڑا — یہ قصہ وہ ہے کہ جس کا کوئی گواہ نہیں

باغ میں آئے ہو تو ہاتھ اُن کے بھی پھیرو دو گام — کبک وطا[illegible] جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی — ٹھہر گیا بر[illegible]ہیں بوئے آشنا آئی

نہ روزِ حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے — جفائے یار کے صدقے مری وفا آئی
بہارِ گل میں ہیں دیوانے جامے سے باہر — پری کا بھیس ہے بدلے ہوئے بلا آئی

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

نقشِ پائے رفتگاں سے آ رہی ہے یہ صدا — دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہئے

چار دن موسمِ گل ہیں تو رہوں دشت نورد — راہ کھوٹی نہ کرے مجھ کو نہ زنداں روکے

حسن سے رتبہ ہے اپنے عشقِ کامل کا بلند — آستانے پر پری ہے بام پر دیوانہ ہے

دکھلائے حسنِ یار کا جلوہ ہمیں جو عشق — کس کس طرح سے لطفِ تماشا اٹھائیے
فصلِ بہار آئی پیو مومنو شراب — بس ہو چکی نماز مصلّا اٹھائیے
اب کی بہار میں جو ہمیں لے چلے جنوں
چن چن کے داغ لالۂ صحرا اٹھائیے

بُت خانہ توڑ ڈالئے مسجد کو ڈھائیے | دل کو نہ توڑئیے یہ خدا کا مقام ہے

گدا نواز کوئی شہ سو[illegible]ستہ [illegible] ہے | بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے
سمندِ عمر کو اللہ ر[illegible] سلانے آئی ہے آسائش | عناں گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

حیا سے یار نے بدلا جو کیفِ مے میں رنگ | یقیں ہوا یہ ہمیں پارسائی مشکل ہے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر | ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے آنے میں | وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

طرفہ پری ہے کوئی نسیمِ بہار بھی | دیوانے اپنے جامے سے باہر نکل چلے
آنکھیں تمہاری پھر گئیں آئینہ دیکھ کر | آخر غرورِ حسن سے تیور بدل چلے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا | دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ مڑ کر کے بے درد قاتل نے دیکھا | تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں | گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشے میں جھومتے ہیں | مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

صورتِ شمع ہوں ہر چند فروغِ محفل | بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

دیکھئے کرتا ہے کیونکر یار سے گستاخیاں
شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہئے

حالِ دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بولا اُن کے یار
بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہئے

فکرِ رنگیں ہم کو دکھلاتی ہے گھر بیٹھے بہار
مشقِ بلبل نالے کرنے کو چمن کیا چاہئے

غنچہ و گل کو نہ ہنسنا تھا تری صورت سے
چھوٹے سے منہ کو سزاوار بڑی بات نہ تھی

نکہتِ گل سے مجھے یار کی بُو آتی ہے
خار سے یاد اُلجھ پڑنے کی خو آتی ہے

شرم تجھ کو بہت اے آئینہ رو آتی ہے
میری صورت سے مگر عشق کی بُو آتی ہے

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بےتاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چکی ہے بہت پیرہن سے بُو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

تیغ ابرو سے کیا قتل مجھے قاتل نے
قدر ہے ہم جیسے محبت کے گنہگار کی تھی

راہِ صحرا میں جنوں کیوں نہ رہے سرگشتہ
جستجو آبلہ پایوں کو ترے خار کی تھی

گئے جس بزم میں روشن چراغِ حسن سے کر دی
بہارِ تازہ آئی تم اگر گلزار میں آئے

عاشق کے سر کے ساتھ ہی سودائے کوئے یار — مومن نہ تھا وہ جس کو ہوائے جناں نہ تھی

رہ گیا چاک سے وحشت میں گریباں خالی — لے چلے خار سے ہم گوشۂ داماں خالی

بیداد کی محفل میں سزوار ہمیں تھے — تقصیر کسی کی ہو گنہ گار ہمیں تھے
سودا زدہ زلفوں کا نہ تھا اپنے سوا ایک — آزاد دو عالم تھا گرفتار ہمیں تھے

صبا کی طرح ہر اک غیرتِ گل سے ہیں لگ چلتے — محبت ہے سرشت اپنی ہمیں یارانہ آتا ہے
زیارت ہوگی کعبے کی یہی تعبیر ہے اس کی — کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے

شیخ امام بخش ناسخ

ساقی بغیر شب جو پیا آبِ آتشیں — شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا
اس رشکِ گل کے جاتے ہی بس آگئی خزاں — ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا

مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں — دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

رنگ و داغِ گل لالہ سے یہ معلوم ہوا — حسن اور عشق ہوئے دونوں برابر پیدا

ہر سر قدم پہ پھوٹتے جاتے ہیں آبلے جو — نقشِ قدم میں طور ہے چشم پُر آب کا

ہے وہ دل ویراں نہیں جس میں فروزاں داغِ عشق — روشنی یعنی نشان ہے خانۂ آباد کا

فصلِ گل آنے نہیں پائی کہ تو یاد آ گیا
اے جنوں دیوانہ ہوں میں اپنے دل کی یاد کا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
کسی سے دل نہ اس وحشت کدے میں میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

قدح لئے ہوئے گل مثلِ بادہ خوار آیا
خزاں چمن سے گئی موسمِ بہار آیا
تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

لبریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
ہنستا ہے عکسِ رُخ سے کٹورا گلاب کا

آج مجھ کو دشتِ وحشت میں وطن یاد آ گیا
بوئے گل کو بعدِ بربادی چمن یاد آ گیا

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا
حسرتِ دل نہیں دیتا ہے سسکنے ناسخ
ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سُن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اُسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

مر کے بھی چھٹتے نہیں آپ کی زلفوں کے اسیر
یہ عجب قید ہے جس کی کوئی میعاد نہیں

تمنا ہے ساقی کبھی بزمِ مے میں
وہ سرشار ہو اور ہشیار میں ہوں

غالب

نہ سجدۂ درِ جاناں سے سر اٹھاؤں گا
یہ وہ نماز ہے جس کا کبھی سلام نہیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

اے جنوں! یاں کوئی جز ضعف گلوگیر نہیں
طوق گردن میں نہیں پاؤں میں زنجیر نہیں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں
نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

تدبیر سے سودا نہ گیا زلف پری کا
زنجیر نہ ڈالے کہیں تقدیر گلو میں

ہم ادا داں سمجھتے ہیں اے جاں
ناز ہے حسن کا غرور نہیں

تو نے مجبور کر دیا ہم کو
سخت رنجور کر دیا ہم کو

دل بنا عاشقی میں خود مختار
اور مجبور کر دیا ہم کو

بہ رنگِ حسنِ بتاں ہے دل شگفتہ مرا
جو اس چمن میں خزاں ہو تو پھر بہار نہ ہو

گلوں کی پردہ دری کیا تمہیں ہوئی منظور
جو آج سیرِ گلستاں کو بے نقاب چلے

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

صحن گلشن میں ترے آتے ہی اے رشک بہار   حشر برپا ہے شکست رنگ کی فریاد سے

شوق مے نے کر دیا اس درجہ مجھ کو بدحال   محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

کس کو ہمارے یار کے نظارے کی ہے تاب   خورشید جس کو کہتے ہیں اس کی نقاب ہے

کیا ہی چاک قبا ہیں خوش اسلوب   میری وحشت کی دستکاری ہے

چلنے سے عمر رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے   جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

دشت وحشت میں کہاں ہوش و حواس و عقل و دیں
اب جنوں اس قافلے کا ساتھ چھوڑا چاہیے

ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا   نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالہ نکال کے

فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول   کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

شاہ نصیر الدین نصیر دہلوی

دیر کیوں کرتا ہے پھر کیا جانیے ہو کس کا دور   ساقیا لب سے ہمارے تو لب ساغر لگا

آپ سے آئے نہیں ہم سیر کرنے باغ میں
لائی ہے باد صبا گلشن میں لپٹا کر لگا

کیا جانے یہ گیا تھا کس منہ سے سوکشی کو — آئے نہ واں سے لے کر خاک آرزو آیا
کیونکر یہ ہاتھ اپنا پہنچے گا تا گریباں — دستِ خیال جس کے دامن کو چھو نہ آیا
برگشتہ بخت ہم وہ اس دور میں ہیں ساقی — لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا

سر معرکۂ عشق میں آساں نہیں دینا — جا وے ہے جہاں شمع قدم اٹھ نہیں سکتا

ہے جنبشِ مژگاں کا کسی کی جو تصور — دل سے خلشِ خارِ الم اٹھ نہیں سکتا

وائے اے شیشۂ دل سینے میں مانند حباب — ٹھیس سے اس نفسِ سرد کی تو ٹوٹ گیا

کعبے سے غرض اس کو نہ بتخانے سے مطلب — عاشق جو ترا ہے نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا

صیاد قفس کو نہ اٹھا صحن چمن سے — باقی ہے ابھی مرغِ گرفتار کی حسرت

خیالِ زلف میں ہر دم نصیرؔ پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جوں ذرہ نہیں ایک جگہ خاک بسر ہم
اے مہرِ جہاں تاب جدھر تو ہے ادھر ہم

— اے بادِ صبا ہم تو ہوا خواہ ہیں تیرے
مشتاق ہیں گل کے نہ طلبگارِ گلستاں

محمد محسنؔ دہلوی

طبع نازک کو مرے ہاتھ میں رکھیو تو کہ میں   قیس و فرہاد سا دہقانی و مزدور نہیں

آغا جو شرفؔ شاگرد آتشؔ

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا   چمن کی بو ہوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا

ذکر آئے خوشی کا تو نکل پڑتے ہیں آنسو   ہم ایسے ستم دیدہ ہیں دکھ پائے ہوئے ہیں

حافظ فضلو ممتازؔ دہلوی

ڈروں میں کس لئے رنجش سے پیار میں کیا تھا   میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا
جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس   اور اپنی خاطر امیدوار میں کیا تھا
ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک   وگرنہ ہستی ناپائیدار میں کیا تھا

گزرا کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں   آتا ہے نظر جامۂ گل چاک چمن میں

عشق میں عرض تمنا مانع دیدار ہے   میرا ہی دستِ دعا منہ پر مرے دیوار ہے

محمد رضا برقؔ لکھنوی

کیا جو وعدۂ فردا سمجھ گئے عاشق   کہ اس سوال کا اب حشر پر جواب رہا

اسی بہانے سے پوچھا تو جاؤں گا اے برق — ہزار شکر کہ بندہ گناہ گار ہوا

دیکھ تیزی و مستیٔ ساقی — جام کو رشکِ آفتاب کیا
حُسن نے اُس کو چن لیا اے برق — عشق نے ہم کو انتخاب کیا

اتنا تو جذبِ عشق نے بارے اثر کیا — اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

اذاں دی کعبے میں ناقوس دیر میں پھونکا — کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

حسن میں شہرت جو اس کی ہے تو میری عشق میں — تذکرہ دونوں کا عالم میں کہاں ہوتا نہیں

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو — دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

دل میں ہے عشقِ صنم نام خدا ہونٹوں پر — میں ہوں وہ رند کہ کہتے ہیں مسلماں مجھ کو

کیونکر تجھے معلوم ہو احوالِ دلِ زار — جب بے خبری میری طرح ہو تو خبر ہو

گم رہانِ عشق آخر راہ پر آجائیں گے — جستجوئے کوئے جاناں رہنما ہو جائے گی

تم کو ہم سے خدا جدا نہ کرے — ہم جدا تم سے ہوں خدا نہ کرے
شبِ فرقت بھی کاٹ دیتے ہیں — کیا کریں عمر اگر وفا نہ کرے

کھویا غمِ فراق کو جوشِ خیال نے — آنکھوں سے لاکھ دور ہے دل سے قریب ہے

سیّد ضامن علی جلالؔ لکھنوی

باغباں لاکھ چھپایا کئے لیکن نہ چھپا — خونِ مرغانِ چمن رنگ ہوا بو نہ ہوا

بتوں کو شوق ہوا عالمِ آشنائی کا — انہیں بھی رنگ پسند آ گیا خدائی کا
بہت ڈرے ہوئے ملتے ہیں شیخ و زاہد سے — اٹھا چکے ہیں ہم الزام پارسائی کا
بڑی امید ہے منزل میں ناتوانی سے — یہی تو ساتھ نباہے گی نارسائی کا

شوخیوں نے تری کچھ کام نکلنے نہ دیا — رنگ حیرت سے زمانے کو بدلنے نہ دیا
کبھی نالے نے دکھائی نہ بہارِ تاثیر — شجرِ اے عشق دیا پھولنے پھلنے نہ دیا
آہ تک کر نہ سکے محفلِ جاناں میں فلک — یہ بھی حسرت تھی کوئی جس کو نکلنے نہ دیا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو — پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا
چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں — شبِ فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا
جلالؔ باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم — چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

نہ خوف آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا — بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا

میں شوقِ دید میں کیا جانے کتنی دور آیا — کھلی کچھ آنکھ وہیں جب قریبِ طور آیا
تڑپ بھی پہلے نہ تھی تجھ میں اے دلِ بیتاب — کسی کو رحم ترے حال پر ضرور آیا

تغافل کے گلے سن کر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

تڑپ دل کی دکھانا تھا جلالؔ ان شوخ چشموں کو
وہیں کی بخت نے سستی جہاں چالاک ہونا تھا

رہتا ہے کلیجے میں نہاں عرو محبت
یہ چوٹ وہ ہے جس کو ابھرنا نہیں آتا

بے پردہ ترے دیکھنے کا حوصلہ کر کے
دل آپ میری آنکھ سے محجوب ہے میرا

شوقِ مجنوں نے وہ لگاوٹ کی
اٹھ گیا آپ پردہ محمل کا

کہہ کے وہ اٹھ گئے کہ مشکل ہے
سہل کرنا تمہاری مشکل کا

نام اس بے وفا کا لو نہ جلالؔ
ذکر اب کیا گئے ہوئے دل کا

بے پردہ ہم سے ہو کے وہ کرنے لگے حجاب
حسرت کی آنکھ ہم بھی چھپاتے تو خوب تھا

پھر ان کو ہجر و وصل میں ہونے لگی تمیز
بے خود ترے نہ آپ میں آتے تو خوب تھا

حسرت تھی دید کی جو تری جلوہ گاہ میں
کچھ دل میں ہم وہ لے کے چلے کچھ نگاہ میں

منزل میں لے کے بیٹھ گیا ہے ہجوم یاس
تھکتے نہ ہم تھکائے ہوئے کارواں کے ہیں

نقشِ قدم پکارتے ہیں راہِ عشق میں
مٹ جائیں حوصلے جسے نام و نشاں کے ہیں

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ چمن
شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں
مگر سب بزمِ رنداں میں تمہارا نام لیتے ہیں

اندازۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں، وہاں کچھ کمی نہیں

خاک اپنی اڑ کے شوقِ تباہی میں رہ گئی
کم بخت پڑ کے دیدۂ راہی میں رہ گئی
تھی اک شکایت اس شہِ خوباں سے وہ بھی حیف
شکرِ گدا نوازیٔ شاہی میں رہ گئی
حسرت نہ نکلی وصل میں بھی دستِ شوق میں
اندیشہ ہائے نامتناہی میں رہ گئی

ساغر کدھر کدھر نہ جھکا چشمِ یار کا
دل سب کے بزمِ بادہ پرستاں میں رکھ لئے
کچھ اشک دل سے آئے کھٹکتے جو اے جلال
ذوقِ خلش نے دیدۂ گریاں میں رکھ لئے

زاہد کو رند ابھار کے لائے ہیں راہ پر
کچھ کچھ مگر کرامتِ پیرِ مغاں بھی ہے

کہتا ہوں داغ جس کو وہ حسرت ہے وصل کی
میرے جگر کی پھانس محبت کا دانہ ہے

گم جب سے کئے ہوش تری جلوہ گری نے
کیا کیا نہ خبردار کیا بے خبری نے
دیوانہ کیا ناز سے اک رشکِ پری نے
اتنا تو کیا عشق کی وحشت اثری نے
اٹھتی نہیں ہے شرم سے اپنی نگہِ شوق
محجوب کیا ہے یہ تری پردہ دری نے

آنسو ڈ کے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو
فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے

خوبرویوں کے بگڑنے میں ہیں لاکھ بناؤ
کہیں اچھوں کی کوئی بات بُری ہوتی ہے

اس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

مہدی علی خاں ذکی لکھنوی

چل بسے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا
جا بجا الجھا ہوا کانٹوں میں داماں رہ گیا

یاد آگئی بہار جو دیرینہ عشق کی
شعلے بھڑک اٹھے مرے داغِ کہن میں آج

اک ذرا تیغِ نگہ کو جو اشارہ ہو جائے
آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے

سیّد مرزا تعشق لکھنوی

اُنس ہے خانۂ صیاد سے گلشن کیسا
نازپروردۂ قفس ہوں میں نشیمن کیسا

بدلتا تھا میں دردِ دل سے جو پہلو
زمانہ ادھر کا ادھر ہو رہا تھا

پڑ گئی کیا نگہِ مست تری اے ساقی
لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

ہر طرف حشر میں جھنکار ہے زنجیروں کی اُن کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

قفس میں بھی ہے اسیرو تمہیں وہی سودا لگائے فصلِ بہاری کی آس بیٹھے ہو

مرا پیام صبا میرے گل سے کہہ دینا چلی گئی مجھے بے ہوش کر کے بو تیری
تمام رات رہا دل سے ذکر خیر ترا گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

مرزا مچھو بیگ عاشقؔ

بلبل کی بھول موسم گل میں ہے یادگار کہتی ہے ہر شجر پہ نشیمن یہیں تو تھا
پہلو سے اُن کے اٹھتے ہی دل کا پتہ نہیں عاشقؔ وہ میری جان کا دشمن یہیں تو تھا

میر وزیر علی صبؔا لکھنوی

جوشِ الفت میں اور ضبط اے دل جبر پر اختیار کیا کہنا

کون ہوگا جو نہ محوِ رُخ زیبا ہوگا تم اگر سیر کو نکلو گے تماشا ہوگا

جب وہ قدم جنوں میں مرا ساتھ ہو گیا پھیلا کے پاؤں قیس بیاباں میں رہ گیا

آبرو دل کی کدورت نے نہ چاہی ورنہ یہ وہ قطرہ ہے جو بڑھ جاتا تو دریا ہوتا

پھر سیرِ لالہ زار کو ہم اے صبا چلے آئی بہار داغِ جنوں پھر ابھر گیا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

مری نجات کچھ ان واعظوں کے ہاتھ نہیں
بڑا کریم ہے جس کا گناہ گار ہوں میں

نیرنگی نصیب ہے غم کے بیان میں
سو رنگ کے طلسم ہیں اک داستان میں

خاک میں مجھ کو ملا کر وہ صنم کہتا ہے
"اپنے اللہ سے جا کر مری فریاد کرو"

یوں ہی اڑا کریں گی گریباں کی دھجیاں
جب تک کہ ہاتھ دامن جاناں سے دور ہے
فصل جنوں ہے جامہ دری کی بہار ہے
ٹوٹے وہ ہاتھ جو کہ گریباں سے دور ہے

پھر چلے دامن صحرا کی طرف آئی بہار
پھر ہوا جوش جنوں دست و گریباں ہم سے

مر گئے عاشق نالاں تو کہا اس بت نے
سو گئے فتنۂ محشر کو جگانے والے
کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

مرزا عنایت علی بیگ ماہ لکھنوی

اس گلشن ایجاد میں رنگ رخ ہر گل
خوں جگر بلبل شیدا سے نکالا
وہ درد طلب ہوں کہ تری راہ میں میں نے
کانٹا نہ کبھی آبلۂ پا سے نکالا

اس مسیحا سے علاج دل شیدا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہوا بیمار جو اچھا نہ ہوا

جوشِ جنوں میں ہم نے گریباں کو پھاڑ کر
اے وحشت تیرے واسطے دامن بنا لیا
کارِ محال سہل کیا ہم نے عشق میں
دشمن کو دوست، دوست کو دشمن بنا لیا

ہمارے نالۂ دل کی بھی کچھ سُنی تاثیر
جو پہنچے کان تک اُن کے تو کچھ اثر بھی نہ ہو
مسافرانِ عدم کو ہے کیا کڑی منزل
نہ گزریں جان سے تو راہ میں گزر بھی نہ ہو

کیا زور تھا کیا شور تھا اک قطرۂ خوں کا
اے حضرتِ دل دیکھی کرامات تمہاری

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

فریاد و فغاں بلبلِ ناشاد کیے جا
مہمان قفس خاطرِ صیاد کیے جا
اے دل خم ابروئے صنم میں سحر و شام
کچھ بندگیٔ حسن خداداد کیے جا
گلگشت عدم خوب سفر ہے مگر اے دل
سیر چمن گلشن ایجاد کیے جا

حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو
یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

ہائے جب کہتا ہوں اُس سے سوز دل کہتے ہیں وہ
چپ رہو رازِ محبت داستاں ہو جائے گا

اللہ رے اضطراب تمنائے دید یار
فرصت میں اک نگاہ کی سو بار دیکھنا
تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے
اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

ہائے کب تک میں گھبراؤں گا اے وحشت جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

ہٹ اس کی رہ گئی یہ بڑی بات ہے مجھے   دل چیز کیا تھا ہاتھ سے اپنے گیا گیا

نالہ کھنچا ہے، دل ہے خفا شوق ہے اُداس   تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

وہ دیکھ کر مجھے بے پردہ کیوں ہوئے اے دل   نگاہ شوق نے سمجھا دیا نقاب میں گیا

ہمیشہ یاس کسے آکے دیکھ جاتی ہے   کوئی امید ہے باقی دل خراب میں کیا

بزمِ ساقی آگئی ہے یاد کس مے نوش کو   جام چھلکا شیشۂ مے ہچکیاں لینے لگا

چاہئے مینائے مے کو سجدۂ شکرانہ آج   سر کے بل آتا ہے زاہد جانب میخانہ آج
کل نگاہ منتظر ڈوبی ہوئی تھی جام میں   پھرتی ہے آنکھوں میں میری گردش پیمانہ آج

پرواز اوّلیں میں اسیری ہوئی نصیب   گویا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم

حسن دل افروز کا دیوانہ ہوں   شمع رو کوئی ہو میں پروانہ ہوں
مر کے بھی چھوٹے نہ ساقی کے قدم   آج تک خاکِ درِ مے خانہ ہوں

مانا کہ حسنِ یار سے لبریز ہے جہاں   لیکن وہ حوصلہ وہ شکیبِ نظر کہاں
ہر وقت یار تھا رگِ جاں سے قریب تر   تسلیم تو خراب پھرا عمر بھر کہاں

سبب شرمِ التجا ہوں میں
لبِ خاموش مدعا ہوں میں

بے حقیقت نہ جان اے تسلیم
مظہرِ قدرتِ خدا ہوں میں

رہ نہ جائے آرزوئے چارہ گر
لذتِ تکلیفِ درماں دیکھ لیں

التفاتِ جوشِ وحشت پھر کہاں
ہو سکے جب تک بیاباں دیکھ لیں

گر انہیں ہے خوفِ عرضِ آرزو
دُور سے حالِ پریشاں دیکھ لیں

ہنستے ہیں گل بھی دیکھ کے اپنی خبر نہیں
گویا چمن میں چاک گریباں ہمیں تو ہیں

اہلِ وفا کو ولولے آہ و فغاں کے ہیں
دنیائے عشق میں بڑے نام آسماں کے ہیں

ناصح خطا معاف سنیں کیا بہار میں
ہم اختیار میں ہیں نہ دل اختیار میں

کیا کیا خیالِ حسرتِ دیدار قیس تھا
چھُپ چھُپ گیا ہے ناقۂ لیلیٰ غبار میں

شکستہ پا ہوں کہیں ساتھ سے نہ رہ جاؤں
مجھے بھی ہاتھ ذرا دوستو لگائے چلو

عدم میں ترسو گے دردِ جگر کو اے تسلیم
جو ہو سکے کوئی سینے پہ تیر کھائے چلو

کرتے ہیں سجدے اس لئے دیر و حرم میں ہم
کیا جانئے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

کیا عجب حشر پہ موقوف ہو ملنا اس کا
ناامیدی نہ کرے اتنا ابھی بے دل مجھ کو

فرصتِ دید نہیں ہے شررِ شمع کی طرح
پھونکے دیتی ہے تری گرمیِ محفل مجھ کو

کعبے کا ارادہ کئے نکلے تو ہیں گھر سے
آ جائے وہ بت سامنے اس دم تو مزا ہو

عجب ہے فصلِ بہار میں کیوں جگر ہے صد چاک سینہ پر خوں
بیاضِ دل پر لکھا ہوا کیا دلِ شکستہ کا حال ہے کچھ

گر یہی ہے پاسِ آدابِ سکوت
کس طرح فریاد لب تک آئے گی

یہ تو مانا دیکھ آئیں کوئے یار
پھر تمنا اور کچھ فرمائے گی

جانے دو صبر و قرار و ہوش کو
تو کہاں اے بیقراری جائے گی

اللہ رے ضبطِ رازِ محبت کہ آج تک
جو حرفِ مدعا ہے مرا ناشنیدہ ہے

تکلیفِ التماس سے ہے پاک مدعا
غماز عاشقی مرا رنگِ پریدہ ہے

اے دل دیوانہ امیدِ رہائی کس لئے
پیچ و خم کا ہے کو زلفِ پُرشکن کے جائیں گے

کیا کہہ کے عندلیب چمن سے نکل گئی
کیا سن لیا گلوں نے کہ رنگت بدل گئی

افسانہ گو تے اور بھی بے خواب کر دیا
ظالم سنا رہا ہے مری داستاں مجھے

وہ گم شدہ ہوں سوئے عدم اضطراب میں
دوڑی گئی ہے ڈھونڈنے عمرِ رواں مجھے

میں شرم خاک کروں فرقۂ ریائی کی
کہ چھینٹ بھی نہیں زاہد میں پارسائی کی

ہزار بار پلائی ہے اور ہمیں سے شیخ　　حرم میں بیٹھ کے پیتا ہے پارسائی کی

کاروانِ بوئے گل بھی چل بسا حیران ہوں　　خاک اڑاتی ہے چمن میں اب صبا کس کے لئے
کیا کہیں ہم کس کی آمد ہے کہ راہِ شوق میں　　منتظر بیٹھے ہیں مثلِ نقشِ پا کس کے لئے

شمیمِ یار نہ جب تک چمن میں چھو آئے　　نہ رنگ آئے کسی پھول میں نہ بو آئے
دماغ دے جو خدا گلشنِ محبت میں　　ہر ایک گل سے ترے پیرہن کی بو آئے

اٹھنے کو ادھر بھی نگہِ ناز تھی لیکن　　کیا جانئے کیا کہہ دیا آنکھوں سے حیا نے
پھر ڈھونڈتی ہیں کوچۂ جاناں کو نگاہیں　　دیوانہ بنایا مجھے جنت کی فضا نے

اس عشق کا برا ہو کہ اپنے قفس سے ہم　　کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں جب دم رہا ہوئے

سیّد فرزند احمد صفیرؔ بلگرامی

جوششِ شوقِ شبِ وصل میں دشمن ٹھہری　　تنگ آئی ہے مری آرزوئے دل کیا کیا
جستجو میں تری تھک گئے چلنے والے　　پاؤں پھیلائے پڑے ہیں سرِ منزل کیا کیا

ہر دم صدا یہی ہے ترے دادخواہ کی　　مارا نظر نے رہ گئی حسرت نگاہ کی

تو نے گلگشت جو موقوف کیا اے گلِ تر
پھول مرجھائے چلے آتے ہیں گلزاروں سے

مرزا رحیم الدین حیاؔ

بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں رہے — شبِ فراق کٹی روزِ انتظار آیا
کھلی نہ آنکھ ترے کشتۂ تغافل کی — ہزار شورِ قیامت اُسے پکار آیا

قبا کے ٹکڑے کیے ہیں تو جیب بھی کر چاک — گھڑی گھڑی کی جنوں زور آزمائی کیا؟

خدا ہی ہے کہ رہے توبہ کعبہ جانے تک — قدم قدم ہے تصور شراب خانے کا
وہ بات ہی نہ رہی ذکرِ غیر آتے ہی — وہ وقت ہی نہ رہا الفت آزمانے کا

ہوئی لبوں کو یہ جنبش کہ بس عتاب ہوا — تمہارا نام نہ لینا ہوا عذاب ہوا

رہ چکی اب شبِ غم جان کے اس ظالم نے — وعدۂ وصل قیامت کی سحر پر رکھا
اور بھی ڈھنگ نکالا کوئی ملنے کا حیاؔ — یا فقط جذبۂ الفت کے اثر پر رکھا

کیا اعتبار دین کا عاشق کے زاہدا — یاد آئے ہے خدا بھی تو کافر کو دیکھ کر

رہنے بھی دو یونہی مرے حالِ خراب کو — جینے دو کوئی دن کسی حسرت مآب کو

پہنچانے چلے وہ تو ہوا ساتھ زمانہ — ہنگامۂ محشر مرا ہنگامِ سفر ہے
گو آپ یہ کہہ دیں کہ نہیں کچھ مجھے منظور — وہ میری نظر میں ہے جو منظورِ نظر ہے

دشمن جان تو اپنے تھے نہ بیگانے تھے — دل بےتاب کو ٹکڑے مرے اڑوانے تھے
ہائے اُس کی در و دیوار سے باتیں کرنی — ہم تو اپنے دل بیتاب کے دیوانے تھے

دیا فراق سدا وصل یار کے بدلے — لٹے فلک نے یہ کس روزگار کے بدلے

خواجہ محمد وزیر وزیرؔ

کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے — ادھر آے دستِ جنوں آیئے گا

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے — اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ — اب توقع نہیں رہائی کی

نواب بیگم حجابؔ

جواب دو کہ نہ دو اے بتو نہیں پروا — کہوں جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی
حجاب کو تو زمانے میں جانتے ہیں سب — مگر جو کہتے ہیں تم کو ذرا سنو تو سہی

جو اُس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہم تو — اس پر بھی نگاہوں سے اترتے گئے ہم تو

دامنِ محبوب تک پہنچا نہ جب دستِ جنوں — بڑھ گیا ناچار اپنے ہی گریباں کی طرف

ضیائی بیگم ضیائی

تمہارا ہم سے ہمارا تم سے نہ اٹھ سکے گا عتاب ہرگز
اٹھے تو کیونکر اٹھے بتاؤ کہ تم ہو نازک میں ناتواں ہوں

اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی

غم سہتے ہیں پر غمزہ بے جا نہیں اٹھتا — مرتے ہیں مگر ناز مسیحا نہیں اٹھتا

بے کسی آپ سے باہر نہیں جانے دیتی — مجھ سے آباد ہے عالم شبِ تنہائی کا

دشتِ جنوں سے نقشِ کفِ پا اُلجھ پڑا — شکرِ خدا کہ پاؤں مرا درمیاں نہ تھا
بجلی تھی مہربان، کبھی آتشِ بہار — صد شکر بے چراغ مرا آشیاں نہ تھا

اُن کے جاتے ہی نہ ٹھہرے گی بہارِ بزمِ عیش[1] — ساتھ اپنے ایک گل سارا چمن لے جائیگا

---

[1] حسرت موہانی نے اسی مضمون میں عجب نزاکت پیدا کر دی ہے۔ شعر ہے ؎
عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

شاید نگہِ یار ہی اس کوچے میں ٹھہرے
اب تک رگِ جاں میں کوئی نشتر تو نہ ٹھہرا

کیا ہاتھ مرتے پہنچیں گے دامانِ زباں تک
اپنے ہی گریباں سے فرصت نہیں ملتی

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ

دامن تک اس کے ہائے نہ پہنچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
دیکھا نہ ہوگا خواب میں بھی وہ فروغِ حسن
پردے کو اس کے جلوے نے گلشن بنا دیا
مشّاطہ کا قصور سبھی سب بناؤ ہیں
اس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُرفن بنا دیا
اظہارِ عشق اُس سے نہ کرتا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

کیا میکدوں میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں
البتہ ایک واں دلِ بے مدعا نہ تھا
ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو
مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا

آپ مرتے تو ہیں پر جیتے ہی بن آئے گی
شیفتہ ضد پہ جو اپنی وہ ستم گر آیا

کچھ انتظار مجھ کو نہ مے کا نہ ساز کا
ناچار ہوں کہ حکم نہیں کشفِ راز کا

وصل کے لطف اٹھاؤں کیونکر … تاب اس جلوے کی لاؤں کیونکر
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ … اس کی میں یاد بھلاؤں کیونکر

جو بات میکدے میں ہے اک اک زبان پر … افسوس مدرسے میں ہے بالکل نہاں ہنوز
اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی … کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں … کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں
کچھ زہر اگل رہی ہے بلبل … کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں
بدمست جہان ہو رہا ہے … ہے یار کی بُو ہر ایک شے میں
ہے مستیٔ نیم خام کا ڈر … اصرار ہے جام پے بہ پے میں
مے خانہ نشیں قدم نہ رکھیں … بزمِ جم و بارگاہِ کے میں
کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت … کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

محفل میں اک نگاہ اگر وہ ادھر کریں … سو سو اشارے غیر سے وہ رات بھر کریں
طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ … دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

رات ساقی نے کہا جس کے یہ سب جلوے ہیں … وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں
رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحرگاہی سے … اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں
دل کے بدلے میں طلب گار نہیں کچھ تم سے … شیفتہ زمرۂ اصحاب تجارت میں نہیں

ہے امتزاج مشک مے لعل فام میں … آتی ہے بوئے عنبر ہمارے مشام میں

آئی جو آج کام میں صہبائے تند و تلخ   ساقی نے خوب راز کہے بار عام میں

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں   جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ   ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

ہر خار و خس ہے وجد میں ہر سنگ و خشت مست   کیا مے کشوں نے آ کے کیا خانقاہ میں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ   طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

گر کچھ خلل نہ آئے تمہارے فراغ میں   حسرت کا ہے ہجوم دل داغ داغ میں

اس نو بہارِ حسن کو بدنام مت کرو   تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش دماغ میں

گریہ ہے ہجوم ابرِ سیاہ   گر کوئی مے پیئے بعید نہیں

ذکر میرا سنو، نہ مجنوں کا   لطف بے قصہ جدید نہیں

ناصح تری زبان ترے بس میں جب نہ ہو   انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

افسوس اُس نے کچھ نہ کہا سُن کے حالِ دل   ہم قصہ خواں کی طرح فسانہ سُنا چلے

نیرنگِ عشق دیکھ کے منظور ہے انہیں   گلگونہ میں چکیدۂ مژگان تر ملے

محفل طرازیوں کے مزے سب بھلاؤں گا   وہ اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی

میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اتنی بھی بُری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

ہزار شکر کہ اس کی گلی میں چھوڑ گئی
نسیم جان کے اک ناتواں غبار مجھے

جو شور شیں نہ مچاتا اسیر کیوں ہوتا
خراب تو نے کیا جلوۂ بہار مجھے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

بڑے فساد اٹھیں شیفتہ خدا نہ کرے
کہ ان کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے

بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر
یہ اہلِ مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

مرزا قربان علی سالکؔ دہلوی

گماں مجھ پر ہے اس کو داد خواہی سے شکایت کا
قیامت ہو گیا حق میں مرے آنا قیامت کا

کل کس قدر ہوا میں سبک اُن کی بزم میں
بیٹھا ہوا تھا اور عدو پر گراں نہ تھا

نہ پوچھو کہ نظروں سے گزرا ہے کیا کیا
ان آنکھوں نے کیا جانے دیکھا ہے کیا کیا

زباں تھک گئی جس کی شکرِ جفا میں
وفا کا مری اس کو شکوہ ہے کب کیا

بتوں کے عشق نے یکساں کیا زمانے کو
نہ کوئی خاص جہاں میں نہ کوئی عام رہا

کرتے ہیں یوں دُعا کہ ہم گویا
ہاتھ اثر سے اٹھائے بیٹھے ہیں

پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب　　　تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

اس وسعتِ تقریر کو وہ طنز نہ سمجھیں　　　یہ شکوۂ جفا کام شکایت کا نہ کر جائے
دیکھوں گا ترے فتنۂ رفتار کا عالم　　　ہر چند قیامت ہی مرے سر سے گزر جائے

چلے آتے ہیں سیر کرتے ہوئے وہ　　　گلستاں گلستاں ہوا چاہتا ہے
نہ دیکھا کرو تم کہ اب آئینہ بھی　　　مری چشمِ حیراں ہوا چاہتا ہے

دے کے خط کیا کیا تصور سے ہوئے ہیں ہم مشتاق　　　ہم ترے کوچے میں ہیں اور نامہ بر منزل میں ہے

صیاد اور بند قفس سے کرے رہا　　　جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
کن حسرتوں سے سالکِ بیکس نے جان دی　　　اب بے کسی مزار پہ چھائی ہوئی سی ہے

غیر سے مشورۂ ظلم و ستم کرتے ہیں　　　دیکھئے آج وہ کیا ہم پہ کرم کرتے ہیں

مرزا عبدالغنی بیگ مائل دہلوی

حشر میں شیخ و برہمن کے یہ جھگڑے پھیلے　　　کوئی پرساں نہ ہوا ہم سے گنہ گاروں کا

محروم پھر آیا درِ میخانہ سے واعظ　　　رندانِ قدح خوار کی ہمت کو ہوا کیا

حوضِ کوثر پہ جا نکلتا ہے　　　یہی رستہ شراب خانے کا

جھپکی تھی ذرا آنکھ کہ وہ خواب میں آئے   اس رات کو اب میں شبِ غم کہہ نہیں سکتا

ہے یہی طرزِ تغافل تو کبھی دن ہم بھی   ترے کوچے سے چلے جائیں گے ناچار کہیں

ملیں کسی سے تو بدنام ہوں زمانے میں   ابھی گئے ہیں وہ مجھ کو سُنا کے پردے میں
نہ مانگ زاہدِ ناداں ذرا سمجھ تو سہی   شکایتیں ہیں یہ کس کی دُعا کے پردے میں

کیا کہتی ہے یہ چشمِ فسوں گر اسے دیکھو   لو ہم نہ کہیں گے ستم ایجاد کسی کو

ہم تو اس فکر میں رہتے ہیں کہاں کا انصاف   دیکھیے داورِ محشر بھی کدھر ہوتا ہے

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا   کام آپڑا ہے رحمتِ پروردگار سے

مائل ہمیں تو رات کہیں رہ کے کاٹنی   مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے

سیّد محمد ذکریا خاں زکیؔ دہلوی

او چشمِ بے نیاز ذرا دیکھ تو سہی   کیا حال ہو گیا ترے امیدوار کا

سو رنج سو الم ہیں یہاں ہر نفس کے ساتھ   دم کا نہیں شمار تو غم کا حساب کیا

یہ رنگ و بوئے سوزِ طبیعی کہاں نصیب   گل کو ہے رشک میرے دلِ داغدار کا

عبث بیٹھے بٹھائے چھوڑنا کنج قفس میں کیوں　　مری تقدیر میں لکھا تھا داغ آشیاں ہونا
دل دیوانہ کے طولِ امل کا سلسلہ ہے یہ　　مبارک ہو تری زلفوں کو عمر جاوداں ہونا

بتوں کا جلوۂ پیہم سے حفظِ جاں معلوم　　یہ چشم و دل میں سماتا ہے رنگ و بو ہو کر
تمہاری بزم ہے گویا بہار دیدہ و دل　　رہے ہیں غنچہ و گل ساغر و سبو ہو کر
پھر آج دیکھئے کس کس کی جان جاتی ہے　　وہ گھر سے نکلے ہیں عالم کی آرزو ہو کر

کھولے ہوئے رہتے ہیں گل و یاسمن آغوش　　بنتا ہے عرض شوق میں تیرے چمن آغوش

سیر چمن کو آؤ تو از راہِ بے خودی　　اس ناز و رنگ و بُو کو ابھی بھول جائے گل
ہے شوقِ یار میں ہمہ تن رنگِ اضطراب　　موج بہار کیوں نہ ہو زنجیر پائے گل

بے چین جب وہ ہو گئے تسکین دل کہاں　　اے آہ تنگ آئے ہیں تیرے اثر سے ہم
ظاہر ہوا نگاہ تحیر سے رازِ عشق　　اُس کی نظر سے گر گئے اپنی نظر سے ہم

وہی سبزہ، وہی وحشت، وہی ویرانی ہے　　اور کیا دشت میں ہوگا جو مرے گھر میں نہیں

دوریٔ منزلِ مقصود کا کیا چارہ زگی　　کارواں میں ہوں مگر خاطر رہبر میں نہیں

دکھائے گی مجھے حیرت اب اور کیا یا رب　　وہ بات کیا ہے کہ جو جلوہ بتاں میں نہیں
گزر رہی ہے جو دل پر کہوں تو کس سے کہوں　　وہ بات سُن سکے یہ تاب رازداں میں نہیں

تم کو ستمگر کہیں اور بُرا کہا کریں ——— اس کے سوا کیا کہیں اس کے سوا کیا کریں
اُن کو مذاقِ ستم عذرِ جفا کیا کریں ——— خو ہمیں تسلیم کی اس کا گلہ کیا کریں

رسوا کُن جہاں نگہِ ناز ہی نہیں ——— پنہاں رہے یہ عشق کا انداز ہی نہیں

پُر شرمگیں نگہ یہ تبسم نقاب میں ——— کیا بے حجابیاں ہیں تمھارے حجاب میں

نہ پہنچے کیوں ترے قدموں سے تا سرِ دامن ——— مرا غبار مری آہ نارسا تو نہیں
نمودِ عشق ہے بیگانگی کے پردے میں ——— وہ مجھ سے اور میں اُس شوخ سے جُدا تو نہیں

دامن تھا اُن کا ہاتھ میں صبحِ شبِ وصال ——— کیونکر سنبھالتا دلِ اندوہگیں کو میں

ناصح متاعِ عشق کو ہم چھوڑ دیں گے آپ ——— باقی ہے ایک جان ذرا اس کو ہار لیں
کچھ ایسے تنگ ہیں غمِ دل سے کہ جی میں ہے ——— کہتے ہیں جی کو دے کے غمِ روزگار لیں
پہلو وہ کون سا ہے تجھے جس سے آئے چین ——— کروٹ ہم اب کدھر کو دلِ بے قرار لیں

محرومیوں نے ذوقِ تمنا مٹا دیا ——— جو آرزو تھی حسرتِ حاصل میں آگئی

نفس نفس ہے نسیمِ وفا محرکِ شوق ——— یہ وہ مزا ہے جسے شوق جاوداں کہیے
وہاں یہ فکر کہ رازِ دل آشکار نہ ہو ——— یہاں یہ شوق کہ کچھ حسرتِ نہاں کہیے
وہ سادگی سے تغافل کو ناز کہتے ہیں ——— مگر سکھاتی ہے شوخی کہ امتحاں کہیے

یارب یہ ایسا کون حریفِ جنوں ہوا — گُل کو ہے رنگ و بو کا تقاضا بہار سے

دل کو یہ شوق کہ وعدے کی وفا یاد رہے — وہ مے حسن سے مخمور انہیں کیا یاد رہے

کر دیکھیں گے نالہ بھی وہ آئیں کہ نہ آئیں — تیرا بھی کہا اے دلِ ناشاد کریں گے

وہ میرا غم ہی سنیں پوری داستاں نہ سہی — حکایتِ دلِ بے تاب درمیاں نہ سہی
خموش بیٹھے ہو محفل میں کوئی بات ہے یہ — زباں دی ہے خدا نے تمہیں دہاں نہ سہی
نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور — ہمیں تو خاک اڑانی ہے کارواں نہ سہی

ہاں آنے دو بزم میں ذکرِ اہلِ وفا کا — پھر دیکھوں وہ کیونکر نہ مجھے یاد کریں گے

اُن کا جس راہ میں نقشِ کفِ پا ہوتا ہے — ہر قدم سجدۂ اربابِ وفا ہوتا ہے

تمہارا ذکر نہ ہو روئداد شوق نہ ہو — تو یہ ہی کیوں نہ کہو کوئی بے زباں ہو جائے

میر حسین تسکینؔ دہلوی

تھا میری طرح غیر کو بھی دعویٔ الفت — ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا
بے بال و پری کھوتی ہے توقیر اسیری — صیاد کبھی لے کے یہاں دام نہ آیا

اتنی سُرخی شفقِ چرخ پہ کس دن تھی مگر — عاشقِ زار کا کچھ رنگ اڑا ہو شے گا

زلفِ پُرپیچ کو کھولا ہے کسی نے یارب　　　کہ مرے پاؤں کی زنجیر کسے دیتے ہیں

اے چشمِ سرمگیں تری گردش نے کب کیا　　　راحت پذیر تھے ستمِ آسماں سے ہم

یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گزرو گے　　　پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بے داد نہ ہو

کس کو جی جانے سے ناصح تو ڈراتا جاتا ہے　　　یہی جاتا ہے محبت میں تو کیا جاتا ہے

بے تابیوں کی اور ہوس ہو تو آن کے　　　سیماب سے کہو دلِ مضطر میں گھر کرے
اے دل یہ تیرا خاک میں ملنا ہے بے اثر　　　وہ کر جو اس کے طبعِ نکتہ رس میں گھر کرے

شبِ وصال میں سُننا پڑا فسانۂ غیر　　　سمجھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تمکینؔ　　　کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

سیّد ظہیرالدّین ظہیرؔ دہلوی

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کب کیا
نگاہِ سُرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
دلِ خوں گشتۂ حسرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
بہار آگیں ہے کچھ اب کے برس فصلِ خزاں کیا کیا
تصور میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجود آستاں کیا کیا

بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے
کہیں جو ذکرِ حریفانِ بادہ خوار آیا

اعجاز دل عزیبیٔ انداز دیکھنا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا

تا چند نظر بازی و پابندی تقویٰ
ہمسائگی شعلہ و سیماب کہاں تک
پہچانتے ہیں جانتے ہیں خوب نظرباز
آخر یہ کرشمے پس جلباب کہاں تک

بات کیا ان سے کروں ان کو اٹھاؤں کیونکر
مدعی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں
وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیر
ہم الگ سب سے گنہ گار بنے بیٹھے ہیں

کہئے تو کہوں انجمن غیر کی روداد
کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکیں ہے الٰہی کیا قیامت ہے
الجھتے ہیں وہ رفتار سو سو بار دامن سے
اُلجھ کر خار دامن سے مرے کیا کیا پشیماں ہیں
کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

کس کی آشفتہ مزاجی کا خیال آتا ہے
آپ حیران پریشان کہاں جاتے ہیں
آج کس منہ سے مری دل شکنی ہوتی ہے
آج وہ آپ کے پیمان کہاں جاتے ہیں

عبدالعلیم آسی

رشکِ خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو — کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا
درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا — مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا — میں اُس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا
خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل — کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا
وفورِ بےخودئ بزمِ مے نہ پوچھو رات — کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا — یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ہوا کے رخ تو ذرا آ کے بیٹھ جا او قیس — نسیمِ صبح نے چھیڑا ہے زلفِ لیلیٰ کو

کمی نہ جوشِ جنوں میں نہ پاؤں میں طاقت — کوئی نہیں جو اٹھا لائے گھر میں صحرا کو

ظاہر میں تو کچھ چوٹ نہیں کھائی ہے ایسی — کیوں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا ہے جگر سے

وصل ہے پر دل میں اب تک ذوقِ غم پیچیدہ ہے — بلبلہ ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے
اتنے بت خانوں میں سجدے ایک کعبے کے عوض — کفر تو اسلام سے بڑھ کر ترا گرویدہ ہے

حشر میں منہ پھیر کر کہنا کسی کا ہائے ہائے
آسیِ گستاخ کا ہر جرم نابخشیدہ ہے

مستی میں کوئی راز جو اُس سے فاش ہو　　معذور ہے ابھی کہ نیا بادہ خوار ہے

سیّد شجاع الدّین خاں انورؔ شاگرد غالبؔ

نہیں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے
کہاں کی دل لگی کیسی محبت　　مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے

یہ خوشی کم ہے کہ ہم اس بزم میں　　اک طرف بیٹھے تو ہیں ناشاد سے

بدمستیوں کا رنگ ہے جوشِ شباب میں　　گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

خیر الدّین یاسؔ شاگرد مومنؔ

ربط غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو　　دل میں سمجھو کہ یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو
عشوہ و ناز و ادا طعن سے کہتے ہیں مجھے　　ایک دل رکھتے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

غلام علی خاں وحشتؔ شاگرد مومنؔ

منفعل جوشِ جنوں سے ہوئے ایسے کہ نہ پوچھ　　طوقِ آہن جسے سمجھے تھے گریباں نکلا

مرزا زین العابدین عارفؔ دہلوی

جو کعبے میں ہے وہی ہے بتخانے میں جلوہ　　اک پردہ ہے سو شیخ حرم اٹھ نہیں سکتا

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو اے نالۂ دل　　بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

آغازِ دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ　　یہ ابتدا ہے وہ کہ نہ جن کی خبر ملے

نظام شاہ نظامؔ رام پوری

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا　　خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

خدا جانے مجھ کو دکھائے گا کیا　　یہ چھُپ چھُپ کے اپنا ادھر دیکھنا

منہ پھیر کے ہنس ہنس کے وہ اقرار کی باتیں　　اس طور سے کرتے ہیں کہ باور نہیں ہوتا

وہ تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے　　پوچھتے حال ہیں اکثر میرا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ　　منہ پھیر کر اُدھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

محمدؐ یوسف علی خاں ناظمؔ رامپوری

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط　　کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیر آہ و زاری شب ہائے تار جھوٹ　　آوازۂ قبول و دعائے سحر غلط

ہاں سینے سے نمائشِ داغِ دروں غلط　　ہاں آنکھ سے ترادشِ خونِ جگر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے　　عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کیلئے یہ سب فریب ہیں　　اظہارِ پاک بازی و ذوقِ نظر غلط

مٹی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی　　جانِ عزیز پیش کشِ نامہ بر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا — مرنے کی اپنے روز اڑاتی خبر غلط
یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا — کیوں یہ کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط

مجھے اٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے خلوت خاص — وہ لوگ چلے آتے ہیں ادھر دیکھو

نہیں ہے اشک یہ ہے نورِ دیدۂ ہجراں — نہیں ہے داغ یہ ہے شمع دودمانِ فراق
غبارِ وحشت ہے افزائش جمالِ جنوں — متاعِ درد ہے آرائش دوکانِ فراق

بنائے عمر سے اٹھتا غبار دیکھ چکے — یہی خزاں ہے تو پھر ہم بہار دیکھ چکے
بجھے گی نشۂ صہبائے غم سے کیونکر جان — چڑھاؤ یہ ہے تو اس کا اتار دیکھ چکے

آنے کا وعدہ اس نے کیا ہو تو میں کہوں — کچھ خو ہی پڑ گئی ہے مجھے انتظار کی

پردہ نہ رکھا تیرے لبِ روح فزا نے — ہم جانتے تھے اب بقا اور ہی کچھ ہے

نواب غلام حسن خاں محوؔ دہلوی

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں — پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

کرامت اللہ خاں گستاخؔ رامپوری

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

سید آغا حسن امانت لکھنوی

جی چاہتا ہے صنعتِ صانع کے ہوں نثار　　　بُت کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں

رکھنا قدم اے دل رہِ وحشت میں سمجھ کر　　　زنجیر کا ہے سامنا منزل یہ کڑی ہے

سید محمد خاں رند لکھنوی

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا　　　سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور　　　میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

میں مسافر ہوں اتر جاؤں گا پار اک دم میں　　　تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

نسیم صبح چمن تک مجھے تو ہی پہونچا　　　بھٹک رہا ہوں میں گم کردہ آشیاں کب کا

قصور کیا ترا ساقی فلک نہ دیکھ سکا　　　گرایا ہاتھ سے لب تک جو میرے جام آیا

اے رندؔ شوقِ جامہ دری پھر چمک گیا　　　پھر ہاتھ رفتہ رفتہ گریباں تلک گیا

تو گرفتاری میں چندے یادِ گلشن کی رہی　　　اب قفس سے چھٹ کے گھر یاد آئے گا صیاد کا

کبھی نظارۂ چمن نہ کیا　　　اپنے داغوں سے باغ باغ رہا

آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

نہ رہا ہوش، بے خودی ہی تو ہے
ساقیا! شغلِ مے کشی ہی تو ہے
دل ہمارا اُداس ہے بلبل
نہیں لگتا چمن میں جی ہی تو ہے

بُت کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

چمن میں جو کل جا کے دیکھے گلوں کو
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

جلوۂ حسنِ خداداد ذرا دکھلا دے
منکروں کو بھی صنم شانِ خدا دکھلا دے

سنتا ہی نہیں وہ بتِ گمراہ کسی کی
ایسا نہ ہو مؤمن سے کہیں اللہ کسی کی

اچھا نہیں ہر وقت اسیروں کا ستانا
پڑ جائے کہیں آہ نہ صیاد ہماری

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلی بادِ بہاری
کیا اب کی برس چاک گریباں نہ کریں گے

سیر کی، خوب پھرے، پھول چنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

رشکیؒ دہلوی

کب ٹوٹتی ہے توبہ ہماری شراب سے
لیکن ہے ڈر تری نگہِ نیم باز کا

ہیں عشق کی تمام یہ نیرنگ سازیاں — مطلب ہے ایک اصل ہیں راز و نیاز کا

محلِ شکوہ نہ مجھ کو رہا نہ اعدا کو — کہ شوخیاں ہیں تمہاری حجاب میں داخل
مآلِ کار ہو جو کچھ مگر خوشی یہ ہے — کہ میرا نام بھی ہے انتخاب میں داخل

بے وجہ انتظار اگر فرض تھا ہمیں — بے وعدہ آپ کو بھی تو آنا ضرور تھا

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا — ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہو کر خفا عدو سے مٹاؤ نہ امتیاز — تخصیص کی امید ہے مجھ کو عتاب میں

بیم ہجراں ہے کبھی اور کبھی امیدِ وصال — کون کہتا ہے مزہ سستیٔ پیماں میں نہیں

اہلِ دل سے نہ کبھی آپ سنیں گے نالہ — چاک دل میں ہے مگر چاک گریباں میں نہیں

تم سے گلہ نہیں ہے ہمارا قصور ہے — اوپر اٹھائیے نگہ شرمسار کو

مرے پامال ہونے کی حقیقت — خود اپنی شوخیٔ رفتار سے پوچھ
ہمارا دردِ دل کچھ ہم سے سن لے — کچھ اپنی نرگسِ بیمار سے پوچھ
بھلا رنگی کو قدرِ فصلِ گل کب — یہ کیفیت کسی مے خوار سے پوچھ

مسجد میں آ کے اور ہی عالم دکھائیے — بُت خانہ کو تو عالمِ تصویر کر چکے

ہزار رنگ بدلتا ہے دم میں تو اے دل — مگر کسی کے یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

ساقیٔ بزمِ غیر آپ بنے — ہم کو خونِ جگر پیے ہی بنی
وہ جو شرما گئے تو اُن کی خطا — اپنے ذمے ہمیں لئے ہی بنی
بھتے جو ساقی کے ناز توبہ شکن — رات رِندی کو بھی پیے ہی بنی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں
خدا رکھے محبت نے کئے آباد گھر دونوں
میں اُن کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں
کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

مرادیں مانگ رہا ہوں قضا کے آنے کی — بُری گھڑی تھی دلِ مبتلا کے آنے کی
ابھی تو کھیل ہیں اے داغ شوخیاں اُن کی — پھر آرزو میں کروگے حیا کے آنے کی

پیامی کامیاب آئے نہ آئے — خدا جانے جواب آئے نہ آئے
ترے غمزوں کو اپنے کام سے کام — کسی کے دل کو تاب آئے نہ آئے

تم آؤ جب سوارِ توسنِ ناز   قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

ذکرِ مہر و وفا تو ہم کرتے   پر تمہیں شرمسار کون کرے

آفتِ روزگار جب تم ہو   شکوۂ روزگار کون کرے

وعدہ کرتے نہیں یہ کہتے ہیں   تجھ کو امیدوار کون کرے

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہوگیا   میں بت پرستیوں سے مسلمان ہوگیا

رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب   زاہد بھی ہم میں بیٹھ کے انسان ہوگیا

اس غنچے میں سمائی ہے وحشت بہ رنگِ بو   دل کتنی تنگیوں پہ بیابان ہوگیا

لو اے بتو سنو کہ وہ داغ صنم پرست   مسجد میں آج جا کے مسلمان ہوگیا

یہ میں ہزار جگہ حشر میں پکار آیا   کہ اور بھی کوئی مجھ سا گنہگار آیا

گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار   شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی   نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی خاموش   کہو وہ تذکرۂ ناتمام کس کا تھا

کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے یہ کہا   "وہ چمکی برقِ تجلی وہ کوہِ طور آیا"

ضبط کر دردِ عشق کو اے دل   اس تری آہ آہ نے مارا

دل دے کے اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا / یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا
اے حشر امتیاز کہ ہم ہیں شہیدِ ناز / مُردوں کی طرح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا
دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں / تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کی ترکِ مے تو مائلِ پندار ہو گیا / میں توبہ کر کے اور گنہ گار ہو گیا
وہ فتنہ جس کا حشر پہ اٹھنا ہے منحصر / ہر بار تیری چال سے بیدار ہو گیا
اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے / اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

ستم ہی کرنا، جفا ہی کرنا، نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
لئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
مدار ہے ناصحو تمہی پر تمام اب اس کی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

زندہ عیسیٰ کا نام کرنا تھا / اس طرف بھی خرام کرنا تھا
تھی نہ تابِ سخن تو حضرتِ دل / عاشقی کو سلام کرنا تھا

اے اہلِ حشر چشمِ مروت کو کیا ہوا / کیوں دیکھتے نہیں مری صورت کو کیا ہوا
بے جستجو ملے گا نہ اے دل سراغِ دوست / تو کچھ تو قصد کر تری ہمت کو کیا ہوا
ٹھنڈا پڑا ہے داغِ دلِ داغدارِ عشق / اس آفتابِ حشر کی حدت کو کیا ہوا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا　　　تمام رات قیامت کا انتظار کیا
کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا　　　مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا
تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا　　　یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا
بھلا بھلا کے جتایا ہے اُن کو رازِ نہاں　　　چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا
ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا　　　مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا
وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے　　　ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

عرضِ وفا پہ دیکھنا اُس کی ادائے دلفریب　　　دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا
فتنۂ حشر کب اٹھا اُس کی ادائے ناز سے　　　وہ بھی پڑا ہے میری طرح راہ میں پائمال سا
پوچھتے کیا ہو کون تھا ہو نہ ہو وہی داغ تھا　　　در پہ تمہارے تھا مگر کوئی شکستہ حال سا

مرے سوال کے معنی وہ مجھ سے کہہ دیتے　　　مگر سوال کا میرے کوئی جواب نہ تھا
نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا　　　تمہاری برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف　　　ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

بے عشق کے جینا مجھے دم بھر بھی نہ ہوتا　　　سودا جو نہ ہوتا تو مرا سر بھی نہ ہوتا
ہے واسطے ہر کام کے اک روز مقرر　　　ہوتا جو نہ انصاف تو محشر بھی نہ ہوتا
آتا جو یہاں روزِ جزائے شبِ ہجراں　　　بڑھ کر تو کہاں تیرے برابر بھی نہ ہوتا
ظالم جو کہا اُس کو یہ ہے حسن کی خوبی　　　بہتر تو یہی تھا کہ وہ بہتر بھی نہ ہوتا

غارت گرِ ایماں تو ہے اے داغ یہ کافر
گر عشق نہ ہوتا کوئی کافر بھی نہ ہوتا

غالب

جب تک مرے گریے سے طوفاں نہ ہوا تھا — الفت میں کوئی کارنمایاں نہ ہوا تھا
شامت مری جو میں نے مسیحا انہیں جانا — آئی تھی اجل درد کا درماں نہ ہوا تھا
اس وعدہ فراموش کا اللہ رے تغافل — گویا نہ کیا تھا کبھی پیماں نہ ہوا تھا

تھی نہ تاب ستم تو حضرتِ دل — عاشقی کو سلام کرنا تھا

سب مجھے دیوانہ بنانے لگے — لو وہ تمہارا ہی کہا ہو گیا

تمہیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب — ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام — تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا — کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
آئی شوخی میں کہاں سے تسکیں — پڑ گیا صبر تمنائی کا
ضعف نے دل کو تڑپنے نہ دیا — ہو گیا نام شکیبائی کا

انداز کچھ بتانے لگا جورِ یار کا — اب لطف دیکھنا ستمِ روزگار کا
اٹھنا ہی اس کی بزم سے دشوار تھا مجھے — اس پر سنبھلتا دلِ بے اختیار کا
رہتی تھی اس کی یاد وہ راتیں کدھر گئیں — اب مجھ کو انتظار ہے اس انتظار کا
اے چشمِ یار دیکھ تغافل سے باز آ — دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

یاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا
کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا

ہم بوسہ لے کے اُن سے عجب چال کر گئے
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

اے داغ صدمۂ غمِ ہجراں بجا درست
یہ سب ہی سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

ہمیں زمانے میں بدنام تیری خو نے کیا
دل فریفتہ جو کچھ کیا سو تو نے کیا

غرور کیوں نہ ہو جب دل سی چیز ہاتھ لگے
بڑا دماغ تری زلفِ مشک بو نے کیا

کھلا میں اُن سے تو وہ اور داغ مجھ سے رُکے
خفا تو اُن کو مری شرحِ آرزو نے کیا

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج
یہ برقِ بلا دیکھئے گرتی ہے کدھر آج

وہ جاتے ہیں آتی ہے قیامت کی سحر آج
روتا ہے گلے مل کے دعاؤں سے اثر آج

پکارتی ہے خموشی مری فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل زباں کی طرح

کبھی تو صلح بھی ہو جائے رند و مستی میں
الٰہی شیخ بھی مے خوار ہو مغاں کی طرح

جلا کے داغ محبت نے دل کو خاک کیا
بہار آئی مرے باغ میں خزاں کی طرح

حیا نے روک لیا جذبِ دل نے کھینچ لیا
چلے وہ تیر کی صورت کھنچے کماں کی طرح

جھکی سی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی پڑتی ہے بیمارِ ناتواں کی طرح

یہ سدِ راہ ہوا کس کا پاسِ رسوائی
رُکے ہوئے ہیں مرے اشک کارواں کی طرح

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح

کچھ اُن سے کہنے کو بیٹھے تھے ہم کہ خلوت میں
رقیب آ ہی گیا مرگِ ناگہاں کی طرح

زبان خار ہوئی تھی ہماری وحشت سے
کہ چھالے پھوٹ گئے چشمِ خوں فشاں کی طرح

خدا قبول کرے داغ تم جو سوئے عدم
چلے ہو عشق بتاں لے کے ارمغاں کی طرح

وہی تو ہے شعلۂ تجلی کہ دشتِ ایمن سے تنگ ہو کر
جب اُس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر
وہ ہم ہیں مجنونِ دشت پیما جنوں کو ہونا ہے ہم سے سودا
کہ چشمِ آہو میں بیٹھی وحشت ہماری وحشت سے تنگ ہو کر
جھکی ذرا چشمِ جنگ جُو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو
وہ طریقہ تو بتا دو تمہیں چاہیں کیونکر

آئے وہ بے وفا یہاں اس کی بلا کو کیا غرض
جائے درِ قبول تک میری دُعا کو کیا غرض
اُس کی گلی سے آئے کیوں نکہتِ زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض
یہ تو مرا ہی کام ہے سجدے کروں تو میں کروں
کیوں ترے پاؤں پر گرے زلفِ رسا کو کیا غرض

ہے چارہ سازِ گلچیں گلہائے داغِ دل کا
شامت بہار کی ہے آئی جو اس چمن میں
یہ شوقِ خودنمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے
بے تاب مجھ کو لایا خلوت سے انجمن میں
یہ کیا کہ دل میں آؤ تو خاک میں ملاؤ
رونق ہو انجمن کی بیٹھو جس انجمن میں

دل کو بہلاؤں کہاں تک کہ بہلتا ہی نہیں
یہ تو بیمار سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں
چمنِ دہر میں یہ عاشقِ ناکام ترا
وہ شجر ہے کہ کبھی پھولتا پھلتا ہی نہیں

آغاز شوق میں نہیں انجام کی خبر — اس ابتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں
میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ — ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

اُن سے کہہ دی ہے آرزو دل کی — اب میری بات کا جواب کہاں

دل میں گھر یار کے پیکان کئے بیٹھے ہیں — مجھ پہ قبضہ مرے مہمان کئے بیٹھے ہیں
ایسی وحشت نہیں اپنی کہ ہو محتاج بہار — پہلے ہی چاک گریبان کئے بیٹھے ہیں

مے کشو مژدہ کہ گھنگھور گھٹائیں آئیں — تم پہ رحمت ہوئی توبہ پہ بلائیں آئیں
کس کی زلفیں مجھے یاد آئیں شب ہجراں میں — کہ بلائیں مری لینے کو بلائیں آئیں
ناز ہے انکو کرم پر کہ نہیں جس کا حساب — کس خطا وار کی گنتی میں خطائیں آئیں

ہم تری بزم سے اے یار چلے جاتے ہیں — بے چلے جاتے ہیں ناچار چلے جاتے ہیں
گرچہ سو سو ہیں تغافل کہ نہ جانے کوئی — ان نگاہوں کے مگر وار چلے جاتے ہیں
اس طرح جاتے ہیں اس بزم میں دل کے ہاتھوں — کہ بندھے جیسے گنہ گار چلے جاتے ہیں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں
اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر — جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں
تاثیر بچ کے سنگ حوادث سے آ تو گیا — میری دعا بھی ٹھوکریں کھاتی ہے راہ میں

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

ان کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالۂ دل
یہ تو کچھ بھی نہ ہوا یہ تو اثر کچھ بھی نہیں

کعبے جانا بھی تو بت خانے سے ہو کر زاہد
دور اس راہ سے اللہ کا گھر کچھ بھی نہیں

اک جفا تیری جو کچھ بھی نہیں تو سب کچھ ہے
اک وفا میری کہ سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

حشر میں دست جنوں سے نہ خجل ہوں اے داغ
کہ مرے پاس بجز دامن تر کچھ بھی نہیں

تاب نظارہ کسے دیکھے جو اُن کے جلوے
بجلیاں کوندتی ہیں جب سر بام آتے ہیں

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

دستِ وحشت کیلئے تار رگ جاں میں نہیں
ہاتھ اس تار میں اُلجھا جو گریباں میں نہیں

تیرے اقرار میں انکار تری ہاں میں نہیں
عہد میں عہد یہ پیماں کسی پیماں میں نہیں

مجھ کو حیرت کا گماں دل میں تمنا کا یقین
نالہ کہتا ہے کچھ اس خانۂ ویراں میں نہیں

جلوۂ ہوش رُبا دیکھ لیا اے موسےٰ
یاں تحیر میں وہ لذت ہے جو عرفاں میں نہیں

دیکھئے راہ میں ٹھوکر سے نہ کھل جائے گرہ
ایک فتنہ ہے یہ دل گوشۂ داماں میں نہیں

اُف رے جلوہ کہ نہیں اور نگہ شوق میں ہے
بل بے پردہ کہ وہ ہے اور دل حیراں میں نہیں

رنگِ گل، نغمۂ بلبل، اثرِ بادِ بہار
جب سے ہم قید ہوئے کوئی گلستاں میں نہیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

جس دن سے کچھ شریک ہوئی میری مشت خاک
اس روز سے زمیں پہ ستم آسماں کے ہیں

بات میری کبھی سنی ہی نہیں
جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے — کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں
دل لگی دل لگی نہیں ناصح — تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا — وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر نہ آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں
وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں — مگر انہیں تو کسی بات پر قیام نہیں

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں — اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
بھیجے دیتا ہے انہیں عشق متاعِ دل و جاں — ایک سرکار لٹی جاتی ہے سوغاتوں میں

میخوار کی نگاہ نے ہنگامِ مے کشی — نشتر چبھو دیا رگِ ابرِ بہار میں

چاک ہو پردۂ وحشت مجھے منظور نہیں — ورنہ یہ ہاتھ گریباں سے کچھ دور نہیں
دل کو ہوتی ہے خبر آپ کہیں یا نہ کہیں — ہم کو معلوم ہے وہ بات جو مشہور نہیں
لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا — دیکھ پچھتائے گا خاموش یہ دستور نہیں

بنا لیں شرم آلودہ نگاہیں — تغافل میں یہ ہوشیاری تو دیکھو
بنا روزِ جزا جس کی سزا کو — مری قدرِ گنہ گاری تو دیکھو

کھٹکا ہوا ہوں خارِ تمنا سے اس قدر — ڈرتا ہوں یاس سے بھی کہیں آرزو نہ ہو

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

کچھ آہ کے حوصلے نکلتے نیچا مگر آسماں بہت ہے

کچھ تازگی ہو لذّتِ آزار کے لئے ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے

کتنا باوضع ہے خیال اُس کا بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے
نا امیدی مٹائے جاتی ہے شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
ہمّت اے خاک ہاں مدد اے ضعف کوئی دامن بچائے جاتا ہے
اُس کا آنا تو در کنار اے داغ دل ہی قابو سے ہائے جاتا ہے

اس انجمن سے بہت بے وقار ہو کے چلے سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے
تری نگاہ بہت مست ہے، سنبھل کے ذرا سمندِ ناز و ادا پر سوار ہو کے چلے
کسی کی آنکھ میں وہ انتظار ہو کے رہے کسی کے دل سے شکیب و قرار ہو کے چلے

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
رہے گا ترا جلوہ مدِّ نظر جہاں تک ہماری نظر جائے گی
صبا اس گلی سے مری خاک کو جب آئے گی برباد کر جائے گی
دیا دل تو اے داغ اندیشہ کیا گزرنی جو ہو گی گزر جائے گی

ابھی نزاکتِ رفتارِ یار باقی ہے
ابھی زمانۂ ناپائیدار باقی ہے

خزاں ہے دیکھ کے وحشت سی چھا گئی دلبر
ابھی نظارۂ فصلِ بہار باقی ہے

وہ چشمِ زار کا سنتے ہی ماجرا گھبرائے
ابھی تو شرحِ دلِ بے قرار باقی ہے

جو یہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں خلش باقی
جو عشق ہے تو غمِ بے شمار باقی ہے

لگ چلی بادِ صبا کیا کسی مستانے سے
جھومتی آج چلی آتی ہے مے خانے سے

ایک چلو میں بہت داغ بہک اٹھتے تھے
آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے

اُسے افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے

شبِ وصال قیامت تھی جب کسی نے کہا
وہ دیکھ صبح نمودار ہوتی آتی ہے

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

طلب ہے چاہنے والوں سے امتحانوں کی
بُری بنی ہے خدا خیر کرے جانوں کی

خدا کرے ابھی اے باغباں گرے بجلی
ترے چمن کو لگے آگ آشیانوں کی

قدم قدم ہے تری چال کا نیا انداز
دگرنہ ایک روش ہے سب آسمانوں کی

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی
اے بتو! ایمانداری اٹھ گئی

بے طرح پھیلا ہے ان زلفوں کا جال
اب امیدِ رستگاری اٹھ گئی

دور میں اس چشمِ مستِ ناز کے
لذتِ پرہیزگاری اٹھ گئی

کس سے رکھئے داغ چشمِ دوستی
اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

رُوح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

وہی وحشت ہے وہی خار وہی ویرانہ
وحشت کس بات میں اچھا مرے کاشانے سے

شوخی میں اُن کی چھیڑ ہے کچھ اضطراب کی
گھر کر گئی وفا کسی خانہ خراب کی

اس رُوئے بے نقاب کا جلوہ ہوا نقاب
نکلی ہے رنگ رنگ سے صورت حجاب کی

تم اور آرزو مرے ملنے کی روزِ حشر
میں اور گفتگو ستمِ بے حساب کی

اے اشک ڈوب مر تری تاثیر دیکھ لی
اُلٹی ہنسی اڑی مری چشمِ پُر آب کی

در پردہ جوشِ حُسن نے بے پردہ کر دیا
ٹوٹی گرہ تڑاق سے بندِ نقاب کی

اے دل کمی کرے نہ کہیں طولِ مدّعا
لینی ہے کل خبر مجھے روزِ حساب کی

خوب ہی چلتی ہوئی وہ نرگسِ مستانہ ہے
آشنا سے آشنا بے گانہ سے بے گانہ ہے

پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزشِ مستانہ ہے

نگہ شوق بے اثر نہ ہوئی
تم کو پردے میں کب نظر نہ ہوئی

حال وہ کیا جو حشر میں نہ کہا
بات وہ کیا جو وقت پہ نہ ہوئی

اے قیس! گر صبا نے اڑایا تو لطف کیا
اٹھا نہ پردہ صاحبِ محمل کے ہاتھ سے

تمہی چہرے سے نقاب اپنے اٹھا دو ورنہ
نگہ شوق کو بھی رخنہ گری آتی ہے

یار کا پاسِ نزاکت دلِ ناشاد رہے ۔۔۔ نالہ رُکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے

تم نے اے داغ محبت سے کیا ہے انکار ۔۔۔ یہ سخن یاد رہے، یاد رہے، یاد رہے

شوق میں ایک فتنۂ قامت کے ۔۔۔ ہم گلے مل گئے قیامت کے

آئی تیشے سے یہ صدا پیہم ۔۔۔ کوہکن کام ہیں یہ فرصت کے

وہ نزاکت سے تھم گئے چل کر ۔۔۔ تو قدم گڑ گئے قیامت کے

کیا تھا جرمِ وفا لذتِ سزا کے لئے ۔۔۔ ستم کے لطف اٹھائے مزے جفا کیلئے

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ ۔۔۔ وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی ۔۔۔ عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ۔۔۔ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

کیا جدائی کا اثر ہے کہ شبِ تنہائی ۔۔۔ میری تصویر سے ملتی نہیں صورت میری

وہ دبے پاؤں چلیں حشر کے ڈر سے توبہ ۔۔۔ فکر ہے چال اڑا لے نہ قیامت میری

کون سا لب ہے کہ جس پر نہیں شکوہ تیرا ۔۔۔ کون سا دل ہے کہ جس میں نہیں حسرت میری

صنم کدے کے ہوئے ہم نہ میکدے کے ہوئے ۔۔۔ یہ داغ دل پہ مسلمان لے کے جائیں گے

ہمیں یہ فکر کہ دل سوچ کر سمجھ کر دیں ۔۔۔ انہیں یہ ضد کہ اسی آن لے کے جائیں گے

آشفتگی کسی کی اثر کچھ تو کر گئی ۔۔۔ بن بن کے رخ پہ زلف تمہارے بکھر گئی

وقتِ نظارہ کی کششِ حسن نے کمی ۔۔۔ آنکھوں کو لے کے ساتھ نہ میری نظر گئی

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے — بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
ترا وہ حسن ہے اے شعلہ رُو جو تو چاہے — بغیر شمع کے پروانہ انجمن میں رہے
زبان دے نہ عدو کو کہ یہ تو وہ شے ہے — ترے دہن میں رہے یا مرے دہن میں رہے

فتنہ گر آنکھ تھی وہ زلفِ دوتا اور ہوئی — یہ وبالِ دل و جاں ایک بلا اور ہوئی
عاشقوں کا بھی وہ اندازِ طبیعت نہ رہا — پہلے کچھ اور تھی اب رسمِ وفا اور ہوئی

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جائیے — اللہ تیری شان کے قربان جائیے

کب تک کھنچے رہو گے کب تک تنی رہے گی — کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی
لوٹیں گی وہ نگاہیں ہر کاروانِ دل کو — جب تک چلے گا رستہ یہ رہزنی رہے گی

ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک — کہ اس میں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی — بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
سنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو — وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے
مجھے یاد کرنے سے یہ مُدّعا تھا — نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

دل جو ناکام ہوا جاتا ہے — شوق کا کام ہوا جاتا ہے
آج کل کثرتِ عشاق سے عشق — شیوۂ عام ہوا جاتا ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور　　کیا چیز حرام ہو گئی ہے

میر مظفر علی خاں اسیر لکھنوی

رونقِ گلشن جو وہ رندِ شرابی ہو گیا　　پھول ساغر بن گیا غنچہ گلابی ہو گیا

نکہت گل سے چمکتا ہے سوا رنگِ جنوں　　کوئی مجھ سا بھی نہ آمادۂ سودا ہوگا

گریباں قیس کا پھاڑا تو کیا اے پنجۂ وحشت　　جو ہمت ہو تو پردہ چاک کر لیلیٰ کے محمل کا

مسجد سے نکل کر میں رہِ بت کدہ بھولا　　تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

ہوا جو خاک بدن ساغرِ شراب بنا　　ہزار شکر کہ ذرّے سے آفتاب بنا

گرا جو ہاتھ سے جام اختیار کیا ساقی　　تجھے ملال مجھے انفعال ہونا تھا
دعا وصالِ صنم کی ضرور کی اے دل　　خدا سے طالبِ امرِ محال ہونا تھا

اس رُخ کی تازگی ہے گلِ تازۂ بہار　　ہر تارِ زلف رشتۂ شیرازۂ بہار
ہر داغِ سینہ لالۂ گلزارِ فیض ہے　　پاتے ہیں چاک جیب میں اندازۂ بہار

زمانے کی ہے یہ طاقت کہ کوئی دم ٹھہرے　　پھرا رہی ہے یہ تیری نگاہ کی گردش

جب سے بلند نالۂ سوزاں مرا ہوا　　　کرتی ہے برق اپنے گریباں کی احتیاط
دل سے فزوں ہے خاطرِ دلبر مجھے اثیر　　　ہے جان سے سوا غمِ جاناں کی احتیاط

پہنچی ہے تیری زلفِ رسا بڑھ کے قدم تک　　　ہیں خاک نشیں ہم بھی ضرور اُٹھے گی ہم تک
داغِ دلِ سوزاں سے ہوں میں شمعِ شبستاں　　　ہے گرمیِ ہنگامۂ محفل مرے دم تک

وہ گلعذار جو گلزار میں نہیں آیا　　　جما ہے دیدۂ نرگس میں انتظار کا رنگ

نبضِ بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی　　　آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی
خندۂ گل ہے کہیں نالۂ بلبل ہے کہیں　　　سیر اس گلشنِ ایجاد میں کیا کیا دیکھی

آج ساقی ہیں نہیں گو کہ مروّت باقی　　　خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی
رات صیّاد کو کیا کیا نہ سنائے قصّے　　　نہ رہی کوئی گلستاں کی حکایت باقی

غنچہ ساں سامنے اس گل کے رہے ہم خاموش　　　سو زبانیں تھیں مگر طاقتِ گفتار نہ تھی

دخلِ اغیار نہیں بزمِ گل و بلبل میں　　　پاؤں کچھ سوچ کے اے بادِ بہاری رکھنا

شیشہ ہاتھ آیا نہ ہم نے کوئی ساغر پایا　　　ساقیا اے تری محفل سے چلے بھر پایا

باغ میں پھول کھلے موسمِ سودا آیا　　　گرم بازار ہوا وقتِ تماشا آیا

ساربان ناقۂ لیلیٰ کو نہ دوڑا اتنا — پاؤں مجنوں کے تھکے ہاتھ نہ مرے کیا آیا

کیا کبھی جلوہ گہہ ناز تمہارا تھا چمن — گل جو ہنس پڑتے ہیں یہ رنگِ اثر کس کا ہے

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا — ہزاروں اٹھ گئے کثرت وہی باقی ہے محفل کی

گلشنِ دہر میں پھر فصلِ بہار آئی ہے — مغ بچے شاد ہیں سب میکدے آباد ہیں سب
قابلِ صحبتِ خوباں تو نہیں ہوں لیکن — ربط کے جتنے ہیں انداز مجھے یاد ہیں سب

پیدا ہوئی ہے داغِ جنوں میں نئی چمک — شاید قریب فصل پھر آئی بہار کی

چلی ہزار ہوا لاکھ آندھیاں آئیں — تری گلی سے مری خاکِ ناتواں نہ اٹھی

حنا وہ ملتے ہیں اتنا کوئی نہیں کہتا — کہ خونِ عاشقِ شیدا حضور ہوتا ہے

رونے سے مرے اس گل خوبی کو خبر ہے — صد شکر کہ اشکوں میں ابھی رنگِ اثر ہے

شمیمِ گل میں جو بلبوس یار کی ہوتی — ہوا کچھ اور نسیمِ بہار کی ہوتی

منشی امیر احمد امیر مینائی

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل — کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا
دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

بہار آئی ہے اے دستِ جنوں یا عید آئی ہے
گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا

گردشِ بخت کہاں سے ہمیں لائی ہے کہاں
منزلوں وادیٔ غربت سے وطن دور رہا
جلوۂ برقِ تجلّی نظر آیا نہ کبھی
مدتوں جا کے میں زیرِ شجرِ طور رہا
ہم بھی موجود تھے کل محفلِ جاناں میں امیر
رات کو دیر تلک آپ کا مذکور رہا

پکارتا ہے یہ ناز اُس کی کبریائی کا
کہ لے اڑا ہے مجھے شوق خودنمائی کا
عزیز کیوں نہ ہو داغ اُس کی بیوفائی کا
کہ ہے صلہ یہی مدّت کی آشنائی کا
مرے نصیب یہ کہتے ہیں میرے نالوں سے
"رہے خیال ہماری بھی نارسائی کا"
شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا
اٹھو امیر نہیں ماننے کی وحشتِ دل
یہ عذرِ لنگ تمہاری شکستہ پائی کا

جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت
گرا جو آنکھ سے آنسو دُرِ یگانہ ہوا

انصاف جو رِ یار خدا سے طلب کیا
تم نے بھی اے امیر بڑا ہی غضب کیا

بات رکھ لی مری قاتل نے گنہ گاروں میں
اس گناہ پر مجھے مارا کہ گنہ گار نہ تھا

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

جب آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھا سحر کو سنسان سب سرا تھی
ہوا نہ ہمراہیوں سے اتنا کہ ساتھ لیتے مجھے جگا کر
ہو بزمِ جاناں میں حشر برپا تڑپ کا دل کے تھا یہ تقاضا
مگر بڑی مشکلوں سے روکا ادب نے زانو دبا دبا کر

بہارِ لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھیں گے
چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہِ واپسیں ہو کر

کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ
وگرنہ ربط کی اس کے ہزار راہیں تھیں
فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ
جہاں بنے ہیں یہ مے خانے خانقاہیں تھیں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں
پر کیا کریں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل
آئی صدا یہی تو مقام امتحاں کے ہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں، نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ اُنہی کی زباں کے ہیں

پردے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بپا
اے آفتابِ حشر نمودار بھی تو ہو
زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

کھاتے ہو قسم نہیں ہیں عاشق
صورت تو امیر اپنی دیکھو

ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود — جبیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے
امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے — پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

پھولوں میں اگر ہے بُو تمہاری — کانٹوں میں بھی ہوگی خُو تمہاری
اس دل پہ ہزار جان صدقے — جس دل میں ہے آرزو تمہاری

ہم اور معرکۂ امتحاں سے ٹل جاتے — جواب پاؤں جو دیتے تو سر کے بل جاتے

تیغِ قاتل پہ ادا لوٹ گئی — رقصِ بسمل پہ قضا لوٹ گئی
پس گیا چشمِ سیہ پر سُرمہ — پائے رنگیں پہ حنا لوٹ گئی
اس روش سے وہ چلے گلشن میں — بچھ گئے پھول صبا لوٹ گئی

دمِ اخیر ہے لازم نظارہ کر لینا — خدا سے کام پڑا ہے بتو خبر لینا
امیرؔ جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو — ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

غیروں سے کبھی ہے کبھی مجھ سے ہے لگاوٹ — بہکی ہوئی پھرتی ہے محبت کی نظر آج
کس لطف سے جھنجھلا کے وہ کہتے ہیں شبِ وصل — ظالم تری آنکھوں سے گئی نیند کدھر آج
مانگی ہے دُعا کس نے الٰہی کہ کھلا ہے — آغوشِ تمنا کی طرح بابِ اثر آج

اپنی گردش پہ بہت ہے تجھے اے چرخِ گھمنڈ — جب میں جانوں کہ شبِ غم کی سحر پیدا کر

اُسے دیکھا تصدق کر دیا دل — کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل
امیرؔ اس ناز سے ظالم نے دیکھا — نگاہیں بول اٹھیں وہ لے لیا دل

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — مشعل دکھائی برق تجلی نے راہ میں
اندھیر کر رہی ہے یہ چشم سیاہ میں — شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشانِ سر مزار ہوں میں
پھر اس کی شان کریمی کے حوصلے دیکھے — گنہگار یہ کہہ دے گناہ گار ہوں میں
وہ مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے — پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں
وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری — قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

شوخی بھی قیامت تری مستانہ ادا میں — فتنوں نے قدم چوم لئے لغزش پا میں
مشکل ہے مسیحا کو بھی اب جان بچانا — نکلی ہے قضا چھپ کے حسینوں کی ادا میں

خالق ہی جب نہ دے تو گلا آسماں سے کیا — ساقی نہ منہ لگائے تو ساغر سے کیا کہیں

جب خوب رو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں — کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں
اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

کیا قدر ہے فسانۂ فرقت کی یاں امیرؔ — کہتے ہیں ہم سنیں نہ سنیں تم کہا کرو

داغ افسردہ ہو چلے دل کے — جھلملائے چراغ محفل کے
دل میں آ کر نہ دل سے تم نکلے — تم تو ارمان بن گئے دل کے
اس کی رحمت سے لو لگا کہ امیرؔ — آڑے آئے گی وقت مشکل کے

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی — ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی
وصل کی شب واہ ری بے تابیٔ شوقِ وصال — شرم بھی نیچی نگاہوں سے تماشائی ہوئی

بال کھولے جو یار آتا ہے — گھر کے ابرِ بہار آتا ہے
دردِ دل میں مری تسلّی کو — گریۂ بے اختیار آتا ہے
تم کو آتا ہے پیار پر غصّہ — مجھ کو غصّے پہ پیار آتا ہے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے — لوٹتی ہیں بجلیاں اُن کے لئے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی — بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے
وصل کا دن اور اتنا مختصر — دن گنے جاتے تھے اس دن کیلئے

آنکھ اس کو کھولنی بھی دشوار ہو گئی ہے — چلتے چمن میں نرگس بیمار ہو گئی ہے
انگور میں تھی یہ مے پانی کی چند بوندیں — جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

عشق نے زور دکھایا تھا امیرؔ — کوہکن کوہ کنی کیا کرتا

ہے آج جو سرگزشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

شورِ محشر امیر کو نہ جگا — سو گیا ہے غریب سونے دے

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگزشت کون سنے

ہم بتوں سے امیدوارِ کرم — کارخانے ہیں اس کی قدرت کے

چھپتا ہے دل کا رنگ کہیں ضبط آہ سے — حسرت ٹپک رہی ہے ہماری نگاہ سے

ہاتھ رکھ کر مرے سینے پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ — اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پُرخم نے اس کے پیچ — کچھ رہ گئے تو میرے مقدر میں رہ گئے

تم دکھاتے تو ہو امیر کا دل — اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

خانقاہوں میں جو یہ پھرتی ہے بہکی بہکی — توبہ بھی پی کے مگر نکلی ہے میخانے سے

نہ مست ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے — حجاب کس سے اب اے چشمِ یار باقی ہے

صبا ان منہ بندھی کلیوں نے شب کو کس کی چوری کی — کہ تو نے صبح کو ایک ایک کی پنجی ٹٹولی ہے

عجب رسائی قسمت ہے اے حنا تیری — چمن جو چھوٹ گیا دستِ نازنیں میں رہی

حیات بخش رسؔا بلند شہری

خواب میں بھی تو نظر بھر کے نہ دیکھا اُن کو — یہ بھی آدابِ محبّت کو گوارا نہ ہوا

محوِ حیرت ہیں تو دونوں ہیں تری محفل میں — ہم سے پردا ہوا آئینے سے پردا نہ ہوا

ساقی ہمارے صبر کی ہے شرم تیرے ہاتھ — بیٹھے ہیں دُور ساغر و جام و سبو سے ہم

میں سوالِ وصل کر کے اس ادا پر مٹ گیا — ہنس کے فرمایا کہ یہ درخواست نامنظور ہے

خواجہ الطاف حسین حالؔی

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں — تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا
ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائیگا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا

مے تند ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائیگا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اسی کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

ہر سمت گردِ ناقہ لیلےٰ بلند ہے
پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ تری کاکلِ پیچاں میں نہیں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

حالیؔ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں سے
نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں سے

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے — جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالیؔ — سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وفا اغیار کی اغیار سے سُن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری — کمندِ گیسوے خم دار سے پوچھ

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یاں کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ — یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

دُور ہو اے دلِ مآل اندیش — کھو دیا زیست کا مزا تو نے
رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے
خوش ہے امیدِ خلد پر حالیؔ — کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حقِ وفا کا جو ہم جتانے لگے — آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

لاگ ہیں ہیں لگاؤ کی باتیں — صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

بے وفا کون سی خوبی ہے نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں ایک وفا اور سہی

ترکِ دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترکِ ریا اور سہی

مدرسے میں نہ ملا کچھ تو نہ توڑ آس اے دل
اک درِ دولتِ ساقی پہ صدا اور سہی

سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی

جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

جفائے یار کا دل کو ملال آ ہی گیا
ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

ذرا سی ٹھیس بھی شیشے کو تھی بہت ساقی
ہزار تو نے بچایا تھا بال آ ہی گیا

بوسۂ سنگِ آستاں مل نہ سکا ہزار حیف
آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمتِ سرفراز کا

پیرِ مغاں کے معجزے دیکھ چکے ہو واعظو
تم نہ پیو جو مے تو خیر حکم تو دو جواز کا

آئے اگر عروسِ دہر جلوں کے میکدے میں اب
کہہ دو یہ صومعہ نہیں زاہدِ پاک باز کا

غضب نگاہ نے ساقی کے بندوبست کیا
شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

کوئی خفا ہو تو ہو امرِ حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

اُن کی نگاہِ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا

ترکِ امید بھی مری آنکھوں میں ہے امید — اے یاس حوصلہ نہ رہا امتیاز کا
مطلب نکال لے یہ کہاں آہ کی مجال — اس کا تو کام ہے فقط افشائے راز کا

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شادؔ تحمل ہو نہ سکا
اک ٹھیس لگی تھی یوں ہی سی کیا جلد یہ شیشہ ٹوٹ گیا

آکے زنجیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون — کس کے دل میں ہے ادب آپ کے دیوانے کا
خود پہنچ کر چلنا ہے جو اے پائے طلب — واں کوئی ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا

نرگسِ پُرخمارِ یار کرتی ہے کام زہر کا — بادۂ خوش رنگ لادیں گھول دیا کسی نے سم

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اے شوق پتہ کچھ تو ہی بتا اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھلا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

میں اور سیرِ لالۂ و گل ہجرِ یار میں   کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں فقط ہیں دو نام
یہ اگر سچ ہے تو کب اُن کے برابر ہم ہیں
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
یہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

ہوں گی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگ ہنسائیاں
دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں
فصلِ خزاں ہے بد بلا اس سے خدا پناہ دے
منہ پہ صبا کے بھی گلو چھٹنے لگیں ہوائیاں
حشر میں رند تھے خموش صحبتِ مے سے چھوٹ کر
پیرِ مغاں کو دیکھ کر دینے لگے دہائیاں

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبّت کہاں رہے گی
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تنکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیّاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی
ہزار کھینچ کر جدا ہو مجھ سے ہزار دُوری ہو میرے تیرے

جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے ترے درمیاں رہے گی
ہزار نقش قدم مٹا کر، زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں اُن کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی
بہت سے بھولیں گے غنچہ و گل یہی تو اس باغ کی روش ہے
چڑھائے جائیں گے آگ پر جو انہیں کی خوشبو عیاں رہے گی

تصور اس کا رکھو دل میں جو ہے دیدار کا جویا — لگائے منہ جو آئینے کو آئینہ اسی کا ہے
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

نگاہباں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز اُن کے — کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز اُن کے
تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے — اخیر وقت جو آیا چھپے نہ راز اُن کے
نظر اٹھانے ہی میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر — جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز اُن کے

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا
تادیب خموشی نے تیری تاثیر دکھائی مستوں کو
بے باک جو مے کش تھا ساقی اس بزم سے وہ محجوب گیا

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے آگاہ — اِدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
نہیں اٹھتے قدم کیوں جانب دیر — کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم ۔۔۔ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

سیّد اکبر حسین اکبرؔ الہ آبادی

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو ۔۔۔ سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام ۔۔۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی ۔۔۔ وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

بڑھنے تو ذرا دو اثرِ جذبۂ دل کو ۔۔۔ قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمہارا

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے ۔۔۔ اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

اگر ہو ذوقِ سجود پیدا ستارہ ہو اوجِ پر جبیں کا
نشانِ سجدہ زمین پر ہو تو فخر ہے وہ رُخِ زمیں کا
صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

نہ سحرِ چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزۂ ساقی ۔۔۔ تو پھر صحنِ چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل

یاد اُن کی ہے بہت عزلت پسند ۔۔۔ آہ بھی دل سے نکالی جائے گی
بے تکلف چاہیے سوز و گداز ۔۔۔ شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائیگی

غیر کے ذکر میں کرتے نہیں میرا وہ لحاظ — تذکرے آتے ہیں اور نام بنام آتے ہیں

کم بخت دل کو کیوں ہے لگاوٹ انہیں کے ساتھ — اُن کو تو شوق ناز و ادا سب کے ساتھ ہے

دل کو آماجگہ تیر قضا کرتی ہے — حسن کا حق وہ نظر خوب ادا کرتی ہے

بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں — کوئی گذری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

محمد ہادی عزیز لکھنوی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا — یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

ہے اُن کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں — کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

آئینہ چھوڑ کے دیکھا کئے صورت تیری — دل مضطر نے مرے اُن کو سنورنے نہ دیا
اُٹھ گیا انجمن ناز سے گھبرا کے کوئی — دردِ دل اپنا مجھے ختم بھی کرنے نہ دیا
تہ میں دریائے محبت کے تھی کیا چیز عزیز — جو کوئی ڈوب گیا اُس کو اُبھرنے نہ دیا

بتلا رہی تھی اہل محبت کی جستجو — جتنا کہ وہ قریب تھا اتنا ہی دور تھا

عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں — مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے — تیرے ہر انداز کو چھپ چھپ کر کوئی دیکھا کیا

ہجوم شوق کا بس قصہ مختصر یہ ہے — کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

یہ تیری آرزو میں بڑھی وسعتِ نظر — دنیا ہے سب مری نگہ انتظار میں

اے بے دلی نہ یوں کسی بے کس کی آس توڑ — دنیائے شوق ہے دلِ امید وار میں

چارہ گر چپ ہیں کیوں علاج کریں — کچھ تو اپنے کئے کی لاج کریں

کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع — رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

ہاں نہ چھیڑو اے طلب گارانِ سامانِ نشاط — ہم یوں ہی اپنے تصوّر سے بہلتے جائیں گے
خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہہ کر لکھا — ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

بیخودی کو جو جاناں میں لئے جاتی ہے — دیکھئے کون مجھے میری خبر دیتا ہے

حسن میں اور عشق میں گر ہے تو مشکل ایک ہے — اُس طرف ساری خدائی ہے ادھر دل ایک ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں پیدا ہو گیا — جب مرے شکوے انہیں کچھ کچھ مزا دینے لگے

دل تابعِ کشش تھا، کشش تابعِ جمال
ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

آزادگانِ عشق کی گستاخیاں تو دیکھ
خود داد مانگتے ہیں تجھی سے گناہ کی

مانا کہ بزمِ حسن کے آداب ہیں بہت
جب دل پہ اختیار نہ ہو کیا کرے کوئی

یہ خزاں کی فصل کیا ہے فقط اُن کی چشم پوشی
وہ نقاب اگر الٹ دیں تو ابھی بہار آئے

ترے وعدے کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں
وہ حریص زندگی ہے جسے اعتبار آئے

مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی

بلائیں لے رہا ہوں ان زمیں کے ذرے ذرے کی
لٹا تھا جس جگہ راہِ وفا میں کارواں میرا

وفورِ شوق میں اک اک قدم پر اک قیامت تھا
خدا معلوم کیونکر جلوہ زارِ حسن تک پہنچا

تیرِ نظر سے خود بخود بندِ نقاب کھل گئے
حوصلہ چشمِ شوق کا ہم نے انہیں دکھا دیا

نشے میں عشق کے دلِ دیوانہ چھٹ گیا
چشم و چراغِ خلوتِ جانانہ چھٹ گیا

اے محتسب خدا کے لئے اپنی راہ لے
گویا ترے چھڑانے سے میخانہ چھٹ گیا

دیوانگی کی وضع میں سیرِ چمن بھی ہے
محشر گناہ کیا ہے جو ویرانہ چھٹ گیا

ہم بھی بیٹھے ہیں دماغ و دل کو آمادہ کئے
جب یہ شہرت ہوئی کھلنے کو ہیں گیسوئے دوست

ہزاروں مر گئے مجنوں کے ایسے دیوانے — مگر ملی نہ کسی کو بھی انتہائے بہار

یہی یہ پھول ہیں جن کو ابھی دیکھا تھا گلشن میں — مگر کچھ اور ہی شے ہو گئے گلچیں کے دامن میں

لازم ہے پائے شوق کو پاس ادب ضرور — محشر یہ کوئے یار ہے دیر و حرم نہیں

دے کے ساغر مجھے کس لطف سے ساقی نے کہا — دیکھتے جاؤ ابھی ہم تمہیں کیا دیتے ہیں

جہاں تک بس چلا شمع فغاں روکی گئی فرقت میں — ذرا سی بات پر بدنام تمام عاشقی کیوں ہو؟

زخم نگہ ناز وہ دیکھیں گے نہ دیکھیں — کیا داد نہ دیں گے مجھے ارباب نظر بھی

ہجوم یاس جو دم بھر کو دل سے ہٹ جائے — تو لب تک آنے کو حرف دعا کو راہ ملے
میں اپنی تار نظر کی بنا رہا ہوں نقاب — یہ مدعا ہے مجھی سے تری نگاہ ملے

مذاق بے محل ہے وحشیوں میں برہمی ہو گی — ہنسی رو کے رہیں چاک گریباں دیکھنے والے

کمال بخیہ گر زور جنوں پر خندہ زن ہوگا — الٰہی آبرو رکھنا ہے چاک گریباں کی

ریاض احمد ریاض خیرآبادی

پھول ہے لالۂ صحرائی کا — یا کلیجہ ترے سودائی کا

ملی نجات قفس میں چمن کے دھڑکوں سے — نہ مڑ کے ہم نے کبھی سوئے آشیاں دیکھا
بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم — لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

ہم نے دیکھے ہیں مقامات تجلی اُن کے — طور کہتے ہیں کسے وادیِ ایمن کیسا؟

نہ رو کے طور تو ہم جائیں عرش سے اُونچے — ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا

دے خدا عقل تو دیوانہ بنے — کہ جنوں کام ہے دانائی کا

آنکھوں میں شرارت ہے کہ رو کے نہیں رکتی — شوخی ہے کہ بے چین ہے آغوشِ حیا میں

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے میں ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

پہلے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا — دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

بے بال و پر بھی آج قفس لے کے اڑ گئے — کس نے اڑائی آمدِ فصلِ بہار کی
یہ شوخیاں نہیں ہیں تری اے نگاہِ شوخ — یہ بے قراریاں ہیں دلِ بے قرار کی

محفلِ مے میں ہیں زاہد کے فرشتے بھی شریک — یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے — شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں میخانوں کے
ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آتی ہے بہار
وہ تو وہ رنگ بدل جاتے ہیں زندانوں کے

شیخ جی گر گئے تھے حوض میں میخانے کے
ڈوب کر چشمۂ کوثر کے کنارے نکلے

نکال دوں گا شبِ وصل بل نزاکت کے
ڈرا لیا ہے بہت تیوریاں چڑھا کے مجھے

تمنائیں بہت ہیں وقت کم ہے
کسے دیکھوں نگاہِ واپسیں سے

اُٹھے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

رضا علی وحشتؔ

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موجِ دریا تھی
تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شورِ محشر تھا

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خبر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

میں سادہ لوح واقفِ رسمِ بتاں نہ تھا
اقرارِ عشق کر کے گنہ گار ہو گیا

بنے گا ذوقِ عطا خود اس کا محرّکِ آشنا نوازی
طلب کی خاطر دراز کرنا ضرور کیا دستِ آرزو کا

دل وجگر خون کر رہی ہے سرور و عشرت کی ناتمامی
شراب خانے میں تیرے ساقی ہے کام کیا ساغر و سبو کا

نہیں پائمالیٔ عاشقاں بجز اک نظر کا معاملہ
ترے اختیار کی بات ہے جو کرے یہ کام مگر نہ کر

حالِ چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
اپنا جو حال ہو گیا رنگِ بہار دیکھ کر

اے کمالِ شوق تیری ناتمامی کب کہوں
واں حیا آتی ہے اس کو اور شرماتا ہوں میں

کسی کا گوشۂ ابرو ہے شائد مائلِ جنبش
کہ اپنے کام جو مشکل تھے آساں ہوتے جاتے ہیں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں
ترے آشفتہ سر ایسے تبھی ہیں رسوائی
کہ دل و دیں کے لئے زلف کا سودا نہ کریں

مطلب ہے سیرِ باغ سے افزائشِ جنوں
ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیمِ بہار میں
وحشت نہ پوچھ مستیٔ جیب و جنونِ دست
وحشت کے گل کھلائیے جوشِ بہار میں

تلخی کشِ نومیدیٔ دیدار بہت ہیں
اس نرگسِ بیمار کے بیمار بہت ہیں
عالم پہ ہے چھایا ہوا اک یاس کا عالم
یعنی کہ تمنّا کے گرفتار بہت ہیں

کہوں کیا سجدہ ہائے شوق کی ہنگامہ آرائی
وہ طوفاں یاد ہے اب تک زمینِ کوئے جاناں کو

کیوں مجھ کو زخود رفتہ کیے دیتی ہے یارب
وہ بوئے دل آویز کہ ہمدوشِ صبا ہے

اتنا بھی نہیں یاد کہ ہے کس کی مجھے یاد
اے بیخودیِ شوق یہ کیا رنگ ترا ہے

دیکھ کر مجھ کو جو وہ حال مرا جان گئے
جی کے ارمان دلِ بیتاب کے قربان گئے

شوخیِ عشق کہ ہم ہو گئے رسوائے جہاں
خوبیِ حسن کہ سب آپ کو پہچان گئے

تا بہ گفتار تمنّا کا پہنچنا معلوم
ہم ترے جورِ تغافل کی روش جان گئے

اک آن میں وہ کچھ ہیں تو اک آن میں کچھ ہیں
کروٹ مری تقدیر بدلتی ہی رہے گی

ظالم کی تو عادت ہے ستاتا ہی رہے گا
اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہے گی

اک قیامت کا سماں آگے ترے کوچے میں تھا
اب وہی ہنگامۂ محشر تری محفل میں ہے

کیا کیا بگڑ رہے ہیں وہ اہلِ نظارہ پر
تقریب ہے کشودنِ بندِ نقاب کی

فارغ ہوئے مطالعۂ گلستاں سے ہم
اب شرح لکھ رہے ہیں محبت کے باب کی

بہارِ گل متقاضی ہے خونِ بلبل کی
کہ یہ بھی چاہیے رنگینیِ چمن کے لئے

گئے وہ دن جب کہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہشِ رنگ و بو کریں گے

جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان سے تھی چشمِ رازداری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کریں گے

اس انجمن میں کہ چشمِ ساقی کفیل ہو عیشِ زندگی کی
وہ بادہ خواری میں خام ہوں گے جو فکرِ جام و سبو کریں گے

ترے پھر کے آتے آتے کہیں یہ نہ ہو کہ قاصد — مری جان پر بنا دے مرے دل کی ناصبوری

غالب آئی فراموشی اُس کی — وعدہ تڑپا کیا وفا کے لئے
جستجو ننگِ آرزو نکلی — درد رسوا ہوا دوا کے لئے

مرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش لکھنوی

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمہیں نیرنگِ عشق کا قصہ — تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

میری قضا تھی برقِ تجلی کا کیا قصور — بدنام مفت جلوۂ جانانہ ہو گیا
وارفتہ زلف کا نہیں پابند فصل گل — جب دل میں لہر آ گئی دیوانہ ہو گیا
زادِ حیات دے نہ سکا قصۂ دل کا ساتھ — اس در پہ جاتے جاتے میں افسانہ ہو گیا

بزمِ رنگیں میں تری ذکرِ غم آیا تو سہی — خوش رہے چھیڑنے والا مرے افسانے کا

بس اے فلک نشاطِ دل کا انتقام ہو گیا — ہنسا تھا جس قدر کبھی زیادہ اس سے رو چکا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہلِ دہر کو
بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا

نہ دم لے اے سرشکِ غم تجھے قسم ہے عشق کی
فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا

رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں
مزاجِ حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا

یہ آشیانۂ ستم اچمن میں ہو تو خوب ہے
یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احساں تری آئی ہوئی انگڑائی کا

سلسلہ ذکرِ جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں
ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا

سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر
رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے
ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ تھا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر
یہ مری ہمتِ عالی کو گوارا نہ ہوا

جمالِ شمع کسی کو، کسی کو جلوۂ گل
وہ ایک میں ہوں جسے کوئی خوں بہا نہ ملا

ترے ہوتے گل و گلشن کو میں دیکھوں توبہ
ابھی ایسی تو نہیں قوتِ تسخیرِ بہار
میں تو میں، گل بھی تو ہیں جامہ دری میں مشغول
سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیرِ بہار

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر
ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دلِ صد چاک پر

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

بیانِ برقِ تجلی چھڑا ہے اب سرِ طور
عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

لہو تھا تمنّا کا آنسو نہیں تھے
بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نشیمن نہ جلتا، نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لے
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

مرا رونا شبِ فرقت تماشا گاہ انجم ہے
مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفاں دیکھنے والے
کہے جا بندھ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں
مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

بہت سی عمر مٹ کر جسے بنایا تھا
مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
بلا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے
وہ نیکیاں نہیں اچھی جو ہوں بدی کے لئے

شوقِ بہارِ باغ میں تنکے چنے تو ہیں
دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے
غربت میں راہ کٹتی ہے ثاقب مرے سبب
قصہ سمجھ رہا ہے میرا ہم سفر مجھے

یادگارِ دہر ہے یہ خود فراموشی مری
آپ کو بھولا ہوں اوروں کا فسانہ یاد ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں اے دردِ دل
بوجھ میرا ہے مگر سارے جہاں پر بار ہے

آئینہ اُن کو دکھایا جو خود آرائی نے
ہاتھ رکھا مری آنکھوں پہ شکیبائی نے
طور پر تاب رہی یا نہ رہی خیر مگر
کچھ تو دکھلا ہی دیا ذوقِ تمنائی نے

بے فشانہ اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے
میں دیکھتا ہوں خواب پریشاں کبھی کبھی
اک عمر کاٹ دی ہے سوادِ گناہ میں
دھوتا ہوں شب کو بیٹھ کے داماں کبھی کبھی

صبحِ وصال دور تو اتنی نہیں مگر　　راتیں ہیں بیچ میں تری زلفِ سیاہ کی

جدائی میں جس کو مٹاتی ہے الفت　　وہ عمرِ رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے
وہی رات میری وہی رات اُن کی　　کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

دل اپنا خوفِ اسیری سے مطمئن کب تھا　　رہے چمن میں مگر آشیاں بنا نہ سکے

تماشا چشمِ دل سے اہلِ عرفاں دیکھ ہی لیں گے　　کسی پردے میں ہو تصویرِ جاناں دیکھ ہی لیں گے

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے　　یہ سب کچھ ہے مگر صیّاد دل پر کیا اجارا ہے

حافظ جلیل حسن جلیلؔ مانک پوری

فغاں میں درد دُعا میں اثر نہیں آتا　　جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا　　نقشہ ہے کسی کی کم سِنی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی　　یاد آگیا روٹھنا کسی کا
دیکھو نہ جلیلؔ کو مٹاؤ　　مٹ جائے گا نام عاشقی کا

کوئی حسیں ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا　　جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا
نیاز مند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو　　سلام جا کے انہیں گاہ گاہ کر لینا
کوئی سنے نہ سنے جب کو دردِ دل کہنا　　اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ہوا مجھ پر ناوک کا خطا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

بُرا نہ مانو اگر ذکرِ جور میں نے کیا
غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا

اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ
ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

مستی مری بہار پہ کچھ منحصر نہیں
ساقی کے دم سے روز ہے موسم بہار کا

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ناممکن ہے
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا

آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیلؔ
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

منتظر موسمِ گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

بجلی کی تاک جھانک سے تنگ آ گئی ہے جاں
ایسا نہ ہو کہ پھونک دوں خود آشیاں کو میں

نگاہِ برق نہیں چہرۂ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

مزے بے تابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انہیں سمجھا رہے ہیں

او آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

سب باندھ چکے کب کے سرِ شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

یا خدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جس پہ مرتا ہوں اسے میری خبر ہے کہ نہیں

راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا
منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
واعظو چھیڑو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیئے بیٹھے ہیں
دشت وحشت کو خبر دے کوئی
ہم گریباں لئے بیٹھے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم
اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے اُن کے لب پر — میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں
ہے آباد میرے تصور کی دنیا — حسیں آ رہے ہیں، حسیں جا رہے ہیں

نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ تبسم، نہ کلام — پاس بیٹھے ہیں مگر دُور نظر آتے ہیں

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ — کوئی جینے کا سہارا بھی نہیں

مریضوں کو تسکیں ذرا دیتے جاؤ — دُعا لیتے جاؤ دوا دیتے جاؤ
نکلتی ہے اس میں بھی شان اک وفا کی — یونہی تم وفا پر دغا دیتے جاؤ
جلیل آ ہی جائے گا رحم اس صنم کو — تم اللہ کا واسطہ دیتے جاؤ

بوئے مے پا کے میں چلتا ہوا مے خانے کو — اک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی — رکھ لوں میں دل میں اٹھا کر ترے میخانے کو
دمِ زینت انہیں کیا جانئے کیا یاد آیا — آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو
ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا — ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغر — رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو — کیا اب جواب دوں نگہِ انتظار کو

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لئے — در قفس کا ہو کھلا طاقتِ پرواز نہ ہو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے اُن کو آئے گا خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
بے سبب اپنی جگہ کا وہ نہیں — عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی
فصلِ گل آئی جنوں اچھلا جلیلؔ — اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے — وحشتِ مجنوں میں بہار آئی ہے
باغِ ہستی میں بہت دُور تھے ہم — بو کسی گل کی لگا لائی ہے
داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو — وہ چراغِ شبِ تنہائی ہے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے — فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے — جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے
آنکھوں میں کون آ کے الٰہی نکل گیا — کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے
اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانبِ کوئے جنوں — کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے — دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہیے — ہو لے دامن تو جُدا دیدۂ تر سے پہلے
شامِ غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑ اے دل — پوچھ لوں حالِ وطن بادِ سحر سے پہلے
کہہ گیا آج وہ بے درد گلے مل کے جلیلؔ — ہم نہ واقف تھے ترے دردِ جگر سے پہلے

نکلی نہ آہ منہ سے مرے دل میں رہ گئی — صد شکر بات غیر کی محفل میں رہ گئی
تلوار کھینچ کے پنجۂ قاتل میں رہ گئی — بسمل کی آرزو دلِ بسمل میں رہ گئی

چلتی ہے تیغِ ناز مزے لوٹ تو جلیلؔ — کہنا نہ پھر کبھی کہ ہوس دل میں رہ گئی

شبِ وعدہ عذرِ حنا ہو رہا ہے — وہاں آج خونِ وفا ہو رہا ہے
ستم ہے ستم کعبۂ دل کا ڈھانا — یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
جلیلؔ آج کل کشورِ دل میں اپنے — غمِ عشق فرماں روا ہو رہا ہے

اچھا ہے وہ کہ مجھ کو پھراتے ہیں در بدر — آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے
سیرِ چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا — پھولوں میں آگ لگ گئی برقِ نگاہ سے

اظہارِ حال پر مجھے قدرت نہیں رہی — اُن کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی
یا عمر بھر کا شوق تھا یا اک نگاہ میں — دیدار کی کلیمؔ کو حسرت نہیں رہی

دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں — رنگت تو پھول کی ہے مگر بُو وفا کی ہے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے منزلِ مقصود کہاں — خضر نے راہ بتائی مجھے مے خانے کی
مست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہِ ساقی — آنکھ کے سامنے چلتی نہیں پیمانے کی
بیخودی میں بھی یہی منہ سے نکلتا ہے جلیلؔ — شیشہ آباد رہے خیر ہو پیمانے کی

مست کرنا ہو تو خم منہ سے لگا دے ساقی — تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے

پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیلؔ   جھومتے آج چلے آتے ہیں مے خانے سے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی   دیکھئے کون پیشتر آئے
دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیلؔ   باغ جیسے بہار پر آئے

وہ پھر بھی حسن پر اپنے غرور کرتے ہیں   یہ جانتے ہیں کہ ہے شام ہر سحر کے لئے
شبِ وصال گئی داغ دے کے فرقت کا   نیا یہ پھول کھلا دامنِ سحر کے لئے
جلیلؔ دیدۂ خونبار سے خدا سمجھے   لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

سینے سے ہیں لگائے ہوئے کس کو خیال میں   او مستِ ناز کچھ تجھے اپنی خبر بھی ہے
دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے   اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو نظر بھی ہے
شوخی بھی ہے نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ   آنکھ اُس کی پردہ دار بھی ہے پردہ در بھی ہے

خون میرا اگر شریک ہوا   رنگ دے جائے گی حنا تیری
عشق آہ آج امتحاں ہے جلیلؔ   مشکل آساں کرے خدا تیری

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے   نگہ شوق پردہ در بھی ہے
کچھ تو بے چین ہیں وہ شوخی سے   کچھ مری آہ کا اثر بھی ہے
ہے تماشا کہ دل فگاروں میں   نام قاتل کا چارہ گر بھی ہے

ہو مزا تم جو اٹھا دو رُخِ روشن سے نقاب   شمع نازاں ہے کہ ہے رونقِ محفل مجھ سے

جذبۂ دل کا اثر ہو کے رہا اُن پہ جلیلؔ / اب تو ہوتے ہیں اشارے سرِ محفل مجھ سے

ہمیں کیا اے جنوں کانٹے جو دامن گیر ہوتے ہیں / نہ ہم رکھیں گے دامن کو نہ وہ اُلجھیں گے دامن سے
خدا جانے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ سنتا ہوں / اٹھے گا فتنۂ محشر تمہاری چشمِ پُرفن سے

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی / آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا / تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

جب تک خلشِ درد تھی اک گونہ مزا تھا / جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں / دو قدم کوچۂ رسوائی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی / سب گوارا ہے مجھے سنتے رہو فریاد بھی
تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے کبھی / یہ بھی کہہ دو اب نہ آئے گی تمہاری یاد بھی

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے / کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے
کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر / یہ جس پہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

پھر شوقِ تماشا لیے جاتا ہے کسی سمت / پھر ذوقِ طلب مجھ کو تماشا نہ بنا دے

ادا ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی　　نگاہِ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اُن کو　　اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی
جلیلؔ فصلِ بہاری کی دیکھئے تاثیر　　گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے　　کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بُو تیری

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال　　مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

اللہ ری تجلّی کہ رُخِ یار کے آگے　　یوں شمع ہے محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

ابوالعلا سعید احمد ناطقؔ لکھنوی

جلا کے شمع امید پھر سے بہار رہا ہوں پھر اشکِ خونیں
بجھی ہوئی کو جلا چکا ہوں، لگی ہوئی کو بجھا رہا ہوں
کھلیں گے جوہر جو عشق میں ہیں بھرم کھلے گا جو حسن کا ہے
وفا کو تم آزما رہے ہو، جفا کو میں آزما رہا ہوں
سوال کرنے دیا نہ مجھ کو، کبھی تری شوخیٔ کرم نے
اگرچہ سائل ہوں تیرے در کا مگر صدا بے صدا رہا ہوں

ہے دل پہ احسانِ حسن جتنا، ادا ہوا شکر بھی نہ اتنا
جفا کا حق مجھ پہ جس قدر ہے وفا مری اس قدر نہیں ہے
حرم سے نکلے تلاشِ بت میں، بتوں سے یادِ خدا پہ بگڑی
غرض ہم آوارۂ وفا ہیں کہیں ہمارا گزر نہیں ہے

اثر ہے سب پہ مئے عشق کا جدا گانہ
کسی کو نشہ نہیں ہے کوئی ہے دیوانہ
کسی کے زخم سے ملتا نہیں کسی کا زخم
تری نظر کے ہیں رُخ کس قدر جداگانہ

ملے گا راہ میں وہ نقش پا کہیں نہ کہیں
امید سجدہ کی تقدیر آزمائے جا
کسی پہ برق کہیں بار بار گرتی ہے
نگاہ شوخ مکرر نہ آزمائے جا

کمال نور زوال حجاب ہو نہ سکا
وہ بے نقاب کبھی بے نقاب ہو نہ سکا
روش بدل گئی تیور ترے نہیں بدلے
قیامت آئی مگر انقلاب ہو نہ سکا
کرے نہ سعی تلاش حدود عشق کوئی
یہ کام اس کا ہے جو کامیاب ہو نہ سکا

بڑی امید تھی ایفائے عہد کی مجھ کو
مگر کب آئی قیامت خیال ہی نہ رہا
نگاہِ لطف سے کیسا ہوا ہوں شرمندہ
سوال آکے زباں تک سوال ہی نہ رہا

یہ عشق تم سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہے
کہ عشق ایک صفت حسن کے صفات سے ہے
کچھ اور طرح کا صدمہ تھا بے رُخی سے تری
اب اور طرح کا اندیشہ التفات سے ہے

شمع کا آنسو نہیں تو خاکِ پروانہ سہی
میں بہر صورت شریک اہل محفل ہو گیا
آخری سیلاب سیل غم کا اک ایسا بھی تھا
اس قدر دریا بڑھا نزدیک ساحل ہو گیا
ایک دل پروانہ کس کس بزم میں جاکر بنے
وہ تو جس محفل میں پہنچا شمع محفل ہو گیا

مری نظر بھی پہنچتی نہیں مرے دل تک
رسا نہیں ہے کوئی راہ تیری منزل تک

حیات کو بھی اگر عذر ہے خدا حافظ   مگر مجھے تو پہنچنا ہے اپنی منزل تک

انداز جفا سے بھی نہ دیکھا کرو مجھ کو   آ جائے نہ تم پر کہیں الزام وفا کا
جلدی نہ کر اے قافلہ سالار قیامت   دم لے کہ ذرا دیکھ لوں انجام وفا کا

ذوقِ نظارہ کی کیا حد ہے کہ جی میں میرے   وقت دیدار بھی میں طالب دیدار رہوں
اتنی خاطر مری کرتا ہے قفس میں صیاد   کہ اگر چھوٹ بھی جاؤں تو گرفتار رہوں

کبھی دامانِ دل پر داغِ مایوسی نہیں آیا   اُدھر وعدہ کیا اُس نے اِدھر دل کو یقیں آیا
محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے   ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا
دو عالم سے گزر کر بھی دلِ عاشق ہے آوارہ   ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

علی نقی صفی لکھنوی

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اے راہ روؤ مجھ کو نہ للہ مٹاؤ   اک نقش کفِ پا ہوں کسی راہ گزر میں

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ   کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

وہ کیوں در پردہ میرے چاک پیراہن پہ ہنستے ہیں   ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں صورت گریباں کی
صفی حکمِ رہائی مل چکا پھر کیوں توقف ہے   نگر دربان سے کنجی کھو گئی ہے قفلِ زنداں کی

اُگر جو نہیں جاتی وہ ہے شب تنہائی
جا کر جو نہیں آتی وہ عمرِ گریزاں ہے

پنڈت برج نرائن چکبست

اس کو ناقدریِ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اُسے آباد کیا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں میں خزاں کیا بہار کیا

زندگی نام تھا جس کا اُسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں
شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے
جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں
مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
دل وہ دل ہے جو سدا ضبط سے ناشاد رہے
لب وہ لب ہے کہ جو شرمندۂ فریاد رہے

پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی
غزالانِ حرم بھولے ہوئے ہیں شوخیاں اپنی
ہزاروں آرزوئیں داغ بن کر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں اپنی

انہیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ

دل ہے بُت خانۂ اصنامِ خیالی ساحرؔ تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

ہونے کو تو اب بھی ہے وہی حسن وہی عشق جو حرفِ غلط ہو کے مٹا نقشِ وفا تھا

میں اپنی ہستی موہوم کو مٹاتا ہوں کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

کیا کہوں کام پڑا ہے مجھے نادانوں سے جانچتے عشق کو ہیں عقل کے پیمانوں سے

محمد اسماعیل میرٹھی

بزمِ ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

بلبل کے دل میں داغ وداعِ بہار ہے یارب کوئی فریفتۂ رنگ و بُو نہ ہو

ہے تو اغیار سے خطاب مگر میری ہر بات کا جواب بھی ہے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ

گل کیا ہے پتے پتے میں اک شانِ دلبری آنکھیں تمہاری طالبِ دیدار ہی نہیں

داستانِ عشق تم مجھ سے سنو — قیس و لیلیٰ کی کہانی اور ہے

نظم طبا طبائی

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق و خرمن کا — لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

نہ آنا تھا اجل تجھ کو فہم ہے وقتِ آخر تک — ابھی کچھ عمر باقی ہے اُسے بھی رائیگاں کریں

شوکت علی خاں فانی

تیرا نگاہِ شوق کوئی راز داں نہ تھا — آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا
اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں — اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بلبلوں کو لاگ — ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازئ آدابِ التفات — دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
میرے دلِ غیور کا حسنِ طلب تو دیکھ — گویا زباں پہ حرفِ تمنا گراں نہ تھا

اور تسلی سے سوا ہو گیا — دردِ جگر یہ تجھے کیا ہو گیا
اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج — کون گرفتارِ بلا ہو گیا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا — ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں — رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

خود برق ہو اور طورِ تجلی سے گزر جا
خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گزر جا
بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا حسنِ خود آرا سے گزر جا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گزر جا

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو
بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

شوقِ بیتاب کا انجامِ تحیر پایا
دل سمجھتے تھے جسے دیدۂ حیراں نکلا

اے جذبِ بے خودی ترے قربان جائیے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا
میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل یہ کیا دیا
دولتِ دو جہاں نہ دی اک دلِ مبتلا دیا
دل ہی نگاہِ ناز کا ایک اداشناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہِ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا
یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا
یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانیٔ نا امید کو موت کا آسرا دیا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا — اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
وحشت بقیدِ چاکِ گریباں روا نہیں — دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

جمالِ خود رُخِ بے پردہ کا نقاب ہوا — نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا
ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض — وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرفِ خواب ہوا
وہ جلوہ مفتِ نظر تھا نظر کو کیا کہیے — کہ پھر بھی ذوقِ تماشا نہ کامیاب ہوا
الٹ گئی مری امید و بیم کی دنیا — یہ کیا نظامِ تمنا میں انقلاب ہوا
گنہگار سہی دل مگر قصور معاف — ظہورِ شوق بہ اندازۂ حجاب ہوا
قضا کو مژدۂ فرصت کہ فانی مہجور — شہیدِ کشمکشِ صبر و اضطراب ہوا

جلوۂ عشق حقیقت تھی حسنِ مجاز بہانہ تھا — شمع جسے ہم سمجھے تھے شمع نہ تھی پروانہ تھا
شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں — آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا
دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو میخانے کو — ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا
فانی کو گو کیسا ہی سہی پھر بھی تجھ سے نسبت تھی — دیوانہ تھا، تھا کس کا، تیرا ہی دیوانہ تھا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا — ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

دل ہے تری نگاہ تک جان ہے ایک آہ تک
حوصلۂ امید کیا ظرف امیدوار کیا

جو غم بے اثر نہ ہو جو شب بے سحر نہ ہو
وہ غمِ انتظار کب وہ شبِ انتظار کیا

کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا
آرزوں کی کیا بساط شوق کا کاروبار کیا

وہی برقِ تجلی کارفرما اب بھی ہے لیکن
نگاہوں کو میسّر ہی نہیں بے ہوش ہو جانا

بہار اپنی چمن اپنا قفس کی تیلیوں تک ہے
مبارک نکہتِ گل کو چمن بردوش ہو جانا

قیامت ہے یہ ٹکڑا داستانِ عشق کا یعنی
مرے راحت طلب دل کا اذیت کوش ہو جانا

تری وفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

کیا سوال تو آوازِ بازگشت آئی
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

جنونِ شکوۂ بیداد پر خدا کی مار
اثر کے ساتھ گیا اعتبار نالوں کا

آغوشِ فنا میں ہم پروردۂ آفت ہیں
اے فتنۂ دوراں اٹھ اے حشر بپا ہو جا

ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے
ہر رہ گزرِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا

اس دلِ مایوس کی ویرانہ سامانی کچھ نہ پوچھ
اس نے جب اور جو چمن تاکا بیاباں ہو گیا

اُس کے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق
یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہو گیا

گل میں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا
اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا

ہر ذرہ جلوہ گاہ ہے ہر دل ہے چشمِ شوق
اللہ رے اہتمام تماشائے یار کا

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم　　آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں　　بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور
آنکھیں چرا کے آپ نے افسانہ کر دیا　　جو حال تھا زباں سے قریب و بیاں سے دُور

بنایا تھا نشیمن شاخِ گل پر کس گھڑی یا رب　　بجھی جاتی ہے ہر برقِ بلا شاخِ نشیمن پر

کون اٹھائے مری وفا کے ناز　　دل ستم دوست وہ رقیب نواز
اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز　　میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
کھل گیا میری زندگی کا راز　　اے شبِ ہجر تیری عمر دراز
صور و منصور و طور ارے توبہ　　ایک ہی تیری بات کا انداز
وہ گئی تھی جو بازؤں میں سکت　　ہو گئی صرفِ ہمتِ پرواز

مہربانی کی آس رہنے دے　　کون جیتا ہے مہربانی تک
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
ہوا نہ رازِ رضا فاش وہ تو یوں کہئے　　مرے نصیب میں تھی ورنہ سعیٔ نامعلوم
مری وفا کے سوا غایت جفا کیوں ہے　　تری جفا کے سوا حاصلِ وفا معلوم

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار رہیں ہم　　بے خودی کچھ تو بتا کس کے گنہگار ہیں ہم

حسنِ حیرت تو میسّر ہے تماشا نہ سہی
تیری محفل میں ہیں گو نقش بہ دیوار ہیں ہم

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانیؔ
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

گو بیٹھے بھی اٹھے بھی ہم محفلِ دشمن میں تیری خاطر
بیٹھ گئے دلِ زار کی صورت اٹھے صورتِ دردِ جگر ہم

شکوۂ جورِ بتاں ہم کرتے ظاہر دردِ نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے لاتے کہاں سے تجھ کو اثر ہم

دوست تسلّی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا
لیجئے آئی زخمِ جگر پہ اور اک تازہ آفتِ مرہم

ڈوب ہی جائے کشتیٔ ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحرِ تلاطم خیزِ جہاں میں یوں ہی رہیں گے زیر و زبر ہم

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک چلے
جس نے دل کی چوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں

رک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن
آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں

دل ہی پر اپنا بس نہیں چلتا اُن کی شکایت کیا کیجے
آپ ہم اپنے دشمن ٹھہرے دوست پہ کچھ الزام نہیں

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

بیزار ہو نہ جائے کہیں زندگی سے دل
تاثیر سے خفا مرے نالے ہوئے تو ہیں

ہاں دردِ عشق ان پہ کرم کی نظر رہے
صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

غم خانۂ دل کا کیا کہنا وہ کچھ بھی سہی یہ بات کہاں
خلوت میں یہاں جو جلوت تھی وہ آج تری محفل میں نہیں
سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل میں نہیں
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطفِ امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

وہ ایک رنگینئ نظر ہے جو سو بہاروں میں دیکھتا ہوں
مری محبت کی خامیوں میں ادائے حسنِ تمام دیکھو

بہار لائی ہے پیغامِ انقلابِ بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو
یہ شعبدے یہ کرشمے کسے میسر تھے — تری نگاہ نے سکھلا دیئے زمانے کو
خیالِ یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے — اب اُن کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو
نگاہِ لطف نہ فرما نگاہِ ناز کے بعد — جگر میں آگ لگا کر نہ آ بجھانے کو
زمانہ بر سرِ آزار تھا مگر فانی — تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

منہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے — خورشیدِ قیامت نے مرے دامنِ تر سے
دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں — ملنے کو تو ملتی ہے نظر اُن کی نظر سے

ہوش رہے نہ دوش کا فکرِ مآل رہ نہ جائے — خلوتِ یادِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے
عجز ادھر اُدھر غرور دونوں غیور سے غیور — دامنِ مدعا سے دور دستِ سوال رہ نہ جائے

آزردہ کیوں ہوئے مری آشفتگی سے تم — آخر یہی تو زلفِ شکن در شکن میں تھی
اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے — میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی
بے پردہ ذکرِ یار ہے در پردہ یادِ یار — میری زباں پہ ہے جو دلِ برہمن میں تھی
وہ گل ہے گل جسے تری خلوت میں بار تھا — وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی
بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر — کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

فصلِ گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی — دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی
چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ — آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

چمکا دیا ہے رنگِ چمن لالہ زار نے — شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے
ہاں ہم نہ تھے فریبِ تمنا سے بیخبر — کیا کہیے کیا کیا دلِ امیدوار نے

داد خود نمائی لے وحدتِ تمنا سے — آئینہ طلب فرما کثرتِ تماشا سے
حشر میں وہ کیوں پوچھیں کہ نہ دوں جو نسبت سے — شانِ بے نیازی کو آرزوئے رسوا سے
لے ترا تصور بھی جا کے اب نہ آئے گا — رسمِ ہوش اٹھتی ہے عاشقی کی دنیا سے

اٹھا اے نگاہِ شوق اٹھ متاعِ جاں لیے ہوئے — وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لیے ہوئے
حجابِ روزگار میں جھلک ہے یادِ یار کی — نشاطِ آشکار ہے غمِ نہاں لیے ہوئے
بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہ واپسیں — چلی ہے دل کی وادیوں سے آندھیاں لیے ہوئے
نہ پوچھ عہدِ ہوش کی کہ دامنوں کی آڑ میں — پھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لیے ہوئے

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق — جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں — جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے — پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں — آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا — جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے — مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے

لب تک آ جائے غمِ ہجر تو شکوہ ہو جائے — آپ سن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ — نظر تو ایک جھلک کی گناہ گار ہوئی
بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری — خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

دل کیوں شبِ فراق تڑپ کر ٹھہر گیا — کیوں اضطراب کیا تری صورت بدل گئی

ذرّہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا — دشتِ وحشت ہے وہ ذرّہ جو بیاباں ہو جائے
خلد مے خانے کو کہتے ہیں بقولِ واعظ — کعبہ بت خانہ کو کہتے ہیں جو ویراں ہو جائے

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق — پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے
اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یارب — در و دیوار دیے اب انہیں ویرانی دے

وہ وعدۂ آساں پر مائل نظر آتا ہے — اب کارِ تمنا پھر مشکل نظر آتا ہے

ہوتا نہیں اب اُن کی محفل میں شمار اپنا — یوں بیٹھے ہیں ہم جیسے اٹھ سے گئے محفل سے

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے — میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی — منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

وہ نظر کامیاب ہو کے رہی — دل کی بستی خراب ہو کے رہی
عشق کا نام کیوں کریں بدنام — زندگی تھی عذاب ہو کے رہی
نگہِ شوق کا مآل نہ پوچھ — سر بسر اضطراب ہو کے رہی
چشمِ ساقی کہ تھی کبھی مخمور — خود ہی آخر شراب ہو کے رہی
تابِ نظارہ لا سکا نہ کوئی — بے حجابی حجاب ہو کے رہی
ہم سے فانیؔ نہ چھپ سکا غمِ دوست — آرزو بے نقاب ہو کے رہی

لغزشِ توبہ کے ہاتھوں کہاں رندوں کا ٹھکانا تھا — مستیٔ چشمِ یار اگر تو گرتے ہوؤں کو تھام نہ لے
ننگ ہے سعیٔ غرضِ محبت فرضِ محبت پورا کر — اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

سیّد فضل الحسن حسرتؔ موہانی

عشق میں تیرے دل ہوا ایک جہانِ بےخودی — جانِ حزیں بن گئی حیرتِ بے قیاس کا
رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا — ساغر کو رنگِ بادہ نے پُرنور کر دیا
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ — لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل — آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا
حسرتؔ بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند — تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ — ہم پر نہ چلا جادو اے چین جبیں تیرا
مرغوبِ تمنا ہے محبوبِ دل و جاں ہے — ہر وضعِ جفا تیری ہر شیوۂ کیں تیرا
ہم خوب سمجھتے ہیں حسرتؔ سے تری باتیں — اقرار کا پردہ ہے انکار نہیں تیرا

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں — آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

رنگ یہ لایا ہجومِ ساغر و پیمانہ آج — بھر گئی سیرابیوں سے محفلِ رندانہ آج
بسکہ زیبِ انجمن ہے جلوۂ جانانہ آج — ہے سراپا آرزو ہر عاشقِ دیوانہ آج
یہ ہوا بے تابیوں پر نشۂ مے کا اثر — کہہ دیا سب ان سے حالِ شوقِ گستاخانہ آج
رشک سے مرمٹ گئے ہم تشنہ کامانِ وصال — جب ملا لب ہائے ساقی سے لبِ پیمانہ آج
ہے فروغِ بزمِ یکتائی جو وہ شمعِ جمال — آگئی ہے دل میں بھی بے تابیٔ پروانہ آج
غرق ہے رنگینیوں میں مستیوں میں چور چور — ہے سراپا بے خودی وہ نرگسِ مستانہ آج
میں ہی اے حسرت نہیں محوِ جمالِ روئے یار — پڑ رہی ہیں سب نگاہیں اس پہ مشتاقانہ آج

مجبور مجھ کو جان کے عہدِ وفا کے بعد — بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد
محجوبیِ سوال سے اس چشمِ ناز میں — منظوریوں کا رنگ عیاں ہے حیا کے بعد

محرومِ طرب ہے دلِ دلگیر ابھی تک — باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک
اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود — اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی — پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب — دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام
دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں — بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں — دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
عقل صبر آزما سے کچھ نہ ہوا — شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

تھے جو ہم رنگِ نازاُن کے ستم — دل کی امیدواریاں نہ گئیں
مر کے بھی خاکِ راہِ یار ہوئے — اپنی الفت شعاریاں نہ گئیں
حسن کی دلفریبیاں نہ گھٹیں — عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں
سب نے چھوڑا تجھے مگر حسرت — درد کی غم گساریاں نہ گئیں

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے — تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں
نگاہِ ناز کیوں کر کامیابِ شادمانی ہو — غضب کا رُعب ہے اس شوخ کے حسنِ نگہباں میں

ٹھہرا ہے ضبطِ شوق پر آ کر معاملہ — اس درجہ آرزو کی بڑھیں بے نیازیاں
رنگِ بہارِ باغ ہے مہمانِ یک نفس — اے وائے عندلیب تری شادمانیاں
حسرت ہے یادگارِ زمانِ جنوں ہنوز — باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے — شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو — ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا — سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں
تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل — گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی — اے یار تیرا حسنِ شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر — ق — نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
بزمِ طرب ہے وہ بزم کیوں ہو — ہم غمزدوں کو واں باریابی
اس نازنیں نے باوصفِ عصمت — ق — کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق اپنی بھولا گستاخ دستی — دل ساری شوخی حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی — ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قبلۂ غم پر قربان حسرت — عالی جنابی گردوں رکابی

اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت — آئینِ وفا مدِّ نظر لے کے گئی ہے
جب لے کے گئی ہے ہمیں تا کوئے ملامت — مجبوریِ دل خاک بسر لے کے گئی ہے
پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہوں کہ دعا کو — قسمت مری محرومِ اثر لے کے گئی ہے
اللہ رے کافر ترے اس حسن کی مستی — جو زلف تری تا بہ کمر لے کے گئی ہے

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو — پر ہم سے قسم لے لو جو کی ہو شکایت بھی
دشوار ہے رندوں پر انکارِ کرم یکسر — اے ساقیِ جاں پرور کچھ لطف و عنایت بھی

دل بسکہ ہے دیوانہ اس حسنِ گلابی کا — رنگیں ہے اسی رو سے شاید غمِ فرقت بھی
خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی — اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی
عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک — نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے — تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے
مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے — بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے
اظہارِ التفات کے پردے میں اور بھی — وہ عقدہ ہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے
ہم بیخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو — سب اُن سے عرضِ حالِ دلِ ژولیدہ کر چلے
تسکینِ اضطراب کو آئے تھے وہ مگر — بے تابیوں کی رُوح کو بالیدہ کر چلے
یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ — کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس جفا جو سے بہ ایمائے تمنا اب تک — ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
مل ہی جاتے ہیں پشیمانیِ غم کے اسباب — شوقِ حرماں کی مدارات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن — کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے — رسمِ پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے
اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا — سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے
نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں — شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے
حیرتِ حسن نے مجبور کیا ہے حسرت — وصلِ جاناں کی یونہی رات چلی جاتی ہے

اثر تیرے تغافل کا رقیبِ کامراں تک ہے — وجودِ رشک یعنی اضطرابِ بدگماں تک ہے

ابھی دیکھیں نہیں گستاخیاں جوشِ تمنّا کی
تمہاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے

مری مجبوریاں مشقِ جفا سے باز رکھیں گی
ترا شوقِ ستم ظالم خیالِ امتحاں تک ہے

سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدرِ وفا ان کو
یہ نشانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیاز مندی
یہ غرورِ دلربائی یہ یقینِ خود پسندی

نہ ہے اختیار تجھ پہ نہ ہے اعتبار دل پر
ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگِ مستمندی

مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت
وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بہ لطفِ ہوشمندی

تری بزمِ ناز ظالم ہے عجب طلسمِ حیرت
کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت پسندی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

کس درجہ پشیماں ہے تاثیرِ وفا میری
اس شوخ پہ آتا ہے الزامِ پشیمانی

دیکھ اے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت ہیں
بنتے ہیں بہ دشواری مٹتے ہیں بہ آسانی

یاں صبر میں ہے پنہاں کیفیتِ بیتابی
واں لطف سے پیدا ہے اندازِ ستم رانی

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے

ترے روئے دلآرا کے تصور کا یہ عالم تھا
کہ چشمِ شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے

مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

وفا میری بہ شکلِ بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا بہ رنگِ پرسشِ اغیار پیدا ہے

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اس بے وفا سے مصلحتِ شوق ہے یہی
اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے

منظور ہے جو ترکِ محبت ہی آپ کو
ہم پر ہجومِ نازو ادا بھی نہ کیجئے
حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت کی یاد میں
تو چاہتا ہے یادِ خدا بھی نہ کیجئے

پھر اسی لطفِ ستم کوش کا مشتاق ہے دل
ہم نے جس لطف کو ہم رنگِ جفا دیکھا ہے
تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے
دلِ بے تاب جو قابو میں نہیں اے حسرت
نگہِ معشوق نے کیا جانئے کب دیکھا ہے

یا جوشِ اضطراب کو ملزم نہ جانیئے
یا دل کو آشنائے محبت نہ کیجئے
واقف ہیں خوب آپ کی طرزِ جفا سے ہم
اظہارِ التفات کی زحمت نہ کیجئے

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے
بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے
جفائے یار کے شکوے نہ کر اے رنجِ ناکامی
امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے
وقارِ صبر کھویا گریہ ہائے بے قراری نے
کہیں اے اعتبارِ چشمِ نم ایسا بھی ہوتا ہے
بدعوائے وفا کیوں شکوہ سنجِ جور ہے حسرت
دیارِ شوق میں اے محوِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے
غرورِ حسن کی تاثیر سے ڈر ہے مجھے حسرت
کہیں ایسا نہ ہو وہ عشق کو بھی خود نما کر دے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو اُن کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی اُن کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

دل کو تھا حوصلۂ عرضِ تمنا سو انہیں
سرگزشتِ شبِ ہجراں بھی سنائی نہ گئی

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے
ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے

ہشیار کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش
عشاقِ ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا
یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

ہوتا ہے بڑا لذتِ آزار کا لپکا
مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے

کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرتؔ
یہ کشمکشِ غم تجھے بے کار نہ کر دے

شک انہیں مجھ پہ کاروانی کا
کچھ ٹھکانا ہے بدگمانی کا

تم جو کرتے تو ہم کو تھا کافی
اک اشارہ بھی مہربانی کا

حسنِ بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو
جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو

کثرتِ حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی
برقِ لرزاں ہے کوئی گرم تماشا کیا ہو

بے مثالی کے ہیں یہ رنگ جو باوصفِ حجاب
بے نقابی پہ ترا جلوۂ یکتا کیا ہو

ہم غرض مند کہاں مرتبۂ عشق کہاں
ہم کو سمجھیں وہ ہوس کار تو بیجا کیا ہو

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے

اُن کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا
پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

ناگوارا ہے بہت تلخیٔ ہجراں لیکن
تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی

یہ جو ایک دردِ محبت کی خلش ہے حسرتؔ
مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

بہت خجل ہے ترے رو سے دعا میری — یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری
وصالِ یار کی منزل قریب ہے حسرتؔ — ہوئی ہے آرزوئے شوق رہنما میری

اُن کو نہ کوئی سمجھے بیداد نہیں کرتے — ہم جور کے خوگر ہیں فریاد نہیں کرتے
دینا جو ہو دلوا دو آخر یہ ادا کیا ہے — انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے
اس پر بھی کچھ ایسا ہے اخفی ہیں بہم دونوں — ہم شاد نہیں ہوتے تم یاد نہیں کرتے
کر وقفِ بتاں حسرتؔ ناحق نہ خلوص اپنا — اس جنسِ گرامی کو برباد نہیں کرتے

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا — وہ اُن کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا
سکونِ یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو — قیامت ہے کسی کا وعدۂ دیدار کر لینا
وہ دن اب یاد آتے ہیں بہارِ خوں فشانی کے — مرا وہ جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا
یہ کیا ایذا پسندی ہے کہ حسرتؔ عشقِ جاناں میں — تجھے ہر عقدۂ آساں کو بھی دشوار کر لینا

عاشقِ دل فگار کو بے خود و بے قرار کو — محوِ لقائے یار کو شوقِ لقا سے کیا غرض
چارۂ دردِ دل ہو کیوں ان کی جفا خجل ہو کیوں — عشق بھی منفعل ہو کیوں مجھ کو شفا سے کیا غرض
حسرتِ مے پرست کو بلکہ ہر ایک مست کو — پیرِ مغاں کے دور میں خوفِ خطا سے کیا غرض

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں — جل اُٹھے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرم نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں — خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

دلِ ہوس جو نشانہ تری نظر کا ہوا
تو روحِ شوق پکاری شکار ہم بھی ہیں

اسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جن پہ انکی نظر
اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نگاہِ یار سے اظہارِ التفات ہوا
تو حالِ دل نے کہا آشکار ہم بھی ہیں

شکایت اُن کی نہ چاہو یہی کہو حسرتؔ
نشانۂ ستمِ روزگار ہم بھی ہیں

بہت نادم ہوئے آخر وہ میرے قتلِ ناحق پر
ہوئی قدرِ وفا جب آشکار آہستہ آہستہ

جلائے شوق سے آئینۂ تصویرِ خاطر میں
نمایاں ہو چلا روئے نگار آہستہ آہستہ

محبت کی جو پھیلی ہے یہ نکہت باغِ عالم میں
ہوئی ہے منتشر خوشبوئے یار آہستہ آہستہ

ملا کر خاک میں مجھ کو جھکی ہے شرم سے لیکن
اٹھے گی پھر وہ چشمِ فتنہ کار آہستہ آہستہ

نہ آئیں گے وہ حسرتؔ انتظارِ شوق میں یونہی
گزر جائیں گے ایامِ بہار آہستہ آہستہ

خیالِ یار جو مصروفِ کار ہوتا ہے
قرار بخشِ دلِ بے قرار ہوتا ہے

یہ ماجرا بھی ہے دنیائے عاشقی میں نیا
کہ نامراد یہاں کامگار ہوتا ہے

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

مقصود ہے اتنا کہ رہے مجھ پہ توجہ
مخصوص یہ اندازِ جفا میرے لئے ہے

جنت کی ہوس ہو تو میں کافر کہ پریشاں
اس شوخ کی خوشبوئے قبا میرے لئے ہے

دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

کیسے کہہ دوں اسے بیگانۂ الفت کہ وہ شوخ
ظلم کرتا ہے مگر مانعِ فریاد بھی ہے

چھپ کے اس نے جو خودنمائی کی — انتہا تھی یہ دل ربائی کی

مائلِ غمزہ ہے وہ چشمِ سیاہ — اب نہیں خیر پارسائی کی

دام سے اس کے چھوٹنا تو کہاں — یاں ہوس بھی نہیں رہائی کی

ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش — صلح میں شان ہے لڑائی کی

اس تغافل شعار سے حسرتؔ — ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

تری محفل سے ہم آئے مگر باحالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے — ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحتِ جاں — کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا

عاشقو! حسنِ جفاکار کا شکوہ ہے گناہ — تم خبردار، خبردار نہ ایسا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرتؔ — ان سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

جانِ پُرغم نے بھی الزام لگایا نہ انہیں — یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا

سخت محرومِ ادب ہے دلِ حسرتؔ نے اگر — بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

نظر پھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا — محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا

وہ کیا قدر جانیں دلِ عاشقاں کی — نہ عالم، نہ فاضل، نہ دانا، نہ بینا

وہیں سے یہ آنسو رواں ہیں جو دل میں — تمنا کا پوشیدہ ہے اک خزینا

یہ کیا قہر ہے ہم پہ یارب کہ بے مے — گزر جائے ساون کا یوں ہی مہینا

بہار آئی سب شاد ماں ہیں مگر ہم
یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

پائی ہے جگہ پاکی دامانِ نظر میں
خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر
کیا چیز تھی ساقی وہ پسِ پردۂ مینا
جو سرخ پری بن گئی ساغر سے نکل کر

چاہت مری چاہت ہی نہیں آپ کے نزدیک
کچھ میری حقیقت ہی نہیں آپ کے نزدیک
کچھ قدر تو کرتے مرے اظہارِ وفا کی
شاید یہ محبت ہی نہیں آپ کے نزدیک
عشاق پہ کچھ حد بھی مقرر ہے ستم کی
یا اس کی نہایت ہی نہیں آپ کے نزدیک

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
اے یادِ یار دیکھ کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو
آخر بچے نہ اس نگہِ بدگماں سے ہم
مایوس بھی تو کرتے نہیں تم ز راہِ ناز
تنگ آ گئے ہیں کشمکشِ امتحاں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں
شکوۂ جور تقاضائے کرم عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائے گا بے تابیٔ دل کا حسرتؔ
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کریں یار کی پروا نہ کریں
دلِ وحشی کا کسی طرح تقاضا تو مٹے
کیا کریں سر کو جو آمادۂ سودا نہ کریں

سخت رنجور کر دیا ہم کو
دل نے مجبور کر دیا ہم کو
مجھ سے بگڑے ہیں وہ کہ تو نے یہ کیا
سب میں مشہور کر دیا ہم کو
خاکساروں میں اپنے دے کے جگہ
تم نے مغرور کر دیا ہم کو
نار نے عشقِ یار کی حسرت
سر بسر نور کر دیا ہم کو

آج پھر اُس نے کیا وعدۂ فردا دیکھو
وصل کی بات کا بن بن کے بگڑنا دیکھو
حالِ دل سے تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں
پھر کبھی "ہم کو خبر کیا تھی" نہ کہنا دیکھو

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے
کسے یقین ہو، کون اس پہ اعتبار کرے
قفس میں ہو دلِ بلبل شہیدِ فرقتِ گل
خزاں نے جو نہ کیا تھا وہ اب بہار کرے
شبِ وصال ہے کوتاہ، نازِ یار دراز
ہجومِ شوق سے کہہ دو کہ اختصار کرے
فزوں ہیں حد سے ترے جورِ بے حساب کے داغ
نہ میں شمار کراؤں نہ دل شمار کرے

اُن کو جو شغلِ ناز سے فرصت نہ ہو سکی
ہم نے یہ کہہ دیا کہ محبت نہ ہو سکی
خاموشیوں کا رازِ محبت وہ پا گئے
گو ہم سے عرضِ حال کی جرأت نہ ہو سکی

ہر بات میں اک شان ہے بے ساختہ پن کی
تصویر ہے تقریر تری حسنِ سخن کی
بڑھ جائے گی عزت گل و نسرین و سمن کی
لائی ہے چمن میں اُنہیں تقدیر چمن کی

شکوۂ غم ترے حضور کیا — ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
دردِ دل کو تری تمنا نے — خوب سرمایۂ سرور کیا
یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے — تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے — نہ ملے حسن کا غرور کیا

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا — وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

حسرت کشانِ درد ہیں لب تشنگانِ عاشقی — سیراب غم کر دے کہیں پیرِ مغانِ عاشقی
منظورِ دلداری رہا لطفِ نہانِ دلبراں — مقصود رسوائی رہی شانِ عیانِ عاشقی
وہ ہم کہاں، وہ دل کہاں البتہ اتنا ہے کہ ہاں — باقی ہے اک سوزِ نہاں اب تک نشانِ عاشقی

سعیٔ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال — اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی
رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جو رات — کھنچ گئی شکل مری سوختہ سامانی کی

دے دے کے مفت جان شہیدانِ عشق نے — اس نازنیں کو شاہدِ قاتل بنا دیا
شوقِ لقائے یار نے راہِ مراد میں — سختی کو رشکِ نرمیٔ منزل بنا دیا

سب سے شوخی ہے کہ ہمیں سے حیا — اے فریبِ نگاہِ یار یہ کیا؟

اب وہ ملتے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی ‌ ‌ ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا
گلشنِ حسنِ یار کی حسرتؔ ‌ ‌ جانفزا کس قدر ہے آب و ہوا

آئی جو اُن کی یاد مرا دل ٹھہر گیا ‌ ‌ دعوائے غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا
تیر نگاہِ یار کا مشکل ہے سامنا ‌ ‌ میرا ہی تھا جگر کہ مقابل ٹھہر گیا
دل خوش ہوا جو آپ ہوئے مائلِ ستم ‌ ‌ یعنی میں التفات کے قابل ٹھہر گیا
اچھا ہوا کہ مملکتِ حسن و عشق میں ‌ ‌ حسرتؔ وہ بادشاہ میں سائل ٹھہر گیا

رہے محوِ خوابِ ہوس اہلِ ظاہر ‌ ‌ گذر بھی گیا کاروانِ محبت
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی ‌ ‌ بیانِ تمنا، زبانِ محبت
سرِ عجز حسرتؔ بھی خم کیوں نہ ہوتا ‌ ‌ ترا ناز ہے حکمرانِ محبت

چشمِ رنگیں یار کو ہے پسند ‌ ‌ سرخیٔ اشکِ عاشقاں کی بہار
صاف اقرار ہے محبت کا ‌ ‌ آپ کا التفات سے انکار
دور ہیں حسنِ یار کے حسرتؔ ‌ ‌ کون ہے رہ سکے گا جو ہشیار

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں ‌ ‌ ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے ‌ ‌ لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بے کار ‌ ‌ کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو ‌ ‌ لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرتؔ
اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نامرادوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو

عاشقو! ہجر سے نہ ہو بیزار
غمِ جاناں کا احترام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرتؔ اٹھو سلام کرو

لاکھ اس شوخ جفاکار سے پرہیز کرو
شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب انگیز کرو

فرق لائے نہ جگر سوزیِ صہبا میں گلاب
مغ بچو تم کو قسم ہے جو کچھ آمیز کرو

بجا ہے دلِ زار کی ناصبوری
کہاں تک اٹھائے کوئی رنجِ دوری

وہ فہمیدہ ہی سے اڑا لیں گے مطلب
کہیں شوق نے بات کی ہو نہ پوری

تمنّا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

نظر اس رخ پہ ہے ادب کے خلاف
دل ہے اس فیصلے میں سب کے خلاف

آج پرسیں وہ روز کرتے ہیں
بے رخی وعدہ ہائے شب کے خلاف

حسنِ جاناں کے عہد میں حسرتؔ
شوق ٹھہرا ہے واجب کے خلاف

چھپے گی تری دوستداری کہاں تک
کرے گا دل انکارِ یاری کہاں تک

کہیں رک بھی اے چشمِ خونابہ افشاں
کہاں تک تری اشک باری کہاں تک

کریگی فقیروں سے اے شاہِ خوباں
تغافل تری شہریاری کہاں تک

ہمیں حالِ دل عرض کرنے نہ دے گی
بھلا ان سے بے اختیاری کہاں تک

تمنا کو اس حد پہ رہنے نہ دے گی ترے حسن کی بے قراری کہاں تک
گردبیرِ دنیا ہے حیرت بھی حسرتؔ خردمندی و ہوشیاری کہاں تک

سجدے کئے اس در پہ اسی عذر سے لاکھوں ہم عاشقِ بے خود ہیں گنہ گار کہاں ہیں
اک بار چلے جاؤ دکھا کر جھلک اپنی ہم جلوۂ مبہم کے طلب گار کہاں ہیں
شوق اُن سے یہ کہتا ہے توجہ نہیں تم کو عقدے مرے سب سہل ہیں دشوار کہاں ہیں

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہئے

حضورِ یار کرے عرضِ آرزو اے شوق مجھے امید نہیں تیری بے زبانی سے

عشق ہر چند رامِ حسن رہا پر نہ چھوٹی برابری کی ہوس
ہم بھی حاضر ہیں بندگی کے لئے آپ کو ہو جو صاحبی کی ہوس

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق "دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا"
فکرِ کونین سے بیگانہ ہوا تو حسرتؔ خوب ٹھہرا غمِ جانانہ سے یارانہ ترا

شوق کہاں آرزوئے شوق ہے جس سے جہاں مستِ مے ذوق ہے
درجہ ترے عشقِ فسوں کار کا حُسن کے رُتبے سے بھی مافوق ہے

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

تری آرزو ہے اگر جُرم کوئی — تو اس جرم کی میں سزا چاہتا ہوں

گیسوئے دوست کی خوشبو ہے دو عالم کی مراد — آہ وہ نکہتِ بر باد کہ برباد نہیں

بنے وہ رونقِ محفل جس انجمن میں رہے — رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں رہے
زہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب — وہ ابتری جو تری زلفِ پُرشکن میں رہے
ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات — سُخن نہ کوئی مرے دل میں یاد ہی میں رہے
جو فیضِ عشق یہی ہے تو کیا عجب حسرتؔ — کہ امتیاز نہ کچھ شیخ و برہمن میں رہے

کوئی اُن کی بزمِ جمال سے کب اٹھا خوشی سے کہاں اٹھا
جو کبھی اٹھا بھی اٹھائے سے تو اسی طرف نگراں اٹھا
ہے عجیب دل کش و جانفزا ترے کوئے حُسن کا ماجرا
کہ اثر سے قوتِ عشق کے میں گرا تھا پیر جواں اٹھا
کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل اے دلِ مبتلا
مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے — تمنّا کی فصلِ بہار آ رہی ہے

اُس نے ہم سے سنی نہ شوق کی بات — ہنس کے پوچھا یہ کس زبان میں ہے

حسن تیرا بہ امتزاجِ وفا — اک نمونہ تھا بے مثالی کا

مہرباں ہو کے پاس کچھ تو کرو — لبِ حسرت کی بے سوالی کا

بے تاب نظر آیا بدنام نظر آیا — عاشق جو نظر آیا ناکام نظر آیا
اے آہِ دلِ عاشق دیکھیں تری تاثیریں — پہلے سے بھی وہ بڑھ کر خودکام نظر آیا

سکھا دی ہیں نرالی شوخیاں کچھ لطفِ جاناں نے — مرے دستِ تمنا کی شرارت بڑھتی جاتی ہے
جمالِ یار میں ہر دم ترقی ہوتی رہتی ہے — دلِ حیراں کی حس سے روز حیرت بڑھتی جاتی ہے

چھیڑا ہے دستِ شوق نے مجھ سے خفا ہیں وہ — گویا کہ اپنے دل پر مجھے اختیار ہے
شاید یہاں سے حسرتِ دیوانہ چل بسا — ہاں ہاں ابھی تو چشمِ جنوں اشکبار ہے

کرتی ہے دل کو اور بھی آمادۂ ہوس — تیری یہ بے رخی یہ ادا اجتناب کی
کچھ اُن کی قدرِ شوق نہیں ورنہ آرزو — امیدوار تھی کرمِ بے حساب کی

قیمتِ مے کہ بہ پیمانۂ جاں ہے ساقی — کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی
تو نے رکھ دی تھی جہاں چھین کے ہم سے بوتل — رُوحِ ہستی اسی جانب نگراں ہے ساقی
محتسب کی نہ سنی ہے نہ سنے گا حسرت — کہ وہ مے خوار ترا مرتبہ داں ہے ساقی

حسرت وہ سن رہے ہیں جو اہلِ وفا کا حال — اس میں بھی کچھ فریب تری داستاں کے ہیں

شوق کو جُرم سے بری نہ کیا — تم نے کچھ پاسِ دلبری نہ کیا

خام تھی اپنی بندگی کہ اُنہیں — مائلِ بندہ پروری نہ کیا
زاہدِ محترم ہے کہ حق نے اُسے — سرفرازِ قلندری نہ کیا
عشقِ صادق نے حسنِ کامل سے — نہ شناذ کہ برتری نہ کیا
شکوہ سنج اُن سے کیوں ہوئے حسرتؔ — احترامِ ستم گری نہ کیا

تاثیر برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
اک رنگ التفات بھی اُس بے رُخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہ سحر فن میں تھی
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوبِ یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل — کیفیتِ بہار کی شدّت چمن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

عیشِ گداز دل بھی غمِ عاشقی میں تھا
اک راحتِ لطیف بھی ضمنِ محن میں تھی

علی سکندر جگرؔ مرادآبادی

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا
ہائے رے حسنِ تصوّر کا فریبِ رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا
جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حسن و عشق — شوقِ نارسا اپنا، نازِ کامیاب اُن کا
رنگ و بو کے پردے میں کون پھوٹ نکلا ہے — چھپ سکا چھپائے سے کیا کہیں شباب اُن کا

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی — ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا
تو جگر جو رسوا ہے تو ہی آہ رسوا رہ — نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب اُن کا

ابتدا وہ تھی کہ تھا جینا محبت میں محال — انتہا یہ ہے کہ اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

عشق میں سیرِ گل و لالہ ہے تمہیدِ جنوں — چاہیے ایک بیاباں بھی گلستاں کے قریب

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو — مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

ہجومِ تجلی سے معمور ہو کر — نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسنِ مغرور سے نسبتیں ہیں — کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

تقدیر نے اسے بھی نظر سے چھپا دیا — روئے لپٹ کے گردِ پسِ کارواں سے ہم

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا — بہار میرے لیے اور میں تہی دامن

اب اُن کا کیا بھروسا وہ آئیں یا نہ آئیں — آ، اے غمِ محبت تجھ کو گلے لگائیں
اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں — کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں
اس حسنِ برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں — شعلوں سے بھی جو کھیلیں دامن کو بھی بچائیں
عاشق خرابِ مستی، زاہد خرابِ تمکیں — وہ بھی ترے کرشمے یہ بھی تری ادائیں

اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی — اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں
آلودہ خاک ہی ہیں رہنے دے اس کو ناصح — دامن اگر جھٹک دوں جلوے کہاں سمائیں
اشعار ہی کے نکلیں جو سینۂ جگر سے — سب حسنِ یار کی ہیں بے ساختہ ادائیں

سخت مشکل سے پڑا آج گریباں پہ ہاتھ — میں سمجھتا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دور نہیں

ہمارے ہی دل سے مزے ان کے پوچھو — وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں

کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں — بس اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں
نہ بے ہوشیاں اب نہ ہشیاریاں ہیں — محبت کی تنہا فسوں کاریاں ہیں
تجلی سے کہہ دو ذرا ہاتھ روکے — بہت عام اب دل کی بیماریاں ہیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
یہ نازِ حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر — نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں
میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی — تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

باقی ہے عمرِ ابد عشق کے میخانے میں — اے اجل تو بھی سما جا مرے پیمانے میں
ہم کہیں آتے ہیں واعظ ترے بہکانے میں — اسی میخانے کی مٹی اسی میخانے میں

ہر چند کہ تھمتے نہیں آنسو صفتِ شمع — بارے تری محفل کا سماں دیکھ رہے ہیں

فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں   رحمت کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں
معصومیٔ جمال کو بھی جن پہ رشک ہے   اُن سے بھی کچھ گناہ کئے جا رہا ہوں میں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

آکہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں   جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب   کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
میری خاطر اب وہ تکلیفِ تجلی کیوں کریں   اپنی گردِ شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں
دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا   وہ جفا کرتے ہیں مجھ پہ اور شرماتا ہوں میں
ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگرؔ   ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

طریقِ جگرؔ ہے خوب تر مگر آہ واعظ بے خبر   اسے ساز گار ہو زہد کیا جسے معصیت بھی روا نہیں

الٰہی ایک دعا ہے اگر قبول نہ ہو   بہت غریب یہ دل ہے کبھی ملول نہ ہو
تجھے بھی شائق نہ ہو شوق بھی ملول نہ ہو   نظر قبول ہوئی ہے اثر قبول نہ ہو
کوئی گناہ نہیں شوقِ دید ذوقِ نظر   مگر جو فرصتِ نظارگی کو طول نہ ہو

ہر قدم پہ ہر روش پر ہر ادا پہ ہر جگہ   دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظرِ عام پر، کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

تری چشمِ مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش یہ سب جنوں اسی ایک گردشِ جام سے

یہ کتابِ دل کی ہیں آیتیں میں بتاؤں کیا جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو ترے نقش ہائے خرام سے

وہیں چشمِ حور پھڑک اٹھی، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بیک جو چھلک گئی کسی رندِ مست کے جام سے

ملا کے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے / تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے
میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر / یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے
گلے سے تیغِ ادا کو جدا نہ کر قاتل / ابھی یہ منظرِ راز و نیاز رہنے دے
یہ تیر ناز ہیں تو شوق سے چلائے جا / خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
بجھا نہ آتشِ فرقت کرم کے چھینٹوں سے / دلِ جگر کو مجسم گداز رہنے دے

مجھے ہلاکِ فریبِ مجاز رہنے دے / نہ چھیڑ او نگہِ امتیاز رہنے دے
میں رازِ عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں / مگر جو مصلحتِ حسنِ ناز رہنے دے
یہ بات کیا کہ حقیقت وہی مجاز وہی / مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے
یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد / یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے
گزرتی ہے جو دلِ عشق پر نہ پوچھ جگر / یہ خاص رازِ محبت ہے راز رہنے دے

حالِ دل ماورائے حال بھی ہے / عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے
دل کے ہر اضطرابِ نازک میں / شانِ بے تابیٔ جمال بھی ہے

چھائے جاتے ہیں درد دل بن کر — اس پہ تاکید ضبطِ حال بھی ہے
حُسن کے ہر جمال میں پنہاں — میری رعنائیِ خیال بھی ہے

وہ دیوانہ ہوں میں جب سے بسایا میں نے زنداں کو — نہ صحرا میں اُگے کانٹے نہ گلشن میں بہار آئی

مجھے جو عرضِ تمنا پہ کچھ حجاب آیا — مرے سوال کا شرمندگی جواب ہوئی

ابھی تکمیل کو پہنچی نہیں تعمیرِ جنوں — ابھی چلتی رہے دیوانوں سے دیوانوں کی
ہر طرف چھا گئے پیغامِ محبت بن کر — مجھ سے اچھی رہی قسمت مرے افسانوں کی

اُٹھے مرے مقابل جس کو زعمِ تمکیں — تصویر کھینچتا ہوں اک حُسنِ شعلہ خُو کی
عینِ شگفتگی ہی، حسنِ شکستگی ہے — چاکِ قبائے گل کو حاجت نہیں رفو کی

رعنائیِ خیال کو رسوا نہ کیجئے — ممکن بھی ہو تو عرضِ تمنا نہ کیجئے
ہر جلوہ ہے بجائے خود اک دعوتِ نگاہ — کیا کیجئے جو تیری تمنا نہ کیجئے

یہ کیا مجال کہ ہم ترکِ التجا کرتے — دہن کو سی بھی جو لیتے نظر کو کیا کرتے
نمازِ عشق یہاں ہے نفس نفس جاری — کبھی ادا ہی نہ ہوتی اگر قضا کرتے

میں گنہگارِ جنوں میں نے یہ مانا لیکن — کچھ ادھر سے بھی تقاضائے نظر ہوتا ہے
کون دیکھے اسے بیتابِ محبت اے دل — تو وہ نالے ہی نہ کر جن میں اثر ہوتا ہے

تصور میں ہے کچھ ایسا تری تصویر کا عالم
کہ جیسے اب لبِ نازک سے کچھ ارشاد ہوتا ہے
کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

یہ راز ہم پہ کھل رہے ہیں اک موجِ تہ نشیں سے
ڈوبے ہیں ہم جہاں پر اُبھریں گے پھر وہیں سے
خونِ وفائے بسمل جرمِ نگاہِ قاتل
ظاہر تو ہر جگہ ہے ثابت نہیں کہیں سے

اے حُسن اپنی حوصلہ افزائیاں تو دیکھ
مانا کہ چشمِ شوق بہت بے حجاب ہے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

زاہد مگر اس رمز سے آگاہ نہیں ہے
سجدہ وہی سجدہ ہے کہ جو ننگِ جبیں ہے
جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے
اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے
مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں
دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے
ہر لحظہ نیا جلوہ، نئی آن، نئی شان
میری نگہ شوق بھی کیا شوخ حسیں ہے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشقِ لامحدود
مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے
جمالِ حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے
ہزار دل کو مٹا کر مجھے دیا اک درد
اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے
خوشا وہ دردِ محبت نہ ہے وہ دل کہ جسے
ذرا سکون ہوا گدگدا دیا تو نے

وہ کافر آشنا نا آشنا یوں بھی ہے اور یوں بھی
ہماری ابتدا تا انتہا یوں بھی ہے اور یوں بھی
تعجب کیا اگر رسمِ وفا یوں بھی ہے اور یوں بھی
کہ حُسن و عشق کا ہر مسئلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی

لگا دے آگ او برقِ تجلی دیکھتی کیا ہے
نگاہِ شوق ظالم نارسا یوں بھی ہے اور یوں بھی
الٰہی کسی طرح عشق و جنوں کو ایک جا کر لوں
کہ منشائے نگاہِ فتنہ زا یوں بھی ہے اور یوں بھی

ترے جمالِ حقیقت کی تاب ہی نہ ہوئی
ہزار بار نگہ کی مگر کبھی نہ ہوئی
ہم اپنی رندی و طاعت پہ خاک ناز کریں
قبولِ حضرتِ سلطاں ہوئی ہوئی نہ ہوئی
تمام حرف و حکایت تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرحِ عاشقی نہ ہوئی
صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

آئے زباں پہ رازِ محبت محال ہے
تم سے مجھے عزیز تمہارا خیال ہے
دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن
اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

اللہ ری چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
اس عشق کی تلافیٔ مافات دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

عشق کا رازِ جنوں عشق کی حد ہی میں رہے
دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے
داستانِ غمِ ہستی کو مکمل کر لے
ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے
حسن سرگرمِ نوازش ہے مگر اے غمِ دل
رائیگاں عشق کا احسان نہ جانے پائے

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
ہم عشق مجسم ہیں لب تشنہ و مستسقی
دریا کی طلب کیسی دریا کو رلانا ہے
آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے سو دانا ہے

ادا جو آئے وہ بے عیب بے قصور آئے
خدا وہ دن نہ کرے آپ کو غرور آئے

الٰہی جاذبِ محبت کی بخشش دے تقصیر
وہ آج دست بدل سخت ناصبور آئے

مری طرف سے بھی اے کاروانِ شوق سلام
کہیں جو راہِ طلب میں مقامِ طور آئے

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں
نہ غنچے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے

تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خم و خم خانہ سہی

اب قفس میں ہوش آیا تو یہ حیرت ہے ہمیں
کس طرح آنکھوں سے لٹتے آشیاں دیکھا کئے

جی بھر آیا ناتوانی پر جو راہِ شوق میں
دیر تک ہم نقشِ پائے رہرواں دیکھا کئے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر
لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعیِ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

خزاں کا رنج کرے عشق میں بلا میری
نہیں بہار تو یادِ بہار کیا کم ہے

خوشی میں بھول نہ جانا جگرؔ یہ رازِ حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں اک امانتِ غم ہے

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

نقابِ روئے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا
مبارک اپنے ہاتھوں حسن کا مجبور ہو جانا

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں — ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا

بہارِ لالہ و گل، شوخیٔ برق و شرر ہو کر — وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر
بھرم کھونا کہیں اے دل نہ عشقِ معتبر ہو کر — گزر جا ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر
حجاب اندر حجاب و جلوہ اندر جلوہ کیا کہیے — بلا میں پھنس گئے عشاق پابندِ نظر ہو کر
کہاں جاتی ہے مل کر او نگاہِ ناز بے پردہ — مرے پہلو میں رہ جا لذتِ دردِ جگر ہو کر

دل کو کسی کا تابعِ فرماں بنائیے — دشواریٔ حیات کو آساں بنائیے
درماں کو درد، درد کو درماں بنائیے — جس طرح چاہئے مجھے حیراں بنائیے
آباد اگر نہ دل ہو تو برباد کیجیے — گلشن نہ بن سکے تو بیاباں بنائیے

ہر ادا حسن کی ڈوبی ہوئی تاثیر میں ہے — تجھ میں جو ہے وہی عالم تری تصویر میں ہے

پھر عشقِ جنوں پیشہ یوں سلسلہ جنباں ہے — راہیں بھی گریزاں ہیں منزل بھی گریزاں ہے
صدقے ترے ہونٹوں کے رنگینیٔ و رعنائی — اک موجِ تبسم میں کل رازِ گلستاں ہے
اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے — اے کفر! ترے دم سے آرائشِ ایماں ہے

مجھے اب خوف ہی کیا ہجر میں تنہائی دل سے — ہزاروں محفلیں لے کر اٹھا ہوں تیری محفل سے

ہر ذرے کے پیکر میں اک روح وفا ڈالی — اپنی ہی سی کل دنیا عاشق نے بنا ڈالی
ہستی جسے کہتے ہیں اک سادہ حقیقت ہے — رنگین نگاہوں نے رنگین بنا ڈالی

نظرِ صیاد کی کیا؟ برق بھی ہو تو لرزہ اٹھے　　ابھی آیا نہیں تنکوں کو جانِ آشیاں ہونا
تماشا دیدنی ہے دیکھ لیں اہلِ نظر آ کر　　مرے ہمراہ منزل کا بھی گردِ کارواں ہونا
سُنا ہے ہر طرف لٹتے ہیں جلوے حُسنِ صورت کے　　کبھی تم بھی جگرؔ آوارۂ کوئے بتاں ہونا

دل میں باقی نہیں وہ جوشِ جنوں ہی ورنہ　　دامنوں ہی کی کمی ہے نہ گریبانوں کی

چھوڑا نہ راز کوئی جہانِ خراب کا　　سب کہہ گیا میں خواب میں افسانہ خواب کا
بگڑا ہوا ہے رنگ جہانِ خراب کا　　بھر لوں نظر میں حسن کسی کے شباب کا

پیشِ نظر ہے حُسنِ دوست حُسن کے ماسوا نہیں　　عشق میں مبتلا ہوں میں شرک میں مبتلا نہیں
بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حسنِ دوست　　عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

عشق کیا چیز ہے؟ اک حشر در آغوشِ خیال　　حُسن کیا؟ خواب ہے اک چشمِ تماشائی کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کار فرما کا　　وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

کیا آ گیا خیال دلِ بے قرار میں　　خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

رنگینیٔ الم میں دیکھا ہے جن کو اکثر　　اے دل وہی تو جلوے سرمایۂ نظر ہیں
آساں نہیں گزرنا صحرائے بیخودی سے　　ہشیار اہلِ تمکیں رستے یہ پُرخطر ہیں

سمجھائے کون؟ بلبلِ غفلت شعار کو — محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو
عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ — کیا منہ دکھاؤں رحمتِ پروردگار کو
بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں ہر ایک سمت — پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو

قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہم صفیر
مگر الجھنا پڑے گا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے
ہمیں ملتے کیا جستجو کا حاصل ہمیں ملتے کیا آپ اپنی منزل
وہیں پہ آ کر ٹھہر گیا دل چلے تھے جس رہ گزر سے پہلے
ہمارے شوقِ جنوں ادا کی ستم ظریفی تو کوئی دیکھے
کہ نامہ بر کو روانہ کر کے پہنچ گئے نامہ بر سے پہلے

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں — آج اک موج بہا لے گئی میخانے کو
غیر از دوست نہ تھا ہستیِ عاشق کا وجود — کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ — سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

اُن کی نگاہِ لطف ہے اور کشفِ رازِ دلبری — میری نگاہِ شوق ہے اور داستانِ عاشقی
آؤ جہاں برہم کریں پیدا نیا عالم کریں — تم جانِ جانِ حسن ہو ہم جانِ جانِ عاشقی

دیدۂ شوق سے ہوئیں آج وہ گل فشانیاں — ڈوب گئی بہار میں سادگیِ قبائے حسن

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش — شامل کسی کا خونِ تمنّا ضرور تھا

جوش وہ رنگینیوں کا ان کے پیکاں میں نہیں — کیا کوئی قطرہ لہو کا اب رگِ جاں میں نہیں
فیضِ سوزِ عشق سے اے دل سراپا داغ ہوں — جو بہار اب مجھ میں ہے سارے گلستاں میں نہیں

علاجِ کاوشِ غم خاک چارہ جُو کرتے — ہزار زخم تھے کس کس جگہ رفو کرتے
بیان ہو نہ سکی ابتدا محبت کی — تمام عمر ہوئی شرحِ آرزو کرتے

اللہ اللہ ری وارفتگیٔ عشق مری — اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

اصغر حسین اصغر گونڈوی

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری — تمام شورشِ تمکیں نثارِ بے خبری
جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری
غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو — تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری
اس آستاں سے اٹھائی نہ پھر جبیں میں نے — حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک دردسری

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم — اک رقص میں ہر ذرّۂ صحرا نظر آیا
تھا لطفِ جنوں دیدۂ خونابہ فشاں سے — پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

خوب تھا صحرا پر اے ذوقِ جنوں — پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں
شوق سے ہے ہر رگِ جاں جست میں — لے اڑے گی بوئے پیراہن کہاں

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا — یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا
اور آ جائے نہ زندانیٔ وحشت کوئی — ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا
داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن — اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

مستی میں فروغِ رُخِ جاناں نہیں دیکھا — سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا
زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب — فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم — کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی — قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی

تپش جو شوق میں تھی وصل میں بھی ہے وہی مجھ کو — چمن میں بھی وہی اک آگ ہے جو تھی نشیمن میں
مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح — بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

عشووں کی ہے نہ اس نگہِ فتنہ زا کی ہے — ساری خطا مرے دلِ شورش ادا کی ہے
مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے — کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے
کھلتے ہی پھول باغ میں پژمردہ ہو چلے — جنبشِ رگِ بہار میں موجِ فنا کی ہے
ہم خستگانِ راہ کو راحت کہاں نصیب — آواز کان میں ابھی بانگِ درا کی ہے
ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو — اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

لطفِ نہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
رنگت چڑھی ہوئی ستمِ برملا کی ہے

جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہِ شوق میں
ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے
بلبل و گل پہ جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض
ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کئے
دوڑتے پھرتے تھے جلوے اُن کے موجِ نور میں
دور سے ہم رونقِ شمعِ انجمن دیکھا کئے

ہر اک جگہ تری برقِ نگاہ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو
یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو
کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو
ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی
غبارِ قیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو

مستی سے ترا جلوہ خود عرضِ تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا
ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ   کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے   آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے
کیا مستیاں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے   ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے
میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں   رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بنے   جانِ مے خانہ تری نرگسِ مستانہ بنے
پرتوِ رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گزر   ذرّے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے
کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال   چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے
رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے   جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے   ملتی ہے اب انہی سے کچھ اپنی خبر مجھے
ایسا کہ بُت کدے کا جسے راز ہو سپرد   اہلِ حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے
مستِ شباب وہ ہیں میں سرشارِ عشق ہوں   میری خبر انہیں ہے نہ اُن کی خبر مجھے
جب اصل اس مجاز و حقیقت کی ایک ہے   پھر کیوں پھرا رہے ہیں اِدھر سے اُدھر مجھے

سرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز   اچھالتا تھا کہ اک بحرِ بے کنار ہوا
بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے   نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا
لئے پھری نگہِ شوق سارے عالم میں   شدید جلوۂ حسن آج بے قرار ہوا
مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے   جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

ذوقِ سرمستی کو محوِ روئے جاناں کر دیا — کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا
کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطرابِ شوق میں — اُن کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

شورشِ دل وہ جو ہوتی تھی بدستور ہے آج — نہیں معلوم وہ نزدیک ہے یا دور ہے آج
فصلِ گل، جوشِ نمو، طلعتِ زیبائے بہار — عرضِ دیدار پہ اک جلوۂ مستور ہے آج
نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں — خون میں گرمیِ ہنگامۂ منصور ہے آج
جس سے کل تک دلِ بیتاب بھٹکا جاتا تھا — اسی شعلے کو جو دیکھا تو سرِ طور ہے آج

آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لیے ہوئے — جنت میں بھی ہو جنتِ دنیا لیے ہوئے
پاسِ ادب میں جوشِ تمنا لیے ہوئے — میں بھی ہوں اک حباب کا دریا لیے ہوئے
ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار — فتنہ طرازیِ قدِ رعنا لیے ہوئے
تو برقِ حسن اور تجلی سے یہ گریز — میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے
افتادگانِ عشق نے سر اب تو رکھ دیا — اٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لیے ہوئے
جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار — روتے ہیں منہ پہ دامنِ صحرا لیے ہوئے

بے حجابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں — چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی
کیا کرے زاہدِ بیچارہ اسے کیا معلوم — رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا — اے خوشا دردے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
حسرتِ ناکام میری کام سے غافل نہیں — اک طریقِ جستجو یہ وردِ مہجوری بھی ہے
میں تو ان محجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں — اس کے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اُس نے صدا — "قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے"

لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ — ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز
دیکھ رعنائی حقیقت کو — عشق نے بھر دیا ہے رنگِ مجاز

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا — کیا منہ دکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں
نیرنگیٔ جمال کے قربان جائیے — حیراں ہوں دیکھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ — میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو
اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا — روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو
تھی بوئے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ — یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے — پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
گرتا وہ جھوم جھوم کے رندانِ مست کا — پھر پائے خم پہ سجدۂ شکرانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں — تم پھاڑ کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

شاید کہ پیام آیا پھر وادیٔ سینا سے — شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوتِ مینا سے
اسرارِ حقیقت کو ایک ایک سے پوچھا ہے — ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہدِ رعنا سے
رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برقِ تبسم بھی — لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشمِ تمنا سے
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں — سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں ‏ ‏ ‏ جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی ‏ ‏ ‏ جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی ‏ ‏ ‏ کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت ‏ ‏ ‏ اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے ‏ ‏ ‏ جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح ‏ ‏ ‏ لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں
اب اس نگاہ ناز سے ربط لطیف ہے ‏ ‏ ‏ مجھ کو دماغ صحبت روحانیاں نہیں

کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی ‏ ‏ ‏ ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی
طاقت کہاں مشاہدۂ بے حجاب کی ‏ ‏ ‏ مجھ کو تو پھونک دے گی تجلی نقاب کی
تھی ہر عمل میں دعوئ ہستی کی معصیت ‏ ‏ ‏ مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زیبائی ‏ ‏ ‏ جو خون اچھلتا ہے وہ رنگ گلستاں ہے
اے پیکر محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں ‏ ‏ ‏ جس نے تجھے دیکھا ہے وہ دیدۂ حیراں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ‏ ‏ ‏ جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

نیرنگ تماشا وہ جلوہ نظر آتا ہے ‏ ‏ ‏ آنکھوں سے اگر دیکھوں پردا نظر آتا ہے
اے پردہ نشیں ضد ہے کیا چشم تمنا کو ‏ ‏ ‏ تو دفتر گل میں بھی رسوا نظر آتا ہے
احساس میں پیدا ہے پھر رنگ گلستانی ‏ ‏ ‏ پھر داغ کوئی دل میں تازہ نظر آتا ہے

جانِ نشاطِ حسن کی دنیا کہیں جسے
جنّت ہے ایک خونِ تمنّا کہیں جسے

اس جلوہ گاہِ حسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں جسے

ہر موج کی وہ شان ہے جامِ شراب میں
برقِ فضائے وادیٔ سینا کہیں جسے

میں ہوں ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

میری فغانِ درد پہ اس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

اصغرؔ نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر
رازِ حیاتِ ساغر و مینا کہیں جسے

خستگی نے کر دیا اس کو رگِ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی ہے منزل دور ہے

فریبِ دامِ گہہ رنگ و بو معاذ اللہ
یہ اہتمام ہے اور ایک مُشتِ پر کے لئے

حقیقت ایک ہے صد ہا لباسِ رنگیں میں
نظر بھی چاہئے کچھ حسنِ رہ گزر کے لئے

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

بتوں کے عشق میں بھی شان ہے خدائی کی
ہزار عذر ہیں اک لذتِ نظر کے لئے

بے نظیر شاہ وارثی

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے وہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

ادا جعفری بدایونی

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا — جو کوئی شوخ کرن آپ ہی الجھ جائے
گرہ کشائی شبنم کی داد کیا دیں دل — ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے
نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے — نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کمہلائے

مولانا محمد علی جوہر

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی — اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبے کو بھی شامل کر لو — سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے شمعِ صفت — شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں — آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد
قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر — یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر — ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

ہم تو سمجھے تھے کہ ہوں گے اور بھی ظلم و ستم — حوصلہ کچھ بھی نہ نکلا آپ کی بیداد کا

جنسِ گراں تو کچھ نہیں کوئی مگر یہ جاں — لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر

ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر — ہو انتخاب اے نگہِ یار دیکھ کر

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے — صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

تم سے بعید تھا کہ بھلا دو اگرچہ ہم — اک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی — اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

یہ جور نرالا یہ جفا اور ہی کچھ ہے — یہ ظلم نہیں نامِ خدا اور ہی کچھ ہے

کرنا نہ کبھی ان پہ گماں اہلِ ہوس کا — عشاق کی نیت بخدا اور ہی کچھ ہے

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو — اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر — ملتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا — جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے

عشق بن گر جئے تو خاک جئے — زندہ وہ ہے جو ان پہ مرتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا — وہی ناکام کام کرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ — یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے
قلزمِ عشق میں گرا سو گرا — اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے

کچھ ترکِ محبت تو نہیں ضبطِ فغاں ہے — ہم کرنے پہ آجائیں تو مشکل تو نہیں یہ
یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل — تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے — کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے
تری محفل میں ہو یوں ایک سے اک بڑھ کے فرزانہ — مگر افسوس جائے عاشقِ دیوانہ خالی ہے

عقل کو ہم نے کیا نذرِ جنوں — عمر بھر میں یہی دانائی کی
نہ سہی تیغ تجلّی ہی سہی — آنکھ جھپکے نہ تماشائی کی

عشق تو اپنا خود انجام ہے پرتو نامہ — اور اک مسئلہ سود و زیاں لایا ہے
ہم اسیرانِ قفس کب نہیں ممنونِ بہار — رنگ پھر آج تو کچھ دردِ نہاں لایا ہے

ساری دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہے — اب مرا ہوش میں آنا تری رسوائی ہے

سیّد شرف الدین یاس ٹونکی

اُس نے کی دل سے وفا تم نے نہ کی — تم سے پھر اچھا تمہارا غم رہا

کیوں مجرمِ وفا سے ہیں یہ بدگمانیاں — کیوں ڈر رہے ہیں پرسشِ روزِ جزا سے آپ

وہ چشمِ شوخ حشر میں شرمائے ہائے ہائے
عذرِ جفا بیان کروں گا خدا سے آپ

اچھا ہوا تو تلخیٔ ہجراں سوا ہوئی
اس سے تو مجھ کو زہر ہی دیتے دوا سے آپ

اب یاس کی امید بندھانے سے فائدہ
اب کام ہو چکا ہے نہ دیجے دلاسے آپ

ہو گئی اک بات ناصح دل کے اُلجھانے کی بات
کہنے سننے کا ہے کچھ موقع نہ سمجھانے کی بات

ہے مری عرضِ تمنا اُن کے شرمانے کی بات
اور شرمانا ہے اُن کا میرے مٹ جانے کی بات

بات کیا کرتے مجھے صورت دکھا کر چل دیئے
کہہ گئے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کہہ جانے کی بات

رازداں کوئی نہ ہو تجھ سے رہے راز و نیاز
کچھ نہ سمجھے کوئی یارب تیرے دیوانے کی بات

وہ کسی کو کیوں سنائے وہ کسی کی کیوں سنے
تجھ سے ہوتی ہے ہمیشہ تیرے دیوانے کی بات

کچھ مزا ایسا دیا اُن کی حیا نے وصل میں
وصل کا رکھا ہے میں نے نام شرمانے کی بات

یاسؔ بس اتنی حقیقت جانتا ہوں وصل کی
ہے غمِ فرقت میں یہ اک دل کے بہلانے کی بات

بے غمِ الفت تو دم بھر زندگی اچھی نہیں
ہو ترا بیمار اچھا وہ گھڑی اچھی نہیں

صدقے عیشِ دو جہاں قربان عمرِ جاوداں
تیرے غم کے سامنے کوئی خوشی اچھی نہیں

ہائے کس کے ظلم کا روزِ جزا ہوں دادخواہ
حق تو یہ ہے میرے حق میں منصفی اچھی نہیں

آپ میں آنے نہ دے اے بیخودی
ڈوب ہی جاؤں تو بیڑا پار ہے

یاسؔ کو دی اک جہاں کی آرزو
واہ کیا لکھ لٹ تری سرکار ہے

رہے بے کسی سلامت مجھے کیا کسی کی حاجت
شبِ وعدہ تم نہ آؤ شبِ غم اجل نہ آئے

پھلے پھولے پائیں لاکھوں شجرِ خزاں رسیدہ   مرے نخلِ آرزو میں کبھی پھول پھل نہ آئے

تمہیں ہائے دل کا جلانا نہ آیا   یہ آگ آپ بجھتی بجھائی نہ ہوتی
خدا صبر دیتا جو عاشق کے دل کو   تو پھر حسن میں دل ربائی نہ ہوتی

کبھی رنگِ لطف دکھا گئے کبھی شوخیوں سے بھا گئے
وہ ہر اک ادا میں لٹا گئے مجھے ہر طرح سے مٹا گئے
مجھے دوست یوں ہی ستائیں گے مری جان یونہی جلائیں گے
وہی آ کے قصہ چکائیں گے جو یہ بات اتنی بڑھا گئے
یہ اسیریوں نے مزا دیا، مجھے اپنے غم سے چھڑا دیا
انہیں اور زعم بڑھا دیا، وہی اپنے دام میں آ گئے
یہ نظر فریب وہ دل رُبا وہ ادھر جھکے یہ اُدھر بڑھا
جو وہاں دل آنکھوں میں تل گیا تو یہاں وہ دل میں سما گئے
وہ جو کچھ تھے ولولہ ہائے دل ہوئے صرف صد گلہ ہائے دل
کہ وہ قدر دانِ وفائے دل مرے ہر غرور کو ڈھا گئے
یہ ترا تغافلِ جاں گسل نہ کرے کہیں مجھے منفعل
کہ بہت ہی زار و شکستہ دل ترے در سے اہلِ وفا گئے
دیئے امتحاں پہ جو امتحاں تو جمایا نقشِ وفا وہاں
کہ نہ سرگراں ہیں نہ بدگماں وہ فریب یاس میں آ گئے

ہائے کس انجمنِ ناز سے تو آتی ہے   اے صبا تجھ سے مجھے رشک کی بو آتی ہے

تو نے بے تابیٔ دل اور بھی بے تاب کیا — یاد تجھ سے مجھے اس شوخ کی خو آتی ہے
تم اچھوتے سہی آغوشِ تصور ہی تو ہو — نہ چھوئیں ہم نگہِ شوق تو چھو آتی ہے
ظرف ہے شرط نہیں ہمت ساقی میں کلام — ایک دو جام سے نوبت بہ سبو آتی ہے
بزمِ احباب کو کرنا نہ پریشاں اے یاسؔ — ہر سخن سے ترے اب درد کی بُو آتی ہے

رونقِ بیگانہ بن کر آپ ہم جلتے رہے — بت کدے میں صورتِ شمعِ حرم جلتے رہے
یہ شرارے ہیں کہ انگارے کہ قطرے اشک کے — جل رہے تھے جیسے ہم اے چشمِ نم جلتے رہے
شمع سے کہتا تھا بجھتے وقت کس حسرت سے یاسؔ — تو تو اب ٹھنڈی ہوئی افسوس ہم جلتے رہے

اب وہ آغوشِ تصور سے نہ جانے پائے — بیخودی مجھ کو کبھی ہوش نہ آنے پائے
ہوش اس بزم کا پردہ نہ اٹھانے پائے — آنے والا کوئی آپے میں نہ آنے پائے
بیخودی نے ترا افسانہ وہیں چھیڑ دیا — تیرے دیوانے کے جب ہوش ٹھکانے پائے
شوق کہتا ہے بلانے کی ہے یہ خاص ادا — وہ جو کہتے ہیں یہاں کوئی نہ آنے پائے

نظر ہے دم بدم دل کی طرف کیوں — سمجھتا ہوں جو کچھ مدِّ نظر ہے
سنو گے حشر میں تو حشر ہوگا — یہیں سن لو تو قصہ مختصر ہے

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی — ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر
چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کیسی؟
بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

نفسِ گرم کی تاثیر ہے انعامِ حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہو تو گلستاں ہو

تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

تو جنس محبت ہے قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر اس دیس میں ارزاں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو

اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

نہ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرلبی رہی

ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دل ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہی وہی آہ نیم شبی رہی

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کیلئے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ کر کے تو
آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بے گانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

وہ مے کش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے
چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و رندی میں امتیاز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد — دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں — اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

میرے شعر میں بجلی کے جوہر — لیکن نیستاں تیرا ہے نم ناک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے — جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں — مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

پریشاں کاروبارِ آشنائی — پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل — خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو
میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہے اولیٰ — کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے — قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا — حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا
جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی — چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
نثارِ نرگسِ مے گوں کہ آج پیمانے — لبوں تک آتے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا
وہ اک ذرا سی جھلک برقِ کم نگاہی کی — جگر کے زخمِ نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا
بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر — نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا
کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دلِ برباد — خرامِ ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے — دلوں میں دردِ محبت اٹھائے ہیں کیا کیا

فراقؔ راہِ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

کوتاہیِ نصیبِ جنوں کچھ نہ پوچھئے — ہاتھوں میں آ چکا تھا گریباں بہار کا
اک تیرے دردِ عشق نے بدلے ہیں کتنے بھیس — اچھا بہانہ ہے یہ غمِ روزگار کا
وہ آنکھ اپنے کام سے غافل نہیں فراقؔ — کچھ دیر رہ لے ہوش ہر اک ہوشیار کا

اب تو مجھ کو بھی مرے درد کا احساس نہیں — مشکلِ عشق مبارک تجھے آساں ہونا
ہم تو درماں کو بھی درد بنا لیتے ہیں — یوں تو اے درد مبارک تجھے درماں ہونا

کہیں یہی نہ ہو آغاز ربطِ پنہاں کا — تری نگاہ میں پہلے تو یہ حجاب نہ تھا

وفورِ بے خودیٔ بزمِ ناز کیا کہئے — کہ باریاب بھی جو تھا وہ باریاب نہ تھا

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں، نہ کوئی امید — مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد — ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کچھ نہ جینے ہی میں رکھا ہے نہ مر جانے میں — کام بنتے بھی محبت کے یہی بیکار سے ہیں

وحشتیں بھی نظر آتی ہیں سرِ پردۂ ناز — دامنوں میں ہے یہ عالم نہ گریبانوں میں
یہ جو ہر غنچہ و گل میں ہے اک اندازِ جنوں — کچھ بیاباں نظر آئے ہیں گریبانوں میں

یہ نگاہِ غلط انداز بھی کیا جادو ہے — دیکھنے والے ترے جی نہ سکیں مر نہ سکیں
ہو کے مجبورِ محبت سے ہیں شاکی لیکن — اتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ کچھ کر نہ سکیں

جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں — تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست — ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا — اور دل ہجر نصیب آج شکیب بھی نہیں

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے — تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی
سر بھی اپنی بلا در و دیوار بھی مگر — کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

تجھ کو اے موجِ صبا شوخیٔ پیہم کی قسم — اس طرح چھیڑ کہ ہر گل کو گلستاں کر دے
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل — اب اُسے اے نگہِ یار کچھ آساں کر دے

جنہیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی — تری نگاہ ہے انداز اُن کے پائے ہوئے
یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی — چراغِ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو — ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سرِ حشر بھی نہیں چوکے — تری نگاہِ کرم کے فریب کھائے ہوئے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی
دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں — حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں — گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حسن ہی جانے — کسی سے عالمِ مستی میں اس طرح کھل جاؤ
نہ پوچھ اُلجھی ہوئی گتھیاں محبت کی — نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
تڑپ کو ہم نے بنایا سکونِ بے پایاں — ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں — دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حُسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو درِ خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالمِ حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جو اپنی ضد پہ آئے
کشتیٔ دل بچائیے اتنت مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو، پار لگے تو ڈوب جائے

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں
غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نگاہِ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی
جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا
اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے
ذرّے ذرّے سے تلاطم سا بپا ہوتا ہے

کہہ گئی کیا نگہِ ناز تری ہم جس کو
بات کی بات فسانے کا فسانہ سمجھے

لے یہ مضمون بیدلؔ کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے ؎
درپائے فردوس دا بود امروز
از بے دماغی گفتیم فردا

ایسے دیوانے کا دنیا میں ٹھکانا ہے کہیں — لوگ، اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرتِ صحرا بھی ہے اور کچھ رنجِ درِ دیوار بھی ہے
امید نہ دے پرسش بھی کر دے اور فریبِ حسن کوئی
مایوسیوں کا خوش ہو جانا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
دن رات شگوفے کھلتے ہیں، دن رات بہاریں لٹتی ہیں
تدبیر جنوں، تقدیر چمن، ایام کی کچھ رفتار بھی ہے
اک نازِ نگہ کی جنبش سے شہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے آمادۂ پیکار بھی ہے
رہ رہ کے خلش بھی ہوتی ہے کچھ کشمکشِ دل بھی کم ہے
سنتے ہیں فراقؔ وہ تیرِ نظر دل میں ہے دل کے پار بھی ہے

آج حسن و عشق جیسے ہو گئے ہوں مل کے ایک — تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں
لے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں — تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی — جو چل پڑے تو بیاباں، رکے تو زنداں ہے
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی — رگِ جنوں ہے، رگِ گل ہے یا رگِ جاں ہے

یہ بزمِ عام بھی اے دوست بزمِ عام نہیں — نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

ماتھے پہ ترے صبحِ چمن کھیل رہی ہے — آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے — وہ زلفِ شکن زیرِ شکن کھیل رہی ہے
پیراہنِ خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی — ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اس پیکرِ رنگیں میں نہ ہے شوخیِ پنہاں — بجلی تہِ دامانِ حسن کھیل رہی ہے
باتوں سے فراق اسکے معطر ہے سماعت — ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

دیکھ لینے ہی میں سمجھی کچھ ترے مشتاقِ جمال — خیر دیدار نہ ہو حسرتِ دیدار تو ہے
سر ٹپکنے کو ٹپکتا ہے مگر رک رک کر — تیرے وحشی کو خیالِ در و دیوار تو ہے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تونے تو خیر بے وفائی کی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے — دنیا کا خیال آگیا ہے

پکڑ لیا سرِ محشر کسی نے ہاتھ مرا — بس آج مل گئی اپنی وفا کی داد مجھے
خطا اب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے — تھکی تھکی سی وہ عرضِ وفا ہے یاد مجھے

عشق اب حسن کی تصویر ہوا چاہتا ہے — اور بچا ہے تو رہے آج بھی پنہاں کوئی
دلِ گم گشتہ کی آتی ہے مجھے یاد فراق — جب نکلتا ہے بچائے ہوئے داماں کوئی

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے — کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی — امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

شبیرؔ حسن جوشؔ ملیح آبادی

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا　　اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے گلِ ناز سے کھل بادہ سرِ جوش اُبل　　کہ نگارِ چمن و شاہدِ مستاں آیا
خاطرِ جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف　　کشتیٔ دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
کج کلاہی کا سر و برگ مبارک اے جوشؔ　　لے پیامِ شکنِ طرّۂ جاناں آیا

گزر رہا ہے اِدھر سے تو مسکراتا جا　　چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا
نگاہِ مہر سے اے آفتابِ عالمِ پاک　　حقیر خاک کے ذرّوں کو جگمگاتا جا
ملا کے مجھ سے نظر عزّتِ جنوں کی قسم　　چراغِ محفلِ عقل و خرد جلاتا جا
اسیر کر کے سیہ کاکلوں کے حلقے میں　　کمندِ عقلِ تنک مایہ سے چھڑاتا جا
اٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی کو نقاب　　نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا
مزاج پوچھ کے اے شاہِ عارض و کاکل　　گدائے راہ کی بھی آبرو بڑھاتا جا

چلا ہے سوئے حرم دل سے ساز کرتا جا　　طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا
ملے جو وقت تو اے رہروِ رہِ اکسیر　　حقیر خاک سے بھی ساز باز کرتا جا

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار　　لے سر اٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

اِدھر بھی بادِ صبا آ بہار کی سوگند　　شمیمِ طرّۂ گیسوئے یار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفائے عہد کا دستور　　جفائے طولِ شبِ انتظار کی سوگند

ٹھہر ٹھہر کے سنا داستانِ عشوۂ ناز — نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند
سنا دے جوشؔ کو بھی نغمہ ہائے لعلِ نگار — خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

جہاں ہے شوق وہاں کیف و کم کی بات نہیں — دیارِ عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں
خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پاؤں کی زنجیر — حضور آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا — جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید — لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

سخن فروشیاں نہ کر جہانِ حسن و عشق میں — کہ یاں ہر ایک خال میں ہیں لاکھ نکتہ دانیاں
وہ زیبِ انجمن ہوا تو کوئی بولتا نہیں — معاشرانِ بزم کیا ہوئیں وہ گل فشانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں — ندیم! عہدِ شوق کی سنائے جا کہانیاں

اللہ رے حسنِ دوست کی آئینہ داریاں — اہلِ نظر کو نقش بہ دیوار کر دیا
مجھ کو وہ بخشتے تھے دو عالم کی نعمتیں — میرے غرورِ عشق نے انکار کر دیا

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینوں میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا
یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

میرا پیرہن نہیں چاک ابھی مجھے رحم کھا کے سنگھا بھی دے
یہ مہک جنوں کی بھری ہوئی ہے جو تیری زلفِ دراز میں
یہ وفا کا رنگِ شکستہ ہے مری حسرتوں کا یہ خون ہے
یہ گلاب کی سی جو سرخیاں ہیں ترے تبسمِ ناز میں

اے شوق مجھے گمراہ نہ کر شورش کے لئے اسباب نہیں
امید کہ اجڑے گلشن میں اک پھول بھی اب شاداب نہیں
اب دل کا سفینہ کیا ابھرے طوفاں کی ہوائیں ساکن ہیں
اب بحر سے کشتی کیا کھیلے، موجوں میں کوئی گرداب نہیں

سید وحید الدین احمد بیخود دہلوی

برق کا گرنا سنا، صیاد کا کہنا سنو — "بیچارہ تنکوں کا اجڑنا داستاں ہوتا نہیں"
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ اُس کے عشق کا — مر گیا ہوں اور مرنے کا گماں ہوتا نہیں

جاتے ہی اُن کے گویا کچھ بھی نہ تھا چمن میں — جوشِ بہارِ گل کو پامال کر گئے ہیں

وعدے کا ذکر وصل کا ایما وفا کا قول — یہ سب فریب ہیں دلِ شیدا کے واسطے
اے ضبطِ گریہ خاک میں مل جائے کاش تو — آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے

وحشت یہ کہہ رہی ہے دلِ داغدار کی ۔۔۔ اس باغ کی بہار ہے صحرا کے واسطے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک گزری بہاروں کی ۔۔۔ بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے ۔۔۔ دوستی دشمنی نہ ہو جائے
اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں ۔۔۔ عاشقی بندگی نہ ہو جائے
بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں ۔۔۔ کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

اقبال احمد خاں سہیلؔ

اب دل کو ہم نے بندۂ جاناں بنا دیا ۔۔۔ اک کافرِ ازلی کو مسلماں بنا دیا
اے ذوقِ جستجو تری ہمت پہ آفریں ۔۔۔ منزل کو ہر قدم پہ گریزاں بنا دیا
کس کی بہارِ حسن ہے میری نگاہ میں ۔۔۔ جس سمت اٹھ گئی چمنستاں بنا دیا

خزاں کے دام سے ہے رنگینیٔ جمالِ بہار ۔۔۔ شباب کیا کوئی غم تھا کہ جاوداں ہوتا

اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا ۔۔۔ نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتا دینا
رُخِ جاناں پہ دیکھی کشمکش شرم و تبسّم کی ۔۔۔ قیامت تھا نگاہِ آرزو کا گدگدا دینا

الٰہی خیر کہ صیّاد لے کے دستۂ گل ۔۔۔ چلا ہے آج سجانے کو آشیاں اپنا

شبِ غم اب منائے خیر اپنے جیبِ داماں کی ۔۔۔ رہے دستِ جنوں باقی تو کر لیں گے سحر پیدا

جوشِ جنوں رکا نہ گریباں کے تار تک
پہنچے ہیں ہاتھ دامنِ بادِ بہار تک

اے جاں نوازیٔ غمِ جاناں ترے نثار
تو نے بھلا دیا ہے غمِ روزگار تک

رنگینیاں نہ پوچھ دلِ داغدار کی
صدقے اتر رہی ہے نسیمِ بہار تک

جھکتے ہی اس نظر کے یہاں چپ سی لگ گئی
تھے سب گلے بس اک نگہِ شرمسار تک

سو سجدے ایک لغزشِ مستانہ وار میں
اللہ کیا ادا ہے ترے بادہ خوار میں

خود حسن بے نیاز نہیں فیضِ عشق سے
خو میرے دل کی ہے نگہِ بے قرار میں

آشوبِ اضطراب میں کھٹکا جو ہے تو یہ
غم تیرا مل نہ جائے غمِ روزگار میں

خدنگِ مژگاں ترا برا ہو کہ جب سے چھاتی مری چھنی ہے
شعاعِ رخسار آ رہی ہے حریمِ باطن میں روشنی ہے

کمال یہ ہے کہ مثلِ گوہر نہ ہو تہ آب دامنِ تر
رہے ملک بے گنہ فلک پر تو کون سی پاکدامنی ہے

نظر صہبا نہ ہو جائے کہ دل مینا نہ ہو جائے
تم آ جاؤ تو جوشِ سرخوشی میں کیا نہ ہو جائے

وفا کی آرزوؤں سے خبردار اے دلِ ناداں
یہ دردِ عشق بھی بازار کا سودا نہ ہو جائے

کہیں خود عشق کی دنیا تہ و بالا نہ ہو جائے
سلامت ہے جنوں تو دیکھئے کیا کیا نہ ہو جائے

صبحِ ازل کسی نے چھیڑا تھا نیشتر سے
پسلی پھڑک رہی ہے اب تک رگِ گلو کی

اے انقلابِ گردوں ٹھنی رہے گی کب تک
عشقِ وفا منش سے حسنِ بہانہ جو کی

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے
صیاد اب قفس سے ڈراتا ہے کیا مجھے — تیرے کرم سے شکل وہی باغباں کی ہے
ہوں اب تو اُن کی چشمِ کرم سے بھی بے نیاز — اللہ کی بہشت غمِ جاوداں کی ہے

انجامِ وفا بھی دیکھ لیا اب کس لئے سر خم ہوتا ہے
نازک ہے مزاجِ حسن بہت سجدے سے بھی برہم ہوتا ہے
جب کی نہ دوائے دردِ دل پھر چارہ گرو کہتے ہو یہ کیوں
ہر درد کا درماں ہوتا ہے ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے
تاراجِ نشیمن کھیل سہی صیاد مگر اتنا سن لے
جب عشق کی دنیا لٹتی ہے تب حسن کا ماتم ہوتا ہے

فریب کاریاں نہ پوچھ جوشِ انتظار کی — تمام شب سنا کئے صدا خرامِ یار کی

خود کہیں کی نہ رہی توڑ کے شیرازۂ گل — اور کیا چاہتی ہے نکہتِ برباد ابھی

کوئی حد نہیں ہے رہِ جستجو کی — جہاں پاؤں تھک جائیں منزل وہی ہے

فضل الرحمٰن فجی

رو رو کے گزاری شبِ غم شمع نے لیکن
نیند آ ہی گئی جنبشِ دامانِ سحر سے

حفیظ جالندھری

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوق گناہ کے سوا | مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا
داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ | اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ | پیتا ہوں چھُپ کے دامنِ ابر بہار میں

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں رہنما بھی منزل بھی | ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

تم ہی نہ سُن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون | کس کی زباں کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے
عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست | اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آسکے

حسنِ نظر کی آبرو صفت برہمن سے ہے | جس کو صنم بنا لیا اس کو خدا بنا لیا

وحید الدّین سلیم

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے | یہ کس نے کہہ دیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو

احسان دانش

کاروانوں میں شورِ منزل تھا | آئی منزل تو سب نے ہاتھ مَلے
عشق غم کو عبور کر نہ سکا | راستے کارواں کے ساتھ چلے
تھے محبّت کی ابتدا کے قصور | وہ تبسم جو آنسوؤں میں ڈھلے

صبحِ نو کے گجر کو کیا معلوم　　　گھٹ گئے کتنے زمزموں کے گلے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

ہزار بار کسی چشمِ آشنا کے طفیل　　　اُجڑ اُجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار

ابھی چمن کو میسر نہیں ہے رنگِ چمن　　　بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغِ بہار

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں　　　قدم قدم پہ تری رہگذر سے گزرے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رُک جائیں　　　نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں　　　بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

وہ ہاتھ جن سے تھا کل چاکِ دامنِ افلاک　　　وہ ہاتھ آج اٹھانے پڑے دعا کے لئے

عبدالحمید عدؔم

حوادثِ روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے

کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی تری نظر اعتبارِ مستی

بہار اقرار کر رہی ہے شراب ایمان لا رہی ہے

خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے عدؔم کہاں تک چراغ بنتے

جنوں کی روشن روش یہی ہے دلوں کو رستے دکھا رہی ہے

احمد ندیم قاسمی

یہ سب درست، شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی — مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

اگر گھٹا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا — تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ
اجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے — لپک رہے ہیں دوانے، اتار ہو کہ چڑھاؤ
ادھر شباب کا مس ہے، ادھر شراب کا رس ہے — قدم قدم پہ قفس ہے، ندیم دیکھتے جاؤ

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں — آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر — آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

بہ فیضِ لذتِ تخلیق خون ہو کے کلی — خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے
یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات — چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

سیماب اکبرآبادی

یہ نازِ منفعل یہ ادائے حجاب کی — منہ ہو تو چوم لوں نگہِ شرمسار کی

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں — روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا
اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے — دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یہ کس کافر نے لی انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں — قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاکِ داماں میں

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ساغر نظامی

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

چھپا چھپا کے جنہیں مصلحت نے رکھا تھا
وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں

سنبھل کہ اے نگہِ شوق بزمِ دوست ہے یہ
یہاں خرابِ نظر آزمائے جاتے ہیں

علی اختر حیدرآبادی

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
صحرا میں بھی اندازِ گلستاں نظر آیا

تم نے ہر ذرّے میں پیدا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ

حریمِ کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سُنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہِ منزلِ وہم و گماں رہا اخترؔ
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

اندازہی میں گر اُن کے تقدیر کے بل کھلنے سے رہے
آئینہ پہ نظریں رہتی ہیں زلفوں کو سنوارا جاتا ہے

یہ سحر تمنا تھا یا رب یا کھیل نگاہِ ساقی کا
ہر بند تہی ساغر سمجھا اب مجھ پہ عنایت ہوتی ہے

الزامِ جفا کس نے رکھا اب ہنسنے بھی دیجئے یہ قصہ
کرتے ہیں وفا کا ذکر تو آپ اور مجھ کو ندامت ہوتی ہے

خدایا اُن کے آگے شرم رہ جائے محبت کی
حدیث آرزو ہے اور میری بے زبانی ہے

مجھے دی ہے طاقتِ دید اگر تو یہ اہتمامِ حجاب کیا
میں نظر کو کیسے فریب دوں کہ یہ تیری جلوہ شناس ہے

اجتبیٰ رضوی

یہ نقوشِ رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ اُن کو سمجھ نہ تو
جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغِ بہار ہے

اونچی تھی نظر ہی جب تو بھلا ارمانِ تماشا کیا کرتے
ذرّے کے جگر تک جا نہ سکے ہم ہمتِ صحرا کیا کرتے

تم نے ہی چمن کو لوٹ لیا تم نے ہی نشیمن پھونک دیا
ہم شکر کی ہمت کر نہ سکے شرما گئے شکوہ کیا کرتے

ٹھہر ٹھہر شوقِ لا اُبالی چلا کہاں آشیاں سے آگے
یہیں سے اک محشرِ تماشا نہ جانے کیا ہو یہاں سے آگے

چمن اسے اتفاق کہہ لے گری تو ہے آشیاں پہ بجلی
نہ دو قدم آشیاں سے پیچھے نہ دو قدم آشیاں سے آگے

شوقِ افسردہ کا مجھ سے نہ گلہ کر کہ مجھے
اعتبارِ کرمِ جنبشِ مژگاں بھی نہیں

بھرے گا کون رنگِ خونِ دل نقشِ حقیقت میں
تمہاری داستاں بھی بس ہماری داستاں تک ہے

نوحؔ ناروی

ابھی لذت نہیں اس کو ملی آزارِ پنہاں کی — جو ہوگا بھی تو ہوتے ہوتے دل ایذا طلب ہوگا
بھری محفل میں ان کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی — جنابِ نوحؔ تم سا بھی نہ کوئی بے ادب ہوگا

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا — سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

بیدمؔ شاہ وارثی

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے — ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے
دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دیدے — کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے — جو بربادِ تمنا ہو اسے برباد رہنے دے

ناظم علی خاں شاہجہان پوری ہجرؔ

میں اور تم سے وصل کی خواہش خفا نہ ہو — اک بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی
انصاف جو رِ یار نہیں ہو تو خوب ہے — پھر لطف کیا جو بات قیامت پہ ٹل گئی

عبداللطیف تپشؔ

جان آنکھوں میں رہی جی سے گزرنے نہ دیا — اچھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

مدتوں کشمکشِ یاس و تمنا میں رہے — غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا
کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اُس نے — شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا

اختر شیرانی

آرزوِ وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا — کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا
اُن کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں ہو کر — ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا
ہے بہارِ گل و لالہ مرے اشکوں کی نمود — میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی — بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

محمد دین تاثیر

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں — کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے — زمیں کا رزق جو بن کر نکل ہی آتے ہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید — وہ رہگذر کہ اب جو تری رہگذر نہیں

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہہ دی — بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے
عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل — انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے
آنکھ سے آنکھ کہے دل سے ہوں دل کی باتیں — ہائے وہ عرضِ تمنا جو زباں تک پہنچے

روشؔ صدیقی

اک ذرا ذوقِ تجسس میں بڑھایا تھا قدم — نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا
تلخیٔ بادۂ اندوہ وفا کب کم ہے — اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا
بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں — کیا ملے گا اسے یزداں جسے انساں نہ ملا

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہے بہشت — حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھ کر

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے — آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

کیا حسرتِ دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا — گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

صیاد نے چھیڑا وہیں افسانۂ گلشن — جب قصد اسیروں نے کیا ترکِ فغاں کا

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی — ہمارے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

آستاں بوسیٔ دلدار نہیں قسمت میں — اُڑ کے اک سجدہ سرِ راہ گذر ہو جائے

میں کیا سناؤں دردِ محبت کا ماجرا — حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

ہوش رہتا ہے بس اتنا دمِ تحریکِ جنوں
جیسے چھینے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

بہاروں ہی میں جو بجلی گرے تو گرنے دو
بچائے میری بلا آشیاں خزاں کیلئے

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی
اگر ہونٹ سی بھی لئے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

دیکھنا شوخی کہ مجھ کو یاد تو کرتا نہیں
بزم میں خالی ہے لیکن میری جا میرے لئے

شمیمِ دوست لئے پیرہن میں آئی ہے
نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے
ظہورِ عشق حقیقت طراز ہے ورنہ
یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا
آنکھ اٹھ گئی جدھر بس ادھر دیکھتے رہے

چل گیا اس نگاہ کا جادو
کہہ گئے دل کی بات کیا کہئے

انور حسین آرزوؔ لکھنوی

جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت
اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا
محبت نہیں آگ سے کھیلنا ہے
لگانا پڑے گا بجھانا پڑے گا
وہ ہنس کر اگر حالِ دل پوچھ بیٹھیں
جو کچھ یاد ہے بھول جانا پڑے گا
نہ پوچھ آرزوؔ جز رودِ عاشقی کا
ابھرتے ہی پھر ڈوب جانا پڑے گا

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گئے
اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار
دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اجڑ گیا

وحشت انگیزی میں یک رنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

گھر کوئی زنداں نہیں رکنا جھگنا کس لئے
ساتھ پھر وحشت پلٹ آئی ہے ویرانے سے کیا
لہر پھر دل سے اٹھی رگ رگ میں دوڑیں بجلیاں
دیکھئے کہتی ہے اب زنجیر دیوانے سے کیا

رہی نہ جائے سخن کوئی انفعال کے بعد
اثر زبان نے کھویا ہے عرضِ حال کے بعد

آفت میں پڑے درد کے اظہار سے ہم اور
یاد آ گئے بھولے ہوئے کچھ اس کو ستم اور

قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا
ہات میں پاؤں کی زنجیر لئے بیٹھا ہوں

یہ شوق لے کے چلا ہے چمن سے شکلِ نسیم
کہ دیکھیں ملتی ہے جاتی ہوئی بہار کہاں؟

سب اختیار ہیں اور کچھ بھی اختیار کہاں؟ ہے ایک شرطِ وفا کی وہ قیدِ بے زنجیر

گرتے دیکھا نہ کبھی شمع پہ پروانے کو کون دیوانہ کہے عشق کے دیوانے کو

پانی پہ نہیں گرتا جلتا ہوا پروانہ الفت بھی عجب شے ہے جو درد وہی درماں

جو دیکھنا تھا اہلِ نظر دیکھتے رہے پردے کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی

قفس پہ گرتے ہیں تنکے مرے نشیمن کے تعلقات چمن قطع کر رہی ہے صبا

آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے خلوت کدۂ دل کا بھرم جائیگا اے شوق

دونوں جولانگاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلے جب کوئی بگولا دوڑ پڑا ویرانہ بھی
حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کی آڑ دونوں میں یوں کھلی ملی

وہ دامن چاک کر بیٹھا ہوں جس سے منہ چھپانا ہے مجھے بس چھوڑ میرے حال پر اے شرم رسوائی

جب اک منزل پہ پہنچے پیش آئی دوسری منزل
تلاشِ دوست کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا ہے

ہادی مچھلی شہری

درد سا اٹھے گا نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب

معین احسن جذبیؔ

اس طرف اک آشیانے کی حقیقت کھل گئی
اس طرف اس شوخ کو بجلی گرانا آ گیا

میری خاکِ دل بھی آخر انکے کام آ ہی گئی
کچھ نہیں تو اُن کو دامن ہی بچانا آ گیا

وہ خراشِ دل جو اے جذبیؔ مری ہمراز تھی
آج اسے بھی زخم بن کر مسکرانا آ گیا

کیا تجھ کو پتہ، کیا تجھ کو خبر دل رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبیؔ
خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

تلافی کچھ نہ کچھ ہو جائے تکلیفِ تبسم کی
ذرا ٹھہرو ہم اپنے دامنوں کی دھجیاں کر لیں

تیری نظروں میں رہ کر اک راز بن گیا تھا
گر کر تری نظر سے افسانہ ہو گیا میں

ہے کال آنسوؤں کا کیوں چشمِ نم میں جذبیؔ
کس رندِ تشنہ لب کا پیمانہ ہو گیا میں

ہزار بار کیا ترکِ عزمِ نظارا
ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو

نالۂ بے تاب لب تک آتے آتے رہ گیا
جانے کیا شرمیلی نظروں سے وہ فرما گئے
عشق ہم کی معصومیوں کا یہ بھی اک انداز تھا
ہم نگاہِ لطفِ جاناں سے بھی شرما گئے
کاٹ دی یوں ہم نے جذبی راہِ منزل کاٹ دی
گر پڑے ہر گام پر ہر گام پر سنبھلا کئے

نگاہِ یاس نہ شرمندۂ وفا کو چھیڑ
یہی بہت ہے کہ وہ آج شرمسار تو ہے
تمہارے جلووں کی رنگینیوں کا کیا کہنا
ہمارے اجڑے ہوئے دل میں اک بہار تو ہے

کیا ماتم ان امیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے
میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

اے چشمِ خشک تیری تقدیر جاگ اٹھی
پھر اٹھ رہی ہیں موجیں دل سے مرے لہو کی
ہم بھی تو سن رہے تھے رعنائی گلستاں
بادِ خزاں نے جو کچھ کلیوں سے آرزو کی

سوالِ شوق پہ کچھ اُن کو اجتناب سا ہے
جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب سا ہے

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

مرزا یگانہ لکھنوی

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ دل — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ — کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ — اشارہ چاہیے ہے جنبشِ سلاسل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
جوابِ حسنِ طلب بے دلوں سے بن نہ پڑا — حیا سے گڑ گئے جب نام آ گیا دل کا

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر — تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

زنجیر پھر ہلا دی نسیمِ بہار نے — پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا
کیا جانے آج خواب میں کیا دیکھا آپ نے — کیوں چونکتے ہی آپ سے بیگانہ ہو گیا

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا
عقل گم راہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخ ستم گار نے کروٹ بدلی
بخت بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی
پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

وحشیو! کیوں تنگ دل ہو فصل گل آنے تو دو
غنچے غنچے میں بہارِ صد گریباں دیکھنا

یہ دل بے مدعا بیگانۂ امید و بیم
غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائیگا
عشق کا حسنِ طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے
ٹکٹکی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائیگا

اہلِ دل مست ہوئے پھیل گئی بوئے وفا
پیراہن چاک ہوا جب ترے دیوانے کا

انگڑائیوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے
آساں نہیں ہے رنج اٹھانا خمار کا
دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں
اللہ رے حسن پیرہنِ تار تار کا

پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام
اب کوئی بار خاطرِ محفل نہیں رہا
یاد آئی بوئے پیرہن یار ناصحا
اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزہ نہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور — گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بسی ہے نکہتِ آوارہ کن دماغوں میں — مبارک ہستیٔ برباد پر مغرور ہو جانا
دکھائی جلوۂ موہوم نے کیا برق رفتاری — پلک جھپکاتے ہی حدِ نظر سے دور ہو جانا
کمالِ عشق کن آنکھوں سے دیکھے گا جمال اپنا — پلٹ کر شمع سے آخر سراپا نور ہو جانا

عالمِ شوق میں اسیر ہو گئے باہر آپ سے
چل بسے آمد آمدِ فصلِ بہار دیکھ کر
ہول یہی ہے ساقیا مستوں کا دم نکل نہ جائے
صبح کو تیری آنکھ میں کیفِ خمار دیکھ کر
آنکھیں دکھاتے ہیں حباب چشمِ ہوس کو بار بار
محوِ طلسم بندیٔ نقش و نگار دیکھ کر
آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزلِ یار دیکھ کر

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے — مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامالِ نظر ہو کر
زمانے کی ہوا بدلی نگاہِ آشنا بدلی — اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمعِ سحر ہو کر

خدا جانے اجل کو کس پہ پہلے رحم آئے گا — گرفتارِ قفس پر یا گرفتارِ نشیمن پر

دوڑی جاتی ہے گھٹا سوئے چمن بادہ کشو — پردۂ غیب سے ہونے لگی تدبیرِ بہار

چشمِ پُرخوں نے مجسم کر دیا موہوم کو — ورنہ بے تعبیر تھا خوابِ پریشانِ بہار
خار و گُل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے — دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں — کوئی حیرانِ خزاں کوئی پشیمانِ بہار
دیکھ لیتا ہوں چمن کو دُور سے بیگانہ وار — پاسی مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دُعا کر چلے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

اُلٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل — فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے — شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

سنتا ہوں آپ خانۂ دل ہی میں جلوہ گر — دیوار درمیاں ہے مگر کچھ خبر نہیں
کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو — دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں — یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
دیواریں پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے — خاک اڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں
رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی — ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گلستاں سے
جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں
بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جب تو کیا کرتے
اتاریں بیڑیاں اور پہنے دونوں طوق گردن میں

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل — دیر و حرم میں گم نگہِ نارسا نہ ہو

حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا — نامحرمِ طلسمِ خزان و بہار کو
اللہ رے اختیار کو آمادہ کر دیا — فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائے گی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھائیں گے گلستاں کو
مزاجِ حسن بدلے، آسماں بدلے، زمیں بدلے
سزائے عشق کیا بدلے گی ذوقِ ناپشیماں کو

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے — کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے
آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیمِ وحشت — تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

بقدرِ حوصلہ ملتی ہے. دادِ عشق و ہوس　　　مزاجِ حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

گم ہوئے ہوش و حواس ایسے محیطِ عشق میں
ڈوبنے والوں کو اب تہ پر گماں ساحل کا ہے

غبار بن کے لپٹتی ہے دامنِ دل سے　　　مٹے پہ بھی وہی دل بستگی بہار میں ہے
دعائے شوق کجا ایک ہاتھ ہے دل پر　　　اور ایک ہاتھ گریبان تار تار میں ہے

دُور سے آج اُن کو دیکھ لیا　　　دل کو تسکیں ہوئی مگر نہ ہوئی
آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ　　　کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

نظارۂ رُخِ لیلیٰ مبارک اے مجنوں　　　نگاہِ شوق نے پردے اٹھائے محمل کے

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر　　　ڈوب کر دیکھے تو بیگانہ ساحل ہو جائے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو　　　سبق الٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے
لب دریا کا ہوا ہوں نہ تہِ دریا کا　　　ناخدا کون سے گھاٹ اب لگاتا ہے مجھے

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی پلٹ نہ جائے　　　آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

پاؤں پھیلاتے ہیں رہ رہ کے اسیرانِ ہوس　　　چاہتے ہیں قفسِ تنگ گلستاں ہو جائے

دیکھے کوئی جاتی ہوئی دنیا کا تماشا
بیمار بھی سر دھنتا ہے اور شمعِ سحر بھی

ملی وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں بھی
ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

خزاں کے دم سے مٹا خوب زشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار رہے

دل اپنا جلاتا ہے مجھے تو نہیں ڈھاتا
اللہ آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بیجا سے

اسے رہزنی بے پروا وحشی مری آساں کر
کیوں آنکھ چراتا ہے گم گشتۂ تنہا سے

کیوں نکہتِ آوارہ جامے سے نہ ہو باہر
کس دل کو وفا کرتی پیراہن رسوا سے

حیراں ہیں نظر والے بیتاب ہیں دل والے
کچھ رنگِ تماشا سے کچھ بوئے تمنا سے

کمیں ہے حسنِ نظر کا شمع کب پروانہ کب
دل ہے جب تک دل جبھی تک روشنی محفل میں ہے

باز آ اس حل پہ غوطہ کھانے والے باز آ
ڈوب مرنے کا مزا دریائے بے ساحل میں ہے

اسرارالحق مجازؔ

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کی اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں　　سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہئے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

آنند نرائن مُلّاؔ

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس سے شگفتگی نہ ملی

وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے مُلّاؔ
کسی نگاہ کے سائے میں چاندنی نہ ملی

مے کشوں نے پی کے توڑے جامِ مے
ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رُکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

جمالِ حسن میں تھا اک جلالِ عفت بھی
گناہ گارِ خیالِ گناہ کر نہ سکے

وہی نہ اشک کے قطروں میں ڈھل گئی ہو کہیں
جس التجا کو شریکِ نگاہ کر نہ سکے

کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پر
جو کارواں سے چھڑاتا ہے وہ مقام آیا

فیض احمد فیضؔ

زیر لب ہے ابھی تبسمِ دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

وفائے وعدہ نہیں وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں
نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی
تھے شبِ ہجر کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی | اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر | اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی | ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

مجروحؔ سلطانپوری

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیالِ صبح سے پھر آستیں بھگو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لئے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں اُن کی بارگاہیں
کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے
مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم
اٹھنے کو اُٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم
اشکوں میں رنگ و بوئے چمن دور تک ملی
جس دم اسیر ہو کے چلے گلستاں سے ہم

الگ بیٹھے تھے پھر بھی آنکھ ساقی کی پڑی ہم پر
اگر ہے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسم چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا
شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اُس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

میں ترا دامِ خزاں لاکھ گرفتار سہی   پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار

ہیں ہزار شکل بدل چکا چمن جہاں میں سُن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مرا ہی لختِ جگر نہ ہو

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گُل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے
دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گُلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

سوچتا ہوں یہ تری راہگذار ہے کہ نہیں؟   دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آگے

کسی کو یاد جو کیجے تو یاد آ نہ سکے   سیاہیاں شبِ فرقت کی ہم نفس مت پوچھ

کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے   بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گُل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں صحرا سے گلستاں دُور نہیں
مجروح اٹھی ہے موجِ صبا آثار لئے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دُور نہیں

شکیلؔ بدایونی

مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے درحقیقت مجھے زندگی سے پیارا

مجھے تجھ سے خاص نسبت میں رہینِ موجِ طوفاں
جنہیں زندگی تھی پیاری انہیں مل گیا کنارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے
وہی بات پوچھتے ہیں جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیلؔ دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انہیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُن کو کہاں سے پہلے

مسرتیں رازدارِ غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
جبھی تو صحنِ چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

سمجھ رہا تھا کہ ناامیدی نہ پردہ دارِ امید ہوگی
نظر اٹھا کر جو میں نے دیکھا غبار تھا کارواں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی

تمام مے کش پکار اٹھے "یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے"
قسم فریبِ نگاہ و دل کی ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

حفیظؔ ہوشیارپوری

دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی
نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی

ابتدا میں جنہیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسنِ بیاں تک پہنچے
خلش انگیز تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال
ٹوٹ کر دل میں یہ نشتر رگِ جاں تک پہنچے

گزر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلے نہ ٹھہرائے
غمِ زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب ان گیسوؤں کے بھی سائے

عابد علی عابدؔ

یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے
انہی کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انہی کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

قتیل شفائی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر   دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

پھر سے وہی سیلابِ حوادث جانے دو اے ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں
قیدِ قفس کے بعد کرے گا قیدِ گلستاں کون گوارا
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

خدا جانے کہاں ٹھہریں گے جا کر ولولے دل کے   یہ دیوانے تو رہوارِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں
دمِ رخصت ہم اپنے آنسوؤں کو روک بھی لیتے   مگر یہ کارواں تیری رضا کے ساتھ چلتے ہیں

پیاسے ہی گزر جائیں گے ہم راہِ طلب سے   عبرت کے لئے ساغرِ جم ساتھ رہے گا
منزل سے پلٹ آئے گی ایک ایک تجلّی   ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

ساحر لدھیانوی

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں   مجھے خود اپنی محبّت کا اعتبار نہیں
نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم   وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا   ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی — مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

سلام مچھلی شہری

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے — حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے
جہاں سے چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں — وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے
پھر اپنے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا — نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

حمایت علی شاعر لکھنوی

گلشن ہے انہی کا گل انہی کے — کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں
اللہ رے اعتبارِ ہستی — ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں
اس سمت بھی گردشِ زمانہ — کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل گئے
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل گئے
نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

بہت لطیف ہے شاعر مذاقِ چارہ گری — جہاں پہ زخم نہیں ہے وہاں یہ مرہم ہے

آلِ احمد سرور

غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا — لاکھ مجبور ہوئے ان کو پکارا نہ گیا

شوق کی بات کب الفاظ میں ڈھل سکتی ہے — اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا نہ گیا
کبھی ٹکرا دیئے شیشے کبھی چھلکا دیئے جام — رائگاں ایک بھی ساقی کا اشارا نہ گیا

ہم برق و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے — اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے
گو قطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے — پر شوق کی روداد کب الفاظ میں آئے
یہ عشق کے شعلے بھی عجب چیز ہیں یعنی — جو آگ لگائے وہی خود آگ بجھائے
ڈھلتی ہے وہ مے اک ترے پیمانے میں ساقی — مستی کو بھی جو ہوش کے آداب سکھائے

ڈاکٹر مسعود حسین مسعودؔ

وہی لگن ہے کہ چلئے جہاں کہیں تو ہو — وہی چبھن کہ محبت سے ہم نے کیا پایا
گلوں کے گھاؤ بھی شبنم سے ڈھل سکے ہیں کبھی — کہ اشک نے مرے زخموں کو اور دہکایا
وہ کیا مقام ہے دامن کی آرزو میں ندیم — جہاں پہ دستِ تمنّا بھی جا کے تھرّایا

اگر نہ دیکھیں تو ہے رنگ و بو کی طغیانی
اگر وہ دیکھیں تو زخمِ بہار کیا کم ہے؟
بنے نہ کچھ بھی تو پھر گردِ کارواں ہی بنو
کہ راہِ شوق میں موجِ غبار کیا کم ہے؟

تری وفا نے محبت کو اعتبار دیا — تری نظر سے مجھے حسنِ اعتبار ملا

عرشؔ ملسیانی

وہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے — بجھنے کا سلیقہ آساں ہے جلنے کا قرینہ مشکل ہے

عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا　　ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی

یوں مطمئن سے آئے ہیں کھا کر جگر پہ چوٹ　　جیسے وہاں گئے تھے اسی مدعا سے ہم

راہِ وفا میں ہر جگہ کھائے فریبِ بندگی　　دیکھ کہ اس مقام پر سجدۂ دل رہا ابھی ہے

جگن ناتھ آزاد

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی　　کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے
زبانوں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے　　جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں　　پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

کبھی بلندیِ ذوقِ نظر تک آ پہنچی　　کبھی حیاتِ خمِ بال و پر تک آ پہنچی
فغاں کہ مل کے بھی ہم تم اسے نہ روک سکے　　شبِ وصال حدودِ سحر تک آ پہنچی
ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرواز　　یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آ پہنچی

غلام ربانی تاباں

خیالِ یار ترا شکریہ رہِ غم میں　　بس ایک تو نے دلِ مبتلا کا ساتھ دیا
نگاہِ شوق کے یہ حوصلے کوئی دیکھے　　کہ ہر نظارۂ صبر آزما کا ساتھ دیا
دلِ خراب کی یہ سادہ لوحیاں توبہ　　جفا کے بعد بھی اہلِ وفا کا ساتھ دیا

قفس میں رہ کے بھی اکثر بہار کا دامن
نظر سے چوم لیا ہم نے احترام کیساتھ
چمن پہ سایۂ ابرِ بہار کیا کہئے
وہ زلف رُخ پہ بکھرتی ہے اہتمام کیساتھ

کس کو ملتا ہے غمِ زیست سے دنیا میں فراغ
ہاں کبھی تیری جفاؤں میں اماں پائی ہے
ایک آشوبِ تمنّا پہ نہیں کچھ موقوف
دل نے ہر رنگ میں تعلیم زیاں پائی ہے

گوپی ناتھ امنؔ

نہ دے دھوکے پہ دھوکا اے غبارِ کارواں مجھ کو
نظر آنے لگے ہیں اب تو منزل کے نشاں مجھ کو

دمِ آخر بھی رہا مجھ کو رہائی کا خیال
ایسا دھوکا مرے صیّاد کی تقریر میں تھا

جس کی منزل کوئی معیّن ہو
ایسا اوچھا سفر پسند نہیں

سکندر علی وجدؔ

گدائے حسن نزا خوگرِ سوال نہیں
نگاہِ شوق میں رعنائی سوال کو دیکھ

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے
نگاہِ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے بہار آئے نہ آئے

اے جانِ تمنا ان میں ذرا اندازِ کرم شامل کر دے
میں تیری نگاہوں کے قرباں تکمیلِ شکستِ دل کر دے
ساحل نے تو سُن لی موجوں سے آلامِ دلِ دریا کی خبر
اب کوئی دلِ دریا کو بھی مانوسِ غمِ ساحل کر دے

عندلیب شادانی

کس کی مجال تھی کہ حجاب نظر اٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے
اس دل نشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے
ناداں ہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جانِ جان کے کتنے فریب کھائے
مایوسیوں میں دل کا وہ عالم دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لو جیسے تھرتھرائے
اک نا تمام خواب مکمل نہ ہو سکا
یُوں تو زندگی میں بہت انقلاب آئے

تلوک چند محروم

دامِ غمِ حیات میں الجھا گئی امید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی
انجامِ حسنِ گل پہ نظر تھی وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیم سحر گئی

اب قفس ہی کو آشیاں کہئے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

شاہد صدیقی

ظلمتیں اجالوں پر فتح پا نہیں سکتیں
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں
دیکھئے کہاں پہنچیں یہ سفر کے دیوانے
آسماں کو تکتے ہیں اور زمیں پہ چلتے ہیں

آشنا ہیں پروانے سوزِ غم کی ظلمت سے — شمع ہو تو جلتے ہیں اور نہ ہو تو جلتے ہیں

کاش پوچھے بڑھ کے کوئی ناخداؤں سے — کس کو غرق کر ڈالا کس کو پار اتار آئے

جسے جستجوئے سکوں رہی اُسے ساحلوں نے ڈبو دیا
انہیں کوئی موج نہ چھو سکی جو تڑپ کے پار اُتر گئے

تمام عمر ترا انتظار کر لیں گے — مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

فضل احمد کریم فضلی

فریبِ کرم اک تو اُن کا ہے اس پر — ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں
وفا اُن سے اپنی جتانے گئے تھے — مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں

رات بھر گریۂ شبنم کا اثر دیکھ لیا — صبح دم غنچہ بہ شکلِ گلِ خنداں نکلا
رُخِ عالم سے اٹھی فصلِ بہاری کی نقاب — جو گلستاں نظر آتا تھا بیاباں نکلا
اللہ اللہ سرِ شیخ و درِ مےخانہ — ہم فرشتہ جسے سمجھے تھے وہ انساں نکلا

زاہدہ نگاہ

پا گئے ہیں منزل کو خود بخود ہی دیوانے — عقل کے دورا ہے پر کھو گئے ہیں فرزانے
تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا — ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے
ان نئی بہاروں پر ان نئے نظاروں پر — ایک رند ہی کیا ہیں رو رہے ہیں میخانے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ — وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے
اس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن — گردشِ دہر تجھے جان گئے
اُس جگہ عقل نے دھوکا کھایا — جس جگہ دل ترے قربان گئے

محمد ولی الدین شفیق جونپوری

صلا ملا ہے یہ نکہت کو ہم نشینی کا — کہ بار ہو گئی پھولوں کے پیرہن کیلئے

میں نے بھی سارے زمانے کو فراموش کیا — جب سے تو بھول گئی اے نگہ یار مجھے

توجہ ہر قدم پر چاہیئے اُن کی نگاہوں کی — بڑی مشکل سے طے ہوتی ہے رسوائی کی منزل بھی

خوشی گلے سے لگانے کو بار بار آئی — گیا نہ دل سے ترے غم کا احترام کبھی

حبیب احمد صدیقی

دل مرا نوحہ گر گردشِ دوراں نہ سہی — اک خلش اب بھی چلی جاتی ہے ارماں ہی سہی
ہم تو مجبورِ محبت ہیں وفا ہو کہ جفا — گر نہ ہوں آپ جفاؤں پہ پشیماں نہ سہی
لطف بے حد ہے کبھی رنجش بیجا ہے کبھی — کچھ تو کہتے ہیں اسے دعوتِ ارماں نہ سہی
کرنے دو شیخ کو تعمیرِ خیالی جنت — ذوقِ عصیاں ہی سہی لذتِ عصیاں نہ سہی

اب عشق تھا مکار ہی ارماں کو دے جواب — ہم ان کو بے قرارِ محبت نہ کر سکے
فخر مناسبت میں تیرا نام لے لیا — ہم خود ہی پردہ دارئ الفت نہ کر سکے

جبینِ شوق کی تسکیں کسی طرح نہ ہوئی   قدم قدم پہ بناتی گئی صنم خانے
وہ کوہکن ہوں کہ مجنوں، وفا کی قیمت کیا؟   کتابِ عشق کی زینت ہیں چند افسانے

بساطِ دہر سہی جلوہ گاہ حسنِ ازل   نگاہِ شوق فغاں سنج تشنگی کیوں ہے
بھٹک بھٹک کے میں ناکام جستجو ہی رہا   خموشی میرے لئے شمع رہبری کیوں ہے

حیف صد حیف یہ نادانیٔ اربابِ وفا   عشق کو جذبۂ مجبور بنا لیتے ہیں
کرکے بے سود سی اک کاوشِ درماں آخر   درد کو زیست کا دستور بنا لیتے ہیں

یہ نہیں کہ اب وہ کشش نہیں مگر اس کو کیا کروں ہم نشیں
وہ ہلاک جورِ بہار ہوں، جسے گلستاں سے غرض نہیں
یہ تمہی بتاؤ کہ کیا کرے، وہ غریب کس کا گلہ کرے
جسے چشمِ ناز سے ربط ہے جسے آسماں سے غرض نہیں
ہے قبول طعنۂ گمرہی کہ یہ گمرہی ہے خدا رسی
ہوں فدائے ذوقِ خود آگہی کسی آستاں سے غرض نہیں

نہ اب نگاہ کرم ہے نہ عشوہ رنگیں   مری وفا پہ انہیں اعتبار ہے شاید
مآلِ عشق سے آگاہ کرنے والے، آہ   سمجھ رہے ہیں مجھے اختیار ہے شاید
